آندھی

طاہر جاوید مغل

2

ایک شریف زادی کی کہانی جو دشمنوں کے لیے آندھی ثابت ہوئی۔ ہر صفحے پر ایک نیا ڈرامہ' ہر سطر حیرت انگیز' نان سٹاپ ایکشن۔ ایک خونچکاں آپ بیتی۔

آندھی

دوم

طاہر جاوید مغل

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰-عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

تین چار دن بعد کی بات ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا دیکھا تو دینو تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "آپ کو خان صاحب نے سدیا ہے اپنے کمرے میں۔"

میں نے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت خان کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ میں نے دینو سے پوچھا کہ خیریت تو ہے۔

وہ بولا۔ "جی خیریت کا تھانوں پتہ ہو گا مجھ کو تو جو آرڈر ہویا سی میں نے آپ کو دے دتا ہے۔"

میں اٹھ بیٹھی۔ خان رحیمی کے بلاوے پر جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لباس بدلنا پڑتا تھا۔ بال سنوارنے پڑتے تھے۔ پرفیوم لگانا ہوتا تھا۔ چہرے پر ایک مسکراہٹ لانا پڑتی تھی۔ وقت کوئی بھی ہو۔ موڈ کیسا بھی ہو یہ اس کے سامنے جانے کی لازمی شرائط تھیں۔ دینو عجیب چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس کی نظریں دیکھ کر مجھے خوامخواہ غصہ آنے لگا۔ میں نے اسے جھڑک کر واپس بھیج دیا۔ منہ ہاتھ دھو کر لباس بدلا۔ بال سنوارتے ہوئے ذہن میں عجیب سے خدشات سر اٹھا رہے تھے۔ اس کوٹھی میں مجھے ڈھائی تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ خان نے مجھے رات نو بجے کے بعد بلایا تھا۔ میرے تصور میں خان رحیمی کے متعلق وہ تمام باتیں آنے لگیں جو میں نے لوگوں سے سنی تھیں اور جن میں اس کے عجیب و غریب کردار کا ذکر تھا۔ عورتوں میں خان رحیمی کی دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت شوقیہ اس وقت بھی کوٹھی میں موجود تھی۔ وہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی اور میں نے اکثر بے وقت اسے

خان رحیمی کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا اور آج ایک "بے وقت بلاوا" مجھے بھی آگیا تھا۔
تیار ہو کر میں خان رحیمی کے کمرے میں پہنچی۔ دستک دی اندر سے اس نے کہا آجاؤ۔
میں دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ وہ حسب معمول بے تکلفی سے بستر پر نیم دراز تھا۔
پورے کمرے میں پائپ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں خاموش بیٹھا ہوا
وہ کچھ پراسرار سا لگتا تھا۔ اس کے سرہانے ایک ریکارڈ پلیئر رکھا تھا۔ ریکارڈ پلیئر پر ایک
قدیم انگلش گانا بج رہا تھا۔ یقیناً یہ میری پیدائش سے بھی پچیس تیس برس پہلے کا گانا تھا۔
"بیٹھ جاؤ۔" خان رحیمی نے عجیب سے انداز میں کہا میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔
وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد ایک طویل اور گہری سانس لے کر
وہ اٹھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ لگا کر بند کر دیا۔ کھڑکیوں کی چٹخنیاں چڑھا دیں
اور پردے برابر کر دیئے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے
کے لئے تیار ہو گئی۔ خان رحیمی نے تمام بتیاں بجھا کر صرف ایک چھوٹا نیلگوں بلب جلتا
رہنے دیا۔ ایک الماری کھول کر بوتل اور گلاس نکالا اور میرے سامنے بیٹھ کر پینے لگا۔ اس
کی آنکھوں میں فروزاں آگ میں صاف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے بوڑھے
چہرے سے الگ نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا وہ کسی جوان شخص کی آنکھیں ہوں۔

خان رحیمی نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس سے کھیلتے ہوئے بولا۔ "گرل مجھے
معاف کرنا میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ میری مجبوری ہے۔ ایک دلچسپ نفسیاتی مرض ہے۔
میں تمہیں اس بارے میں بتا دوں لیکن معلوم نہیں تم سمجھ سکو گی یا نہیں۔"

"جی فرمایئے!" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے پائپ کے کئی گہرے کش لئے اور فلسفیوں کی طرح چھت کو گھورتے
ہوئے بولا۔ "کوئی گناہ انسان کی دسترس میں ہو۔ وہ اسے کر سکتا ہو لیکن نہ کرے تو کیا ہوتا
ہے؟ انسان کے اندر ایک قوت پیدا ہوتی ہے۔ ہم اسے پارسائی کی قوت بھی کہہ سکتے
ہیں۔ پارسائی کی یہ قوت قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ خود پر عذاب جھیلنے سے ملتی ہے۔
شاید تم اس خوشی کو محسوس نہ کر سکو جو مجھے اس وقت حاصل ہے۔ تم میرے سامنے ہو۔
یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے پوری دنیا محو خواب ہے۔
میرے بازوؤں میں نشے کی طاقت ہے اور میرے ہاتھوں میں ریوالور۔ میں تم پر پوری

طرح حاوی ہوں لیکن میں تم سے اتنا ہی دور رہوں گا جتنا اب ہوں۔ میں تم سے کچھ
حاصل نہیں کروں گا سوائے اس روحانی قوت کے جو مجھے محبوب ہے۔ لوگ مجھے عورتوں
کا رسیا سمجھتے ہیں اور میری عمر دیکھ کر مجھ پر انگلیاں اٹھاتے ہیں لیکن شاید تمہیں یہ سن کر
حیرانی ہو کہ پچھلے چالیس سال سے کوئی عورت میری زندگی میں نہیں آئی۔ از اٹ ناٹ
سرپرائزنگ؟ پتہ نہیں تم میری باتوں کو سمجھ رہی ہو یا نہیں اور پتہ نہیں روحانی قوت
حاصل کرنے کا یہ طریقہ بھی درست ہے یا نہیں مگر اب اس عادت کو چھوڑ نہیں سکتا۔"

میں نے کہا۔ "سر! میں آپ کے اس طریقے سے اتفاق نہیں کر سکتی یہ تو ایسا ہے
کہ کوئی شخص پہلے کسی غریب کی چوری کرے اور پھر مسروقہ مال لوٹا کر خدا ترسی اور
سخاوت کا ڈھنڈورا پیٹے۔ روحانی قوت حاصل کرنے کے لئے بہت اعلیٰ و ارفع طریقے بھی
ہیں اور کچھ نہیں تو........."

"شاپ اِٹ شاپ اِٹ۔" اس نے مسکرا کر میری بات کاٹی۔ "تقریر نہیں چاہئے
بہت تقریریں سنتا رہا ہوں میں۔ ہر لڑکی مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہے۔
اپنے خوبصورت ہونٹوں سے کچھ ہلکی پھلکی باتیں کرو کچھ دلچسپ واقعات کچھ ہنسی مذاق
کے قصے تاکہ یہ شب آسانی سے کٹ سکے۔"

میں اس گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عجیب خبطی سے پالا پڑا تھا
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کس بات پر یقین کیا جائے اور کسے "خبط" سمجھا جائے۔
مے نوشی کے باوجود وہ مکمل طور پر ہوش میں تھا۔ بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ چوکنا نظر آتا تھا۔
میں نے کہا۔

"خان صاحب آپ نے کہا تھا میں کوٹھی پہنچ کر تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔
مگر ابھی تک آپ نے کچھ نہیں بتایا۔"

اسے جھٹکا سا لگا۔ سنبھل کر بولا۔ "ڈیئر گرل۔ میں نے ہلکی پھلکی باتوں کا کہا تھا۔ تم
نے تو میرے سر پر پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ ڈیئر یہ ذکر ابھی مناسب نہیں۔"

"پھر کب مناسب ہو گا؟"

"ایک مہینے تک......... مجھے معلوم ہے تمہیں وہ پرندے بے چین کر رہے ہیں
جنہیں تم دیکھ چکی ہو۔ ان پرندوں کو فی الحال تربیت دی جا رہی ہے۔ ایک ماہ بعد انہیں

اس مرغی خانے سے لاہور پہنچایا جانا ہے۔ اس وقت تک نہ مجھے کچھ معلوم ہے نہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔"

"کوئی اشارہ تو دے سکتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "ان پرندوں کو ملک سے باہر بھیجا جا رہا ہے اور اس سمگلنگ میں ایک اہم سرکاری کارندہ ملوث ہے۔ اس شخص کی نقاب کشائی تک یہ سازش مکمل طور پر اندھیرے میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "سر مکمل طور پر تو اندھیرے میں نہیں ہے مگر آپ بتانا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے واصف کے بعد اس سازش کا مرکزی کردار وہاب چنگیزی ہے اور وہاب چنگیزی دو تین ہفتوں تک الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ الیکشن سے پہلے یہ منصوبہ بے نقاب ہو جائے!"

خان رحیمی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "دیکھو گرل' تم عربی بدو کے اونٹ کی طرح گھستی آ رہی ہو۔ مجھ پر بھروسا کیا ہے تو اب بھروسا رکھو۔ تم وہاب چنگیزی سے اپنے بچے کا انتقام لینا چاہتی ہو۔ یہ کوئی معمولی خواہش نہیں ہے اس کے لئے بے پناہ صبر و تحمل اور دانشمندی کی ضرورت ہے۔ منزل تم سے زیادہ دور نہیں مگر تمہاری کوئی غلطی تمہارے مجرم کو ہمیشہ کے لئے تمہاری نظروں سے اوجھل کر سکتی ہے۔" خان رحیمی کا لہجہ ڈرامائی تھا۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

خان رحیمی اور میں دیر تک باتوں میں مصروف رہے۔ آخر چار بجے کے قریب خان کو اونگھ آنے لگی۔ اس نے ایک آخری جام چڑھایا اور مجھ سے معافی مانگتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں کمرے سے باہر نکلی تو پچھلے پہر کی خنک ہوا چل رہی تھی کمرے سے نکلتے ہوئے خود پر شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ آخر خان رحیمی کو کیا حق پہنچتا تھا پارسائی کا فخر حاصل کرنے کے لئے کسی کی نیک نامی کو داؤ پر لگانے کا۔ اس کا رویہ ہر طرح قابل مذمت تھا۔ میں دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ دفعتاً مجھے رکنا پڑا۔ عشرت کے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی رات کے پچھلے پہر یہ روشنی ناقابل فہم تھی۔ کیا وہ اب تک جاگ رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں اس کمرے کی طرف بڑھی۔ کھڑکیوں پر احتیاط سے پردے کھنچے تھے۔ میں نے پنجوں کے بل بیٹھ کر کی ہول سے آنکھ

لگائی۔ مسہری کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا مگر لگتا تھا کمرے میں کوئی نہیں۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ دروازہ دھکیلا وہ بھی اندر سے بند تھا۔ اچانک مجھے غسل خانے کا خیال آیا۔ یہ غسل خانہ کمرے کے ساتھ ملحق تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی کھڑکی پورچ کی طرف کھلتی تھی۔ میں دبے پاؤں پورچ کی طرف بڑھی۔ سب کچھ تیرگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کھڑکی بلندی پر تھی۔ میں نے لان سے لوہے کی ایک کرسی اٹھائی اور اس پر پاؤں رکھ کر کھڑکی میں جھانکا۔ اس کے پٹ تھوڑے سے کھلے تھے اور اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا عشرت ایک موٹی گوری سی عورت کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس عورت کا نام کلثوم تھا اور وہ چند روز پہلے ہی کوٹھی میں ملازم ہوئی تھی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس عورت نے عشرت کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور دانت پیس کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کہیں عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گئی کلموہی؟ سچ سچ بتا دے ورنہ وہ تیرا خصم سالار ایک بال نہیں چھوڑے گا تیرے سر پر۔"

عشرت اپنے بال چھڑاتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔ "خانم اللہ دی قسمے جھوٹ نہیں بول رہی۔ میرا بابری سے کیا تعلق؟"

کلثوم نے آنکھیں نکالیں۔ "اگر کوئی کیڑا ہے بھی تو اسے دماغ سے نکال دے اور جو کام تجھے کہا گیا ہے وہ کر۔ ابھی تک تیرا ایک ٹکے کا فائدہ نہیں ہوا ہے ہمیں۔ یہ خان رحیمی بڑی موٹی آسامی ہے اور ویسے بھی کسی بڑے گھرے چکر میں ہے۔ اچھی طرح ٹوہ لگا۔"

عشرت نے گردن سہلاتے ہوئے کہا "اچھا خانم' کہا تو ہے کہ کوشش کر رہی ہوں۔"

کلثوم یا خانم غرا کر بولی۔ "صرف کوشش سے کام نہیں چلے گا۔ وہ سالار بڑا غصے میں تھا کہتا تھا وہاں جا کر اپنے عیش و عشرت میں پڑ گئی ہے یہ دیکھ اس نے یہ لفافہ بھی مجھے دیا ہے۔ کہتا تھا اسے جا کر دکھانا تاکہ اسے اپنی اوقات یاد آئے۔"

گلابی رنگ کا لفافہ دیکھ کر عشرت کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا کر بولی۔

"نہیں.......... نہیں اس کی ضرورت نہیں اسے دور رکھو مجھ سے۔"

کلثوم کے چہرے پر فتح مندی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے لفافہ دوبارہ لباس میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کمرے میں چلی گئیں۔ میں جلدی سے نیچے اتری اور کرسی لان میں رکھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتی رہی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا معاملہ ہے۔ کلثوم نامی وہ عورت خوبصورت تو تھی مگر چہرے مہرے سے اچھی نہیں لگتی تھی۔ اب یہ بات کھل گئی تھی کہ اس کا تعلق شریف گھرانے سے نہیں۔ اس نے عشرت سے جو باتیں کی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ عشرت کو یہاں کسی خاص مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے۔ اور اسے بھیجنے والے "اس بازار" کے لوگ ہیں.......... یہ بھی ظاہر تھا کہ ان لوگوں کے پاس عشرت کی کوئی کمزوری ہے اور اس کمزوری کے سبب عشرت ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہے۔ مجھے وہ لفافہ یاد آیا جو کلثوم نے عشرت کو دکھایا تھا اور جسے دیکھ کر عشرت بری طرح دہل گئی تھی۔ رہ رہ کر عشرت کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور میں سوچنے لگی کہ اس لڑکی کی صورت میری بڑی بھابی سے اس قدر ملتی کیوں ہے اور اگر اس لڑکی میں اور میری بھابی میں کوئی تعلق ہے تو یہ تعلق ہمارے شریف گھرانے کے لئے کس قدر مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں اس بارے میں زیادہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ ایسا کرتے ہوئے میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔

کلثوم نامی اس نئی ملازمہ کا سامان سرونٹ کوارٹرز کے اسٹور میں پڑا تھا۔ اگلے روز میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے سامان کی تلاشی لوں۔ اس کام کے لئے میں نے دوپہر بارہ بجے کا انتخاب کیا۔ بارہ بجے کوٹھی کے زیادہ تر ملازمین مصروف ہوتے تھے۔ میں نے کلثوم کو برتن مانجھنے پر لگا دیا اور خود موقعہ دیکھ کر سامان والی کوٹھڑی میں گھس گئی۔ کلثوم کے سامان میں سے اہم ترین چیز ایک جستی ٹرنک تھا جس میں دونوں طرف چھوٹے چھوٹے تالے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی ہیئر پن سے ان تالوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک تو کھل گیا تاہم دوسرا مجھے توڑنا پڑا۔ ٹرنک میں کلثوم کے کپڑے تھے ایک برقعہ تھا' ایک پرانی چپل تھی جو موٹی لفافے میں بند پڑی تھی۔ وہ خاص لفافہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ تیں نے ایک ایک کپڑے کی تہیں کھولنی شروع کیں۔ آخر ایک گرم چادر کے اندر سے گلابی لفافہ پھسل کر فرش پر جا گرا۔ میں نے لفافے پر نگاہ ڈالی اور سرتاپا لرز

گئی۔ اس کے اندر کارڈ سائز کی کئی رنگین تصاویر نکل کر فرش پر پھسل گئی تھیں۔ ان تصویروں میں عشرت ایک مرد کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے ان تصویروں کو دوبارہ لفافے میں رکھا اور لفافے کو تہہ شدہ گرم چادر میں رکھ کر صندوق کو بند کر دیا۔ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ میں واپس اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر گر گئی۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ان تصویروں میں سے ایک تصویر میں مجھے بڑے بھائی جان کی ساس نظر آئی تھی۔ وہ بدحال اور مدہوش عشرت کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہی خوف جما ہوا تھا۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے دماغ میں یہ سوال آہنی میخ کی طرح گڑ گیا۔ میری بڑی بھابی کی تو کوئی بہن ہی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی انہوں نے ذکر کیا تھا پھر یہ لڑکی کون تھی۔ تصویروں سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ عشرت میری بھابی کی بہن ہے یا کوئی بہت قریبی عزیز ہے۔ گمان غالب یہی تھا کہ وہ بھابی کی بہن ہے۔ بھابی کی بہن اور بدنام گھرانے سے تعلق اور یہ خوفناک تصویریں؟ خدا معلوم یہ کیا چکر تھا۔ میرے تصور میں بڑے بھائی جان کا چہرہ آیا۔ کس قدر شریف النفس تھے۔ وہ کتنے خاموش طبع۔ بھابی اور بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ بمعہ اہل و عیال دو دفعہ عمرے پر جا چکے تھے۔ خدانخواستہ انہیں یہ سب کچھ معلوم ہو جاتا تو ان کے دل پر کیا بیتتی۔ بھابی کے بارے کیا کیا بدگمانیاں ان کے دل میں نہ آتیں۔

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں' میں نے عشرت سے اس کی کسی ہم شکل بہن کے بارے میں پوچھا تھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کی کوئی بہن ہے۔ اب اس کے اقرار کے بغیر ہی یہ بات ثابت ہو چکی تھی۔ میں شام تک اس بارے میں سوچتی رہی اور پھر عشرت کے پاس پہنچی میں نے اس سلسلے میں اسے پھر کریدنے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی بات بتا کر نہیں دی۔ میں کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی اس میں کئی خطرات پوشیدہ تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ میں اس کو اعتماد میں لوں۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں بھابی کو مطلع کرتا جائے۔ عشرت جن لوگوں کے چنگل میں تھی وہ اسے کہیں سے کہیں پہنچا سکتے تھے۔ عشرت کی بدنامی بھائی جان کے سسرال کی بدنامی تھی بلکہ ہمارے پورے گھرانے کی بدنامی تھی۔ بھابی کو مطلع کرنے کے لئے مجھے لاہور جانا پڑتا تھا۔ میں ایک مفرور ملزمہ تھی لیکن

ایک عورت ہونے کی حیثیت سے میرے لئے سفر دشوار نہیں تھا۔ برقعہ پہن کر میں کہیں بھی جا سکتی تھی۔

تیسرے روز کی بات ہے دن کے دو بجے تھے میں رکشے میں سوار موہنی روڈ پہنچی۔ میں نے سیاہ ریشمی برقعہ پہن رکھا تھا نقاب کے پیچھے سے میری آنکھیں جانے پہچانے درودیوار کو دیکھ رہی تھیں' شناسا گلیاں اور شناسا چہرے۔ کبھی میں بھی ان چہروں میں شامل تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ چلتی تھی۔ پوری آزادی اور بے فکری کے ساتھ۔ ہر طرف یادوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے رکشہ اپنے گھر سے چالیس پچاس گز دور ایک گلی کے ناکے پر روک لیا۔ سفر شروع کرنے سے پہلے ہی رکشے والے کو دو سو روپے کے نوٹ تھما چکی تھی لہٰذا اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ میں کہاں جاتی ہوں' کہاں رکتی ہوں اور کیا کرتی ہوں۔ معلوم نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا اور ظاہر تھا برا ہی سوچ رہا ہو گا۔ رکشے میں سوار ہوتے ہی میں اس کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہر چکی تھی۔ عام گھریلو عورتیں یوں رکشے والوں کی مٹھی گرم نہیں کرتیں۔ میں نے رکشے والے سے کہا مجھے کسی کا انتظار ہے میں کچھ دیر اندر ہی بیٹھوں گی۔ وہ چاہے تو ادھر ادھر گھوم پھر سکتا ہے۔

گلی کا یہ حصہ زیادہ بارونق نہیں تھا اور مجھے رکشے میں دیکھ کر کوئی یہی سمجھتا کہ کسی قریبی گھر سے مجھے کسی کا انتظار ہے۔ میں رکشے میں بیٹھ رہی اور میری پیاسی نگاہیں اپنے سلیٹی گیٹ کو تکتی رہیں۔ مجھے معلوم تھا شعیب' عارف' سلیمان اور پنکی اسکول سے آ چکے ہوں گے۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد وہ حسب عادت کھیل کود کے لئے گلی میں نکل آئیں گے اگر بڑی بھابی نے ان پر بہت زیادہ آنکھیں نکالیں اور کھینچ تان کر انہیں تھوڑی دیر سونے کے لئے لٹا دیا تو بھی شعیب تو ضرور باہر نکلے گا۔ وہ تو کسی کے قابو میں نہیں آیا کرتا تھا گرمیوں کی طویل دوپہروں میں میں اسے اپنے ساتھ لٹا کر تھپکتی رہتی تھی وہ دم سادھے پڑا رہتا تھا۔ جونہی میری آنکھ لگتی تھی وہ اٹھ کر بھاگ جاتا تھا۔ پھر میں نے اپنا پراندہ اس کے بازو کے ساتھ باندھنا شروع کر دیا۔ ایک دوپہر اس نے میرا پراندہ قینچی سے کاٹ لیا۔ شام کو بھائی جان سے اسے مار پڑی وہ روتا ہوا میری گود میں آ گیا۔ مصیبت میں اسے صرف میں ہی یاد آیا کرتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات مجھے جتانے آیا کرتا تھا۔ ایک پہر

میرے بنا رہنا اسے دشوار تھا۔ اب نہ جانے کس کی گود میں چھپتا تھا' کسے اپنا دکھڑا بتاتا تھا۔ میری شکل دیکھے ہوئے تو اسے مہینوں بیت گئے تھے............ مجھے گھر کے کسی فرد کی شکل دیکھنے کے لئے کافی انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر کوئی آدھ گھنٹے بعد مجھے شعیب اور پنکی نظر آئے۔ پنکی تو دروازے کے پاس سے ہو کر واپس چلی گئی مگر پانچ سالہ شعیب حسب عادت اپنا ہاتھ باؤلنگ کے انداز میں گھماتا ہوا رکشے کی طرف بڑھا۔ اس نے میرے ہی ہاتھ کی سی ہوئی پینٹ قمیض پہن رکھی تھی اور بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ بازار جا رہا ہے۔ جب وہ رکشے کے پاس سے گزرا تو میں نے آواز دی۔

شعیب بات سنو۔"

وہ چونک کر رکشے میں دیکھنے لگا۔ میں نے نقاب ہٹا کر اسے چہرہ دکھایا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں حیرت کا سمندر نظر آیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے گا۔ مگر پھر وہ میری طرف کھچا چلا آیا۔ "پھوپھو جی آپ؟" اس کے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔ میں نے بازو پکڑ کر اسے رکشے میں سوار کرا لیا۔ وہ میرے ساتھ لپٹ گیا۔

میں اس کا منہ چومنے لگی۔ دل بھر آیا بہت دیر میں اسے پیار کرتی رہی۔ پھر پرس سے نکال کر اس کی پسندیدہ سویٹس کھانے کو دیں۔ وہ مجھے کھینچنے لگا کہ میں اس کے گھر چلوں۔ اس بیچارے کو میری مجبوریوں کا کیا پتہ تھا۔ میں نے پوچھا گھر میں کون کون ہے۔ اس نے اپنی امی چاچی' چاچی کی والدہ اور دیگر بہن بھائیوں کا ذکر کیا۔ میں نے پہلے سے لکھا ہوا ایک رقعہ شعیب کو دیا اور اسے کہا کہ امی کو جا کر دے دے۔ میں نے لکھا تھا۔

"بھابی جان' میں جانتی ہوں اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کیلئے بند ہو چکے ہیں میں یہ دہلیز پار کر کے بھائی جان کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔ مگر ایک ایسی مجبوری ہے جس کے سبب میرا آپ سے ملنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ میں آپ سے صرف آدھ پون گھنٹے کا وقت چاہتی ہوں۔ باہر سواری میں بیٹھی میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ جس طرح بھی مناسب سمجھیں مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔ والسلام"

شعیب کے ہاتھ رقعہ بھیج کر میں رد عمل کا انتظار کرنے لگی۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا نہ شعیب باہر آیا اور نہ گھر کا کوئی اور فرد۔ ایک گھنٹہ اس طرح گزر گیا۔ اس دوران

صرف یہ ہوا کہ بالائی منزل کی ایک کھڑکی چند بار کھلی اور بند ہوئی۔ میں سخت بے قراری میں گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بھائی جان کے ہسپتال سے آنے میں اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ان کی آمد سے قبل بھابی سے گفتگو کرلوں۔ آخر مجبور ہو کر میں رکشے سے نکلی اور اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دھڑکتے دل سے میں نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹا دروازہ کھلا دروازہ کھولنے والی بھابی ہی تھی۔ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا اور نہایت بیگانگی سے بولیں۔

"کیا بات ہے۔ کیا لینے آئی ہو یہاں؟"

میں نے کہا "پلیز بھابی صرف آپ کی خاطر آئی ہوں آپ کے بھلے کی بات ہے۔"

وہ بولیں "ہمیں نہیں چاہیئے ایسا بھلا۔ پچھلی بار تو نے گھر میں قدم رکھا تھا تو پورا ہفتہ پولیس نے تیرے بھائی کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس دفعہ تو وہ جیل ہی پہنچ کر رہیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی بھابی نے نہایت نفرت اور غصے سے دروازہ میرے منہ پر بند کر دیا۔ میں سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔ حلق میں جیسے کانٹے اتر رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی گر جاؤں گی، ہمت کرکے میں نے کہا "بھابی خدا کیلئے.......... تمہارے فائدے کی بات ہے۔" دروازے کی دوسری طرف سے بھابی نے کہا۔

"میں کہتی ہوں چلی جا۔ ورنہ خود بھی بے عزت ہوگی، ہمیں بھی کروائے گی" اس کے ساتھ ہی وہ دروازے سے دور چلی گئیں۔ اب کچھ کہنے سننے کو باقی نہیں رہا تھا۔ میں آہیں بھرتی ہوئی واپس رکشے میں آبیٹھی۔ دل پر ناقابل برداشت بوجھ تھا۔ کاش میں رو ہی سکتی۔ آنسو خشک ہونے کا محاورہ بہت دفعہ سنا تھا مگر کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب میرے آنسو سچ مچ خشک ہو جائیں گے اور میں رونے کو ترسوں گی.......... میں نے رکشے والے کو اخبار کے دفتر چلنے کو کہا۔ یہ وہی اخبار تھا جس میں فرخندہ ان دنوں کام کر رہی تھی۔ رکشہ اس بلند و بالا دفتر کے سامنے رکا تو میں نے استقبالیہ کمرے سے فرخندہ کے شعبے میں فون کیا۔ اس سے بات ہوگئی میری آواز سن کر وہ فون پر تقریباً چیخ پڑی۔ گلوگیر لہجے میں بولی، میں آ رہی ہوں۔ صرف ایک منٹ رکو میں پہنچ رہی ہوں۔ پھر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ تیسری منزل سے گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی۔ میں نے اسے بتایا

تھا کہ میں رکشے میں بیٹھی ہوں۔ دفتر سے باہر آکر اس نے تیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر رکشہ پہچان کر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ جونہی وہ رکشے میں بیٹھی میں نے ڈرائیور کو چلنے کو کہا۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر میں نے رکشے والے کو باغ جناح چلنے کی ہدایت کی۔ وہ ہمیں گنگارام ہسپتال کے سامنے سے گزار کر اس دروازے پر لے آیا جہاں سٹیج ڈراموں کے بورڈ وغیرہ آویزاں ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر میں نے رکشے کو فارغ کر دیا۔

باغ جناح کے ایک پرسکون کونے میں بیٹھ کر فرخندہ نے میرا ہاتھ کتنی دیر ہونٹوں سے لگائے رکھا۔ اس کے گرم آنسو میرے ہاتھ کی پشت کو بھگو رہے تھے۔ یہ آنسو سب کچھ کہہ رہے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے۔ ان آنسوؤں کے ہوتے ہوئے زبان کو حرکت دینا بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بمشکل اسے چپ کرایا وہ بولی۔

"آج تو میں خدا سے کچھ بھی مانگتی مجھے مل جاتا۔ آج میں نے جتنی شدت سے تمہیں یاد کیا ہے۔ زندگی میں کسی کو نہیں کیا۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟ خیریت تھی؟"

وہ بولی "خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ ایک بہت اہم رپورٹ ہے تمہارے لئے۔ میں نے پچھلے مہینوں میں جو بھاگ دوڑ کی ہے اس کا صلہ اب ملا ہے ہمیں۔ یوں سمجھ لے تیرے دشمن کی گردن ناپ لی ہے میں نے" وہ خاصی پرجوش نظر آ رہی تھی۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولی "یوں نہیں، تھوڑا صبر کرنا پڑے گا تمہیں کہاں ٹھہری ہوئی ہو تم؟" میں نے بتایا کہ ابھی تو کہیں بھی نہیں بس اڈے پر اتری تھی وہاں سے رکشہ لیا راستے میں تھوڑی سی شاپنگ کی پھر گھر گئی اور گھر سے اس کے پاس آگئی ہوں۔ چٹکی بجاتے ہوئے بولی "تو چلو اٹھو.......... فوراً اٹھو پہلے تمہاری رہائش کا بندوبست کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "لیکن کہاں؟"

وہ بولی "ہوٹل میں۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "ہوٹل میں اکیلی رہوں گی؟"

اس نے کہا "ہوٹل نہیں.......... اسے گھر ہی سمجھو۔ بڑی اچھی انتظامیہ ہے اس کی۔"

اس کے لہجے پر میں چونک سی گئی میں نے کہا "خیریت ہے؟ بڑی تعریفیں ہو رہی ہیں انتظامیہ کی۔ کس کا ہوٹل ہے یہ؟"

وہ زیر لب مسکرائی "ہے ایک فضول سا آدمی۔ امریکہ سے ہوٹلنگ میں ڈپلومہ لے کر آیا ہے۔ امی کہتی ہے کہ ہمارا دور کا رشتے دار بھی ہے ویسے مجھے تو یقین نہیں آتا.........."

میں نے آنکھیں پھاڑیں "اچھا........ اچھا تو یہ بات ہے۔ میں بھی کہوں یہ ہوٹل کا ذکر کرتے ہی چہرے پر لالیاں کیوں دہکنے لگی ہیں۔ فرخندہ کی بچی، سچ سچ بتا یہ کیا معاملہ ہے؟"

اس نے سر جھٹک کر خوبصورت بال پیشانی سے ہٹائے "معاملہ شاملہ کچھ نہیں ہے ڈیئر۔ بس........ حضرت لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے میرا بیڑا غرق کرکے ہی چھوڑیں گے۔ اچھی بھلی نوکری کر رہی تھی یہ نوکری رات دن ان کی آنکھ میں کھٹک رہی ہے۔ شاید انہوں نے مقصد بنا رکھا ہے کہ جرنلزم کو ایک محنتی اور بلند پایہ جرنلسٹ سے محروم کرکے چھوڑنا ہے چاہے اس کی خاطر مجھ جیسی اونگی بونگی سے بیاہ رچانا پڑے۔ اور تو اور امی بھی اس سازش میں برابر کی شریک ہیں۔"

میں نے کہا "اور مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی اس سازش میں "برابر" کی شریک ہو۔"

وہ بولی "توبہ ہے ادھر تو برا حال ہو رہا ہے اپنے کیریئر کی تباہی کا سوچ کر.........."

اتنے میں گارڈن میں گھومنے والے کچھ آوارہ لڑکے ہمارے اردگرد منڈلانے لگے۔ فرخندہ نے کہا "چلو اٹھو، باقی باتیں کمرے میں بیٹھ کر ہوں گی" ہم دونوں گارڈن سے باہر آئیں اور رکشے میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئیں۔

ایک فیشن ایبل علاقے میں یہ ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔ سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تین منزلہ عمارت تھی۔ ہر جگہ نفاست اور سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔ فرخندہ کو دیکھ کر ملازمین نے جھک کر سلام کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ یہاں آتی رہتی ہے۔ مجھے لے کر سیدھی منیجر کے کمرے میں چلی گئی۔ منیجر نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور ہمیں دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک دراز قد وجیہہ شخص تھری پیس سوٹ پہنے

اندر داخل ہوا۔ فرخندہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھرگئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہی فرخندہ کا منگیتر ہے۔ راستے میں فرخندہ مجھے بتا چکی تھی کہ عابد کے ساتھ اس کی منگنی ہوچکی ہے۔

"ہیلو فرخندہ" عابد نے چہک کر کہا "بھئی آنا تھا تو مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی۔ میں تو حیران رہ گیا ہوں بالکل۔"

فرخندہ نے کہا "آپ کو اطلاع دینے سے کیا فائدہ ہوتا یہی ہوتا ناکہ آپ حیران نہ ہوتے۔ کیا بگڑ گیا ہے آپ کا تھوڑا سا حیران ہو کر۔"

عابد نے کہا "میرا مطلب ہے.......... ہم تھوڑا سا انتظار کرلیتے آپ کا۔ انتظار کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔"

فرخندہ بولی "اگر ایسا ہے تو میں آپ کے لطف اندوز ہونے کا پکا پکا انتظام کر دوں گی........ ویسے جناب، مجھے آپ کی طرح قدموں تلے انتظار کا سرخ کارپٹ بچھوانے کا شوق نہیں۔"

فرخندہ کے لہجے میں کاٹ تھی۔ غالباً ان دونوں میں کوئی چھوٹی موٹی ناراضگی چل رہی تھی۔ عابد نے بے تکلفی سے کہا۔ "ملکہ عالیہ اب اس بندۂ عاجز کو مزید شرمندہ نہ کریں۔ میں تو پہلے ہی آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں........ بے حد ضروری میٹنگ تھی ورنہ میں سارے رسے تڑا کر آپ کی سہیلی کی سالگرہ میں پہنچ جاتا۔ اب میری سزا یہ ہے کہ میں ایک مہینے تک روزانہ کم از کم ایک چکر آپ کی سہیلی کے گھر ضرور لگاؤں گا اور اگر فرمائیں گی تو ہر روز ایک تحفہ بھی.........."

"فضولیات نہیں چاہئیں مجھے" فرخندہ نے اس کی بات کاٹی۔ پھر میری طرف اشارہ کرکے بولی "یہ میری عزیز ترین سہیلی ہیں۔ دو تین روز آپ کے ہوٹل میں رہیں گی۔"

عابد نے گڑبڑا کر کہا "معاف کیجئے۔ ہم اپنی باتوں میں آپ کو بالکل بھول ہی گئے ویری سوری" عابد کے لہجے میں شائستگی تھی اور طور اطوار سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد مہذب شخص ہے۔ اتنے میں منیجر نے اندر آکر اطلاع دی کہ مس فرخندہ کیلئے اخبار کے دفتر سے فون ہے۔ عابد بولا

"لیجئے ایڈیٹر صاحب! آپ کی جدائی میں پریشان ہوگئے ہیں" فرخندہ اسے پیار بھری

ناراضگی سے گھورتی ہوئی باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آکر بتایا کہ اسے فوری طور پر دفتر پہنچنا ہے۔ اس نے عابد کو میرے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی........ عابد نے فرخندہ کا فرمانبردار منگیتر ہونے کے "ٹھوس ثبوت" فراہم کئے اور میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے سوٹ کے بالکل سامنے میرے لئے دو کمروں کا ایک سوٹ مخصوص کر دیا اور سپیشل طور پر کلرڈ ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کی سہولت فراہم کی۔ وہ کمپنی دینے کے لئے کافی دیر میرے پاس رہا اور باتیں کرتا رہا۔ وہ ایک دلچسپ آدمی تھا۔ اس کی باتوں سے فرخندہ کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ وہ کچھ ہی ماہ پہلے امریکہ سے واپس آیا تھا۔ اسے یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا میرے بارے میں بھی اس کی معلومات محدود تھیں۔ اسے اتنا معلوم تھا کہ میں اور فرخندہ گہری سہیلیاں ہیں۔ فرخندہ نے اسے میرے بارے میں بتا رکھا تھا کہ میں اب لاہور میں نہیں رہتی۔ رات قریباً ساڑھے آٹھ بجے فرخندہ کا فون آیا اس وقت میں کمرے میں تنہا تھی۔ فرخندہ کسی میڈیکل سٹور سے بول رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"بہت افسوس ہے تمہیں تنہا چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہوں۔ بہت ضروری کام تھا اب بھی اس میں پھنسی ہوئی ہوں ایک دو گھنٹے میں نبٹا لوں گی صبح کا ناشتہ ہم اکٹھے ہی کریں گے۔"

میں نے کہا "عابد ٹھیک ہی کہتا ہے کہ نوکری چھوڑ دو' ورنہ وہ بھی تمہیں صبح کے ناشتے پر ہی دیکھا کرے گا۔"

وہ ہنس کر بولی "سب ہی صبح کو دیکھتے ہیں۔ رات کو اندھیرے میں اٹھ اٹھ کر کون دیکھتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری فقرے بازی کی عادت کبھی نہیں جائے گی۔"

"وہ بولی "یہ عادت تو اور بھی بگڑ چکی ہے لیکن ان دنوں میں بے حد سنجیدہ ہوں شنا....... صبح تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گی۔"

اس گفتگو کے کچھ ہی دیر بعد میں سوگئی۔ رات کے پچھلے پہر ایک پرشور دستک سے میری آنکھ کھلی کمرے کی بتی جل رہی تھی میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا کون ہے دوسری طرف سے مینجر افتخار کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ مینجر کافی گھبرایا ہوا

تھا۔ جلدی سے اندر آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں یہ دیکھ کر میرا دل دہل گیا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس نے کہا "مس فرخندہ کو کسی نے گولی مار دی ہے۔ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچائی گئی ہیں۔ عابد صاحب بھی ہسپتال گئے ہیں۔ جاتے جاتے وہ سختی سے ہدایت کر گئے ہیں کہ آپ کمرے سے باہر نہ نکلیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ صرف میری یا عابد صاحب کی دستک پر دروازہ کھولیں" یہ کہتے ہوئے مینجر افتخار جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں پتھر کی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یہ کیسی خبر تھی جو میرے کانوں نے سنی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ مینجر نے ایک بار پھر دروازے سے منہ نکال کر کہا "مس پلیز' دروازہ بند کر لیں" میں نے ہاتھ بڑھا کر چابی گھما دی اور بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ لب آپوں آپ حرکت میں آگئے اور دل سے فرخندہ کی زندگی کیلئے دعائیں نکلنے لگیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد عابد کا فون آیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ فرخندہ کی حالت ٹھیک نہیں اسے آپریشن تھیٹر پہنچایا جا رہا ہے اس نے مجھے تاکید کی کچھ بھی ہو جائے میں ہوٹل سے باہر نہ نکلوں۔ وہ کوئی اہم بات مجھ سے چھپا رہا تھا۔ میں ہیلو ہیلو ہی کرتی رہ گئی اور فون بند ہو گیا۔ قریباً آدھ گھنٹہ میں نے سخت کرب کے عالم میں گزارا۔ آخر عابد کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ فرخندہ مرگئی ہے۔ وہ فون پر ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فرخندہ مرگئی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کا ایک حصہ مردہ ہو کر میرے ہاتھ میں جھول گیا ہے۔ ہر دم بولنے والی اور کبھی نہ تھکنے والی فرخندہ خاموش ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہنستا مسکراتا' شرارتیں کرتا' اور خواب دیکھتا' کانٹے چنتا اور پھول بکھیرتا ہوا ایک عہد بھی مر کر ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ آہ فرخندہ میں تجھے اب کہاں ڈھونڈوں گی۔ زندگی کے تپتے صحرا میں ایک شجر سایہ دار تھا وہ بھی نہ رہا۔ اب ہانپ کر کس دیوار کے سائے میں بیٹھوں گی۔ کون مجھے گلے لگائے گا۔ میرے ہاتھ کو چومے گا اور آنسو بہائے گا۔ کون میرے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دے گا اور میرے لئے راتیں جاگے گا۔ میں سوچتی رہی۔ دل میں درد جگاتی رہی کہ شاید اس طرح میری آنکھوں میں آنسو آ جائیں اور پہاڑ سا بوجھ جو میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والا ہے کسی طرح کم ہو جائے۔ مگر میرے لئے آنسو اس روز محشر کے دامن میں بھی نہیں

تھے۔

پورے اڑتالیس گھنٹے میں اس کمرے میں بند رہی۔ اپنی ماں کی طرح اپنی عزیز ترین سہیلی کا آخری دیدار بھی میری قسمت میں نہیں تھا۔ مینیجر افتخار مجھے خود کمرے میں کھانا پہنچاتا رہا تھا۔ وہ واحد شخص تھا پچھلے تین دنوں میں' میں نے جس کی شکل دیکھی تھی۔ اس نے مجھے کوئی فون کال ریسیو کرنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔ میں اس سے پوچھ پوچھ کر ہار گئی تھی لیکن وہ کچھ نہیں بتاتا تھا کہ میرے باہر جانے میں کیا خطرہ ہے۔ میری سمجھ میں یہی بات آ رہی تھی کہ فرخندہ کو جان سے مارنے والے لوگ میری یہاں موجودگی سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں اور میرے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ میں نے پہلی بار موت کی سرد انگلیوں کو اپنے اردگرد سرسراتے محسوس کیا۔ یوں لگا جیسے بہت سے تاریک سائے میری طرف بڑھتے آ رہے ہیں اور میں عنقریب گھٹاٹوپ تاریکی میں چھپنے والی ہوں۔ یہ تاریک سائے کن لوگوں کے تھے۔ میرے لئے یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ان سب تاریکیوں کا منبع وہی بڑی حویلی تھی جہاں سرخ چہروں' گھنی مونچھوں اور بھاری آوازوں والے چنگیزی گھناؤنی سازشوں کے تانے بانے بنتے رہتے تھے۔ فرخندہ ان ہی سازش زادوں کی کھوج میں تھی۔ وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی۔ مگر مجھے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ ہونٹوں پر موت کی مہر لگا کر قبر میں اتر گئی۔ میرے لئے ان سب کڑیوں کو ملانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

تیسرے روز عابد میرے کمرے میں آیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یوں لگا جیسے وہ ان ۷۲ گھنٹوں میں ۷۲ سال گزار چکا ہے۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آتا تھا اور آنکھوں سے بڑھاپے کی نقاہت جھانک رہی تھی۔ وہ سرتا پیر قابل رحم تھا۔ لٹا پٹا سا وہ میرے سامنے بیٹھ گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ اس نے کچھ تصویریں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ یہ فرخندہ کی تصویریں تھیں اور عابد نے میری ہی ہدایت پر کھینچی تھی یا شاید کسی سے کھنچوائی تھیں۔ یہ "میری فرخندہ" کے سفر آخرت کی تصویریں تھیں۔ وہ نرم ہونٹوں پر مسکان لئے گلاب کے پھولوں میں گھری ہوئی تھی۔ کتنی خوبصورت دلہن تھی۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی اور سرخ جوڑے کے بغیر بھی وہ کتنی خوبصورت دلہن تھی۔ اسے معلوم تھا دلہن تصویر کیسے کھنچواتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر

رکھی تھیں۔ میں ان تصویروں کو دیکھتی رہی اور میری آنکھوں میں کانٹے ٹوٹتے رہے۔
اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مینیجر افتخار کی آواز پہچان کر عابد نے دروازہ کھولا۔ افتخار نے عابد کے کان پر جھک کر ایک گھبرائی ہوئی سرگوشی کی۔ عابد کی آنکھوں میں بھی بے چینی کروٹیں لینے لگی۔ اس نے فوراً مجھے اپنے ساتھ لیا اور کمرے سے نکل آیا۔ میرا بازو تھام کر وہ کوریڈور میں تقریباً بھاگنے لگا۔ پھر اس نے مجھے جلدی سے ایک خالی کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ "عابد...... عابد" میں پکارتی رہی۔ لیکن وہ اب بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔

یہ سنگل بیڈ کمرہ تاریک اور خالی تھا۔ میں لائٹ آن کرتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ پھر ایک اور پراندیش خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں عابد میری حفاظت کیلئے پولیس سے رابطہ قائم نہ کرلے۔ اگر وہ پولیس لے کر اس کمرے میں آجاتا تو کیا ہوتا۔ پھر میں نے دل کو تسلی دی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر عابد نے اس معاملے میں پولیس کو لانا ہوتا تو اب تک لا چکا ہوتا۔ ایکاایکی کمرے میں رکھے ہوئے اندرونی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے باتھ روم کی ٹیوب جلا کر معمولی روشنی کی اور ریسیور اٹھالیا دوسری طرف عابد تھا۔ اس نے کہا۔

"مس ثناء' گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے وہاں بیٹھیں میں ابھی آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔"

میں نے چلا کر پوچھا "لیکن یہ کیا معاملہ ہے تم لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ کس نے قتل کیا ہے فرخندہ کو؟ کون مجھے مارنا چاہتا ہے؟"

عابد نے کہا "پلیز مس ثناء۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں لیکن فی الحال......"

ابھی بات اس کے منہ ہی میں تھی کہ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے غرا کر عابد کو دھکا دیا یا اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر شیشے کی تپائی پر پھینک دیا۔ شیشہ تڑخنے کی مدھم آواز آئی۔

عابد نے گرج کر پوچھا "تمہیں کس نے اندر آنے دیا ہے!"

جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی "ہمیں اندر آنے کیلئے کسی کتے سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔"

عابد بولا "زبان سنبھال کر بات کرو، تم میری چھت کے نیچے کھڑے ہو۔ کیوں آئے ہو تم یہاں؟"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" بھاری آواز نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ یہ گفتگو فون کے ذریعے مجھ تک پہنچ رہی تھی لیکن آخری فقرہ اتنی صاف آواز میں اور ایسے درست تلفظ کے ساتھ بولا گیا تھا کہ میں بولنے والے کو پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے پاؤں کے تلوؤں سے سر کے بالوں تک برق سی دوڑ گئی۔ بولنے والا وہاب چنگیزی تھا۔ وہ شخص جو روئے زمین پر میرے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا اور جس کی موت کیلئے میں زندہ تھی۔

میرا دل چاہا کہ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر یہاں سے نکلوں اور اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں وہ شیطان، عابد کے ساتھ مصروف گفتگو ہے۔ پھر آنکھیں بند کرکے اس پر جھپٹ پڑوں اور اپنی جان دے دوں یا اس کی جان لے لوں۔ ایک مرتبہ تو اس ارادے کے ساتھ میرے قدم دروازے کی طرف اٹھے بھی، لیکن پھر عابد کی آواز میرے تصور میں گونجنے لگی۔ اس نے بار بار کہا تھا کہ میں اس کمرے سے باہر نہ نکلوں......... میں ان درودیوار میں اجنبی تھی اور عابد مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ پھر مقابلہ بھی وہاب چنگیزی جیسے درندے سے تھا۔ معلوم نہیں اس کمرے سے باہر حالات کیا تھے۔ فون سے آنے والی آوازیں اب معدوم ہوچکی تھیں۔ شاید سب لوگ اس کمرے سے نکل گئے تھے۔ دفعتاً میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کوریڈور میں تیزی سے بھاگتے قدموں کی صدا آ رہی تھی۔ یہ صدا دروازے کے عین سامنے آکر رک گئی۔ میں نے ایک وزنی گلدان کو ہتھیار کے طور پر سنبھالا اور ایک دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ دروازے کے تالے میں چابی گھومی اور وہ کھل گیا۔ "ثناء!" عابد کی گھبرائی ہوئی سرگوشی سنائی دی میں لپک کر اس کے سامنے آگئی۔ اس نے بغیر کچھ کہے میرا بازو تھاما اور مجھے کھینچتا چلا گیا۔ کوریڈور عبور کرکے ہم زینوں پر پہنچے۔ کچھ کمروں کے دروازوں اور کھڑکیوں سے ہراساں چہرے ہمیں جھانک رہے تھے۔ پچیس تیس زینے طے کرکے ہم چھت پر پہنچ گئے۔ چھت پر تاریکی تھی۔ کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا عابد نے چھت پر کھلنے والا دروازہ چھت کی طرف سے بند کیا اور مجھے لے کر ایک منڈھیر کی طرف آگیا۔ منڈھیر کی اونچائی آٹھ نو انچ

سے زیادہ نہیں تھی۔ ہوٹل کی عمارت کے پہلو پر ایک اور تین منزلہ عمارت تھی۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی تھی۔ قریباً دس گیارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ عابد نے چھت پر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ شاید وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ ناکام ہو کر وہ پانچ چھ قدم پیچھے ہٹا اور بھاگ کر دونوں چھتوں کا درمیانی خلا پھلانگ گیا۔ وہ ایک چاق و چوبند باہمت نوجوان تھا۔ مگر میرے لئے یوں دوسری چھت تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس اثناء میں چھت کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ موت کے ہرکارے میرا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ گئے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دوسری چھت پر عابد ہاتھ میں کوئی وزنی چیز اٹھائے لا رہا تھا۔ یہ ایک آہنی گارڈر تھا جو اسے دوسری چھت پر پڑا نظر آگیا تھا۔ یہ گارڈر جو تیرہ چودہ فٹ لمبا تھا اس نے اس طرح پھینکا کہ دونوں چھتوں کے اوپر ایک پل صراط سی بن گئی۔ "آ جاؤ ثناء" وہ تیزی سے بولا۔ دروازے پر بے پناہ زور ڈالا جا رہا تھا وہ کسی بھی لمحے ٹوٹنے والا تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے گارڈر پر قدم رکھا اور دھیرے دھیرے دوسری چھت کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ بڑی پرخطر ساعتیں تھیں۔ قدموں کی ایک لغزش مجھے چالیس فٹ نیچے پختہ گلی میں ڈھیر کرسکتی تھی۔ گو گارڈر کی چوڑائی آٹھ نو انچ تھی مگر اس وقت وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں یہ چند فٹ کا سفر طے کرنے میں کامیاب ہوئی۔ عابد نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے بھگاتا ہوا زینوں تک لے آیا۔ میں بار بار پوچھ رہی تھی کہ وہ کہاں جائے گا مگر اس کا ایک ہی جواب تھا "بتاتا ہوں......... سب کچھ بتاتا ہوں" اس عمارت میں مختلف کمپنیوں اور اداروں کے دفاتر تھے اس وقت زیادہ تر عمارت تاریک پڑی تھی۔ بس کسی کمرے میں روشنی نظر آتی تھی ہم چکردار زینے طے کرتے ہوئے نیچے آئے اور عمارت کے احاطے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گئے۔ یہاں خوش قسمتی سے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ ہم ٹیکسی میں گھس گئے۔ عابد نے ڈرائیور کو ڈیفنس چلنے کو کہا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم ڈیفنس کی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے اتر رہے تھے۔ ٹیکسی والے کو فارغ کرکے عابد نے مجھے وہیں سڑک پر چھوڑا اور خود جلدی سے کوٹھی میں گھس گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ایک ہنڈا سوک کار لے کر باہر آ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میں بیٹھ گئی۔ وہ مشاقی سے بھری پری سڑکوں پر ڈرائیور کرنے لگا۔ شاہراہ قائداعظم پر پہنچ

کر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے پارکنگ کی۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے اور ویٹر ہمارے لئے بیف برگر اور کولڈ ڈرنک لے آیا.......... ان حالات میں کھانے پینے کا ہوش کسے تھا یہ تو صرف یہاں رکنے کا ایک بہانہ تھا۔

عابد نے ایک گہری سانس لی اور پوچھا "یہ چودھری وہاب چنگیزی کون ہے؟"

میں نے کہا "تم اسے نہیں جانتے؟ یہ وہی شخص ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ہوٹل میں گھس آیا تھا۔ میں نے فون پر تمہارا جھگڑا سنا تھا۔"

عابد نے کہا "مس ثناء' مرنے سے قبل فرخندہ نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ہر صورت میں آپ کی حفاظت کروں اور آپ کو ان ہاتھوں تک پہنچا دوں جنہیں آپ اپنے لئے محفوظ سمجھتی ہیں....... میں انشاء اللہ جان پر کھیل کر بھی وعدہ نبھاؤں گا.......... آپ بتائیں آپ کہاں جانا چاہتی ہیں۔" عابد کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

میں نے کہا "مسٹر عابد پہلے آپ یہ بتائیں کہ وہاب چنگیزی کا نام آپ کو کیسے معلوم ہوا اور اگر فرخندہ نے یہ نام لیا تھا تو اور کیا کہا تھا؟"

عابد نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر گود میں رکھ لیا۔ لفافے پر ڈاک کے ٹکٹ اور مہر لگی ہوئی تھی۔ اس پر جو ایڈریس تھا وہ اس اخبار کا تھا جہاں فرخندہ کام کرتی تھی۔ عابد نے کہا "مس ثناء میں جس وقت ہسپتال پہنچا' فرخندہ شدید زخمی حالت میں تھی' ریوالور کی ایک گولی اس کی گردن اور دوسری سینے میں لگی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ اٹک اٹک کر کہنے لگی' عابد' مجھ پر حملہ کرنے والے وہاب چنگیزی کے آدمی ہیں۔ کاش میں پولیس کے روبرو یہ بیان دے سکتی۔ یہ فقرہ کہہ کر اس پر غشی طاری ہوگئی۔ موقع پر موجود ڈاکٹر نے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ کچھ دیر بعد فرخندہ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ کہنے لگی' عابد' وہ لوگ ثناء کو بھی مار ڈالیں گے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تم وعدہ کرو کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو ثناء کی حفاظت کرو گے۔ اسے پوری سلامتی کے ساتھ وہاں پہنچاؤ گے جہاں وہ جانا چاہے گی۔ میں نے فرخندہ کا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا۔ وہ بولی۔

"عابد' چنگیزی قاتل ہیں۔ وہ اپنے گھناؤنے جرم کے سارے ثبوت میرے کمرے

سے لے گئے ہیں لیکن کچھ میٹر میرے ساتھی رپورٹر اشفاق شاہد کے پاس بھی ہے۔ اگر اشفاق بچ گیا ہے تو وہ اس سارے واقعے سے ایڈیٹر کو ضرور آگاہ کرے گا۔ لیکن تم خود ایڈیٹر یا اشفاق سے ملنے کی کوشش نہ کرنا.........." ابھی فرخندہ نے یہی کچھ کہا تھا کہ اسے ہنگامی حالت میں آپریشن تھیٹر روانہ کر دیا گیا۔ جہاں سے تھوڑی دیر بعد اس کی موت کی.........."

ایک گہری آہ بھرنے کے بعد عابد نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

"اطلاع آگئی.......... فرخندہ کی ہدایت کے مطابق میں نے رپورٹر اشفاق یا ایڈیٹر سلطان ربانی صاحب سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اشفاق اپنے گھر سے غائب ہے۔ اخباروں میں فرخندہ کے قتل کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس سے پتہ چلا کہ قتل کی رات وہ دیر تک اپنے دفتر میں ایک فیچر تیار کرتی رہی۔ قریباً دس بجے وہ اکیلی اپنے کاغذات پر جھکی ہوئی تھی۔ کمرے میں صرف ایک چپڑاسی لڑکا تھا۔ وہ قریبی میز پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ فرخندہ نے اسے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ وہ پانی لینے باتھ روم میں چلا گیا اس دوران تین آدمی جن میں سے دو نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپائے ہوئے تھے اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ اندر گھستے ہی انہوں نے دروازے کو کنڈی لگا دی۔

ایک شخص نے فرخندہ کو دبوچ لیا اور دوسرے نے ریوالور کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ چپڑاسی لڑکا سہم کر اندر ہی دبک گیا۔ اس کا بیان ہے کہ حملہ آور فرخندہ سے کسی ڈائری کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ جب مجبور ہو کر اس نے ڈائری دے دی تو انہوں نے اس کے سر پر ریوالور کے بٹ مارے اور پوچھنے لگے کہ اس کے بارے میں کس کس کو معلوم ہے۔ فرخندہ نے کسی کا نام نہیں لیا۔ انہوں نے بہت دھمکیاں دیں لیکن وہ خاموش رہی۔ اس دوران ایڈیٹر ربانی صاحب بند کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اس مداخلت پر حملہ آور بیچ پا ہوگئے۔ انہوں نے فرخندہ کو گالیاں دیں پھر اوپر تلے دو فائر کئے اور کھڑکی سے کود کر نکل گئے۔ چپڑاسی لڑکے نے باتھ روم سے نکل کر دیکھا تو فرخندہ لہولہان پڑی تھی۔"

یہ ساری روداد سنانے کے بعد عابد نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور آنسو پینے کی

کوشش کرنے لگا۔ مجھے حالات سے آگاہ کرتے کرتے اس کے تازہ زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اس کی گود میں پڑے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا یہ کیا ہے۔

اس نے کہا "یہ لفافہ ایڈیٹر سلطان ربانی صاحب کل میرے پاس لے کر آئے تھے یہ انہیں رپورٹر اشفاق شاہد نے کوہاٹ شہر سے بھیجا ہے۔ دراصل وہ فرخندہ پر حملے کی اطلاع پاتے ہی روپوش ہوگیا تھا۔ اب اس لفافے کے ذریعے اس نے ان حالات سے پردہ اٹھایا ہے جو فرخندہ کی موت کا سبب بنے۔ اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہے اس لئے وہ فی الحال سامنے آنا نہیں چاہتا۔"

عابد بولا "آپ خود پڑھ کر دیکھ لیں" اس نے لفافہ میری طرف بڑھا دیا میں نے کاغذ باہر نکالے۔ یہ درمیانے سائز کے دو صفحے تھے۔ میں پڑھنے لگی۔

"سلطان ربانی صاحب! مس فرخندہ کا خیال تھا کہ ہم مکمل تحقیق کے بعد آپ کو رپورٹ دیں گے مگر اب مس فرخندہ کی ناگہانی موت سے یہ سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا ہے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اب تک کے حالات آپ کے نوٹس میں دے دیئے جائیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں پچھلے تین ماہ سے ہم قصبہ "بڑی حویلی" کے چنگیزیوں کے بارے چھان بین کر رہے تھے۔ قریباً دو ہفتے پہلے ہمیں بڑی حویلی کے نواح سے ایک ایسا شخص ملا جو حلئے سے نیم دیوانہ لگتا تھا۔ مگر بہت عقل کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے ہمیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ چنگیزیوں نے کچھ عرصے پہلے تین آدمیوں پر بھوکا شیر چھوڑ دیا تھا۔ اس شیر نے ان میں سے دو کو موقعے پر ہلاک کر دیا اور تیسرا شدید زخمی ہو کر دم توڑ گیا۔ غلام حیدر نامی اس دیہاتی کی بات نے ہمیں ششدر کر دیا۔ ہم نے اس کو کریدا تو پتہ چلا کہ بڑی حویلی سے کچھ فاصلے پر مالٹوں کینوؤں کا بہت بڑا باغ ہے اس باغ کے بیچوں بیچ ایک جدید طرز کی کوٹھی ہے۔ اس کوٹھی میں چنگیزی دنیا کا ہر برا کام کرتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ رات دس بجے کے بعد کوٹھی کے بیرونی حصے میں ایک شیر کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ شیر رات بھر رکھوالی کرتا ہے اور اگر کوئی قسمت کا مارا غلط ارادے سے کوٹھی میں گھستا ہے تو اسے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تین اجنبی جن میں سے دو انگریز تھے چوری چھپے کوٹھی میں گھسے۔ شیر نے پہریداروں کے پہنچتے پہنچتے انہیں چیر پھاڑ ڈالا۔ بعدازاں ان کی لاشوں کو نہر کے کنارے سرکنڈوں میں دبا دیا گیا...... ہم نے غلام حیدر

کو نہر کے کنارے ان سرکنڈوں تک جانے پر آمادہ کرلیا۔ وہ ہمیں سرکنڈوں میں لے گیا اور اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں لاشوں کو دبایا گیا تھا۔ ایک چاندنی رات کو ہم نے اس جگہ کی کھدائی کی اور ہمیں مقتولین کی ہڈیاں ملیں۔ انہیں خون آلود لباسوں سمیت دفنایا گیا تھا۔ اس گڑھے سے ہمیں کچھ ذاتی استعمال کی اشیاء بھی ملیں۔ ان میں ایک عینک ایک جیبی چاقو اور چند کاغذ تھے جن پر کچھ حساب کتاب درج تھا۔ اس نیم پاگل دیہاتی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہ تینوں افراد اپنی بہن کو چھڑانے کیلئے آئے تھے۔ ان کی بہن جو پینٹ بشرٹ پہنتی ہے اور جس کے بال کٹے ہوئے ہیں چودھری کے قبضے میں ہے۔ ہمیں غلام حیدر کی اس بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ "پینٹ قمیض" والی کو تینوں مقتولین کی بہن بتا رہا تھا جبکہ ان میں سے دو یورپی باشندے تھے اور ایک مقامی شخص تھا۔ بہرحال بعد میں اندازہ ہوا کہ غلام حیدر کی بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ یعنی قتل ہونے والے تینوں افراد کسی لڑکی کی رہائی کیلئے ہی اس علاقے میں آئے تھے۔ شیر والی بات پر بھی ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ بات بھی درست نکلی۔ قریبی دیہات سے ہم نے جو سن گن لی اس سے پتہ چلا کہ نئے چودھری وہاب چنگیزی کے پاس ایک جیتا جاگتا دھاری دار شیر ہے۔ اس شیر کیلئے روزانہ دو بکرے ذبح کئے جاتے ہیں۔ سنا گیا کہ اس شیر کی مناسبت سے وہاب چنگیزی انتخاب میں بھی شیر کا نشان حاصل کرنا چاہتا تھا مگر شومئی قسمت ایسا نہ ہوسکا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ جسے شیر کہا جا رہا ہے وہ جسیم نسل کا چیتا ہے۔

میں نے رپورٹر اشفاق شاہد کا پورا خط پڑھا۔ اس میں نہایت یقین کے ساتھ چنگیزیوں پر سنگین الزامات لگائے گئے تھے اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگر فوری طور پر کارروائی کی جائے تو اب بھی وہاب چنگیزی کے خلاف ٹھوس ثبوت مل سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس خط میں لکھی گئی بہت سی باتیں درست تھیں۔ مالٹوں اور کینوؤں کے جس باغ کا ذکر کیا گیا تھا اسے میں کیسے بھول سکتی تھی۔ دنیا کی اس منحوس ترین چاردیواری کو کیسے بھول سکتی تھی جس میں دس روز تک میرے معصوم فرحان کی چیخیں گونجی تھیں اور آخر وہ تھک ہار کر ہمیشہ کیلئے چپ ہوگیا تھا۔ وہ در و دیوار اور حدود اربعہ تو میرے ذہن پر تا ابد کیلئے نقش ہوگیا تھا۔ اس خط میں لکھا گیا تھا کہ اب اس چار دیواری میں کوئی اور بدنصیب قیدی موجود ہے اور موت و حیات کی کشمکش سے گزر رہا ہے۔ وہ قیدی لڑکی کون تھی اور

اسے چھڑانے کیلئے آنے والے کون تھے؟

عابد غور سے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "مس ثناء اب بتائیں آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا "عابد صاحب! میں چاہوں گی کہ آپ مجھے کسی طرح خان رحیمی تک پہنچا دیں۔"

"کون خان رحیمی؟" عابد نے پوچھا

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عابد کو خان رحیمی کے بارے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا "عابد صاحب! خان رحیمی میرے ایک بہی خواہ ہیں۔ آپ مجھے کسی طرح جھنگ پہنچا دیں۔ اس سے آگے میں خود چلی جاؤں گی۔"

عابد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مس ثناء اب یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں میرا بھی ہے۔ فرخندہ کے بعد مجھے اپنا زندہ رہنا بھی بیکار محسوس ہو رہا ہے......... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ جو جنگ لڑ رہی ہیں اس میں مجھے بھی شریک کر لیں!"

میں نے کہا "مسٹر عابد! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں اور آپ کے دکھ میں بھی برابر کی شریک ہوں لیکن یہ کوئی ایسی جنگ نہیں جس میں آپ کی کمک کی ضرورت ہو۔ آپ بے فکر رہیں اور مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ فرخندہ کے قاتل بہت جلد کیفر کردار تک پہنچیں گے۔"

عابد ایک سمجھدار آدمی تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ ایک لمبا چکر ہے اور میں جہاں تک دیکھ رہی ہوں' وہ نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا اس نے فضول سوالوں سے مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے لگا۔

"تو اب آپ جھنگ جانا چاہیں گی؟"

"میں نے کہا "جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ویسے میں بس یا ریل کے ذریعے بھی جا سکتی ہوں۔"

اس نے کہا "نہیں......... میں آپ کو خود چھوڑ کر آؤں گا......... کیا خیال ہے ابھی چلیں؟"

"مناسب تو یہی ہے" میں نے جواب دیا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر کولڈ ڈرنک کی

بوتلیں واپس کیں۔ بل چکایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ لاہور چھوڑنے سے پہلے ایک بار فرخندہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ لوں۔ کیا پتہ پھر اس نگری میں قدم رکھنا ہو یا نہیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار عابد سے کیا تو اس نے کہا کہ یہ کسی طور مناسب نہیں۔ قبرستان میں پولیس اور چنگیزیوں میں کسی سے بھی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ چنگیزیوں نے یہاں جال سا بچھایا ہوا ہے۔

عابد یہاں کے حالات مجھ سے بہتر سمجھتا تھا لہٰذا میں اس کے جواب پر خاموش ہو گئی......... تاہم عابد کی یہ احتیاط بے فائدہ رہی۔ ہم راوی کا پل پار کر کے شیخوپورہ روڈ پر تین چار میل آگے گئے تھے جب مجھے عابد کے چہرے پر گہری تشویش نظر آئی وہ عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے صورت حال دریافت کی۔ وہ بولا

"مس ثناء۔ ایک پجارو گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔"

میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ جب ہم ریسٹورنٹ سے چلے تھے ایک نیلی پجارو گاڑی ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت بھی شبہ ہوا تھا۔ اب عابد کی بات نے اس شبے کی تصدیق کر دی۔ میرے پوچھنے پر عابد نے بتایا کہ گاڑی بڑی تیزی سے قریب پہنچ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی عابد نے اپنی گاڑی کی رفتار بھی بڑھا دی۔ وہ بولا "مس ثناء مجھے ان لوگوں کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔ کیا خیال ہے واپس لاہور نہ چلیں؟"

میں نے کہا "عابد صاحب اگر یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ ہی گئے ہیں تو پھر لاہور یا لاہور سے باہر ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

اس وقت ذہن میں ایک ہی نام گونجا "پولیس سٹیشن" مگر مجھے پولیس سٹیشن میں بھی پناہ کہاں مل سکتی تھی۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا' ثناء! تمہیں تو مرنا ہی ہے۔ اپنے ساتھ اس نوجوان کی جان نہ گنواؤ۔ اس کی گاڑی سے اتر جاؤ اور اسے جانے دو......... زندگی کی طرف سلامتی کی طرف۔ اسے موت کے گھیرے سے آزاد کر دو۔ میں نے عابد سے کہا "عابد صاحب مجھے بائیں جانب آنے والے اگلے پٹرول پمپ کے سامنے اتار دیں اور خود سیدھے شیخوپورہ چلے جائیں۔ پٹرول پمپ کا مالک مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس کے پاس پناہ لے چکی ہوں۔ اس کے ہوتے ہوئے وہاب

چنگیزی کے کارندے میرے قریب نہیں پھٹکیں گے۔"

"کون سا پٹرول پمپ......؟" عابد نے پوچھا "اگلا پٹرول پمپ تو دھوکا منڈی والے موڑ کے پاس ہے۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"کیا نام ہے اس کے مالک کا؟"

"شیخ ایاز" میں نے جو منہ میں آیا بول دیا۔

عابد بولا "مجھے افسوس ہے کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ اتفاق میں پٹرول پمپ کے مالک کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام شیخ ایاز نہیں اور وہ بہت بھلامانس آدمی ہے۔ اس مسکین کو تو خود ہر وقت پناہ کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ کو کیا پناہ دے گا۔"

عابد کا لہجہ پر اعتماد تھا۔ میں کٹ کر رہ گئی۔ دونوں گاڑیوں کی رفتار اب خاصی تیز ہو چکی تھی۔ میں نے عابد سے صاف لفظوں میں کہا کہ میں اس کی جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتی وہ براہ مہربانی مجھے یہیں پر اتار دے۔ عابد نے فیصلہ کن لہجے میں انکار کر دیا۔

میں نے کہا "دیکھیں عابد صاحب! آپ اس معاملے کو بالکل نہیں سمجھتے۔ آپ میری جتنی مدد کر چکے ہیں میں اس کیلئے بے حد مشکور ہوں۔ مگر آپ اب بھی میرے ساتھ رہیں گے تو اس میں میرا بہت نقصان ہوگا۔ اور ممکن ہے آپ کا بھی ہو۔"

عابد نے کہا "مس ثناء! آپ مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش نہ کریں۔ میں چھٹی جماعت کا طالب علم نہیں۔ ایک بڑے ہوٹل کا مالک ہوں۔ ٹھیک ہے میں ان حالات کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن کچھ ایسا انجان بھی نہیں ہوں۔ میں آپ کو ان لوگوں کے چنگل میں نہیں دوں گا' چاہے مجھے اس کیلئے اپنی جان بھی گنوانی پڑے۔"

وہ بڑی مشاقی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں قریباً سو کلومیٹر کی رفتار سے شیخوپورہ شہر کے اندر سے گزریں۔ اس وقت تک رات کے دس بج چکے تھے۔ شہر کے بازار سنسان نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں بس اسٹاپس کے قریب دکانیں کھلی تھیں۔ پجارو گاڑی بدستور ہمارے نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمارے ذہن تیزی سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ لوگ عابد کے گھر سے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ ایک طرح عابد نے گاڑی لینے کیلئے گھر جا کر ہی غلطی کی تھی۔ جو

میں نے فرخندہ سے مل کر کی تھی۔ فرخندہ اور عابد کا گھر دونوں چنگیزیوں کی نگاہ میں تھے...... اس وقت ہم شیخوپورہ سے دس بارہ میل آگے نکل چکے تھے جب پجارو سے ہم پر پہلا فائر ہوا۔ پٹاخے کی آواز آئی اور ٹھک سے کوئی شے کار کی ڈگی میں پیوست ہو گئی۔ اب پجارو کے بارے میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ عابد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ دوسرا فائر کوئی نصف فرلانگ کی دوری پر ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ سیون ایم ایم رائفل کی گولیاں تھیں۔ دوسری گولی گاڑی کے پچھلے ٹائر کو بے کار کر گئی۔ گاڑی عابد کے ہاتھوں میں بری طرح لہرائی اور سڑک سے اتر کر کنارے کے کھیتوں میں گھستی چلی گئی۔ جونہی گاڑی رکی۔ عابد نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا۔ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر ہم باہر نکلے اور بغیر کسی مشورے یا منصوبے کے سامنے والے کھیتوں کی طرف بھاگے۔ یہ جوی کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے ساتھ ہی وسیع جوہڑ تھا اور اس کے کنارے کنارے جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ یہ جھاڑیاں اور سرکنڈے ہماری پناہ گاہ ثابت ہو سکتے تھے۔ ہم بھاگتے ہوئے کھیت میں پہنچے اور وہاں سے سرکنڈوں میں داخل ہو گئے۔ ساری زمین گیلی تھی ہمارے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ سرکنڈوں کی بے رحم چھال جسموں پر چرکے لگا رہی تھی۔ کہیں قریب سے کوئی جانور بدک کر بھاگ گیا۔ میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ معلوم نہیں وہ کیا جانور تھا۔ کتا تو ہرگز نہیں تھا۔ جوہڑ کے کنارے کی طرف آ کر ہم دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد حسب توقع سرکنڈوں کے قریب مدہم آوازیں سنائی دینے لگی۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اگر وہاب کے آدمی ہماری تلاش میں سرکنڈوں کے اندر گھستے تو ہم جوہڑ کے کنارے کنارے چلتے دوسرے کھیتوں کی طرف نکل سکتے تھے۔ مگر ان لوگوں نے توقع سے زیادہ ہوشیاری دکھائی۔ انہوں نے ہمارے نکلنے کا راستہ پہلے مسدود کیا اور بعدازاں سرکنڈوں میں ہماری تلاش شروع کی۔ ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تعداد میں دس پندرہ سے کم نہیں۔ اس سے ظاہر تھا کہ اکیلی پجارو جیپ ہی ہمارے پیچھے نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک گاڑی تھی۔ وہ سب بار بار ہمیں للکار رہے تھے اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

یہ جگہ بڑی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ خود کار رائفلوں

سے سرکنڈوں میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتے۔ مجھے یاد تھا ایک دفعہ میرے شوہر واصف نے اپنے آدمیوں سے ایسے ہی فائرنگ کروائی تھی اور ایک چور کو سرکنڈوں کے اندر چھلنی کر دیا تھا۔ وہ منظر میرے تصور میں تازہ ہو رہا تھا اور دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی ہم پر گولیوں کا مینہ برسنے لگے گا۔ چنگیزیوں کے کارندے ہمیں جو دھمکیاں دے رہے تھے وہ بھی اس طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

میں نے واصف کے ذاتی محافظ رب نواز کی آواز پہچان لی۔ واصف کی موت کے وقت یہ شخص بھی سلیم کی گولی سے زخمی ہوا تھا اور کئی ماہ ہسپتال میں گزار کر آیا تھا۔ اب وہ شعلہ جوالا بنا ہوا چیخ رہا تھا۔ میں وہ الفاظ یہاں لکھنا نہیں چاہتی جن سے وہ مجھے یاد کر رہا تھا۔ اس کی آواز غصے سے پھٹی ہوئی تھی اور وہ مجھے اطلاع دے رہا تھا کہ میرا کھیل اب ختم ہو چکا ہے۔ میں ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤں اور خود کو ان کے حوالے کر دوں۔ اس دوران میں نے ایک اور کارندے کی آواز سنی۔ وہ ہمیں سنانے کیلئے رب نواز کو بلند آواز میں مشورہ دے رہا تھا کہ کیوں نہ ڈیزل پھینک کر سرکنڈوں کو آگ لگا دی جائے...... ہم یہ سب کچھ سن رہے تھے اور دھڑکنوں کو سنبھالے اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اور گاڑی کچے میں اچھلتی ہوئی سرکنڈوں کی طرف آ رہی ہے۔ گاڑی کی ہیڈلائٹس کبھی کبھی گھنے جھاڑ جھنکاڑ کے اندر بھی چمک جاتیں تھیں۔ میرے دل سے دعا نکلی کاش کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ لوگ یہاں سے ٹل جائیں۔ گاڑی کا انجن سرکنڈوں کے پاس پہنچ کر خاموش ہو گیا۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ منحوس صدا میرے کانوں میں گونجی جو سماعت سے گزر کر جسم کے ہر ریشے کو عذاب آشنا کر دیتی تھی۔ یہ اس شیطان کی آواز تھی جسے انسان کہنا انسانیت کی سب سے بڑی توہین تھی۔ یہ وہاب چنگیزی کی آواز تھی۔ اس نے غرا کر رب نواز سے کہا "ڈرتے کیوں ہو۔ یہ مفرور قاتلہ ہے اگر باہر نہیں نکلتی تو اندر ہی بھون دو حرام زادی کو۔"

رب نواز نے ایک بار پھر سنگین لہجے میں ہمیں باہر آنے کی ہدایت کی۔ اس کی آواز مجھے یہ سمجھانے کے لئے کافی تھی کہ یہ اس کی آخری وارننگ ہے۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اگلے چند لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تو کیا میں پھر خود کو اس بے رحم شخص کے

حوالے کر دوں جو اس سے پہلے میرے بچے کا خون پی چکا تھا اور میرے جسم سے میری بے بسی کا خراج وصول کرتا رہا تھا۔ جس نے مجھے اور میرے بچے کو ایک ہی چار دیواری میں ذبح کر ڈالا تھا اور سفاکی کا اعلیٰ ترین تمغہ سینے پر سجا کر مخمور قہقہے لگائے تھے۔ میں اس شخص کے سامنے جانا چاہتی تھی لیکن ہاتھ اٹھا کر نہیں ہاتھ بڑھا کر۔ اپنے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے اس کی آنکھوں کو نوچ لینا چاہتی تھی وہ فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے چھین لینا چاہتی تھی جو میرے لئے کائنات کی سب سے قابل نفرت چیز تھی۔ اور یہ مسکراہٹ چھین کر اس کی مغرور گردن کو یوں دبانا چاہتی تھی کہ اس کی آخری ہچکی سننے والوں کے کلیجے شق ہو جائیں۔ مگر کیا میں اس وقت یہ سب کچھ کر سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ وہاب تک پہنچنے سے پہلے درجنوں گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتیں۔ پھر ایک عورت تو ان سرکنڈوں میں گر کر مر جاتی لیکن ایک بے قرار ماں کی روح ہمیشہ کے لئے سرگرداں ہو جاتی۔ ان بے حد مضطرب لمحوں میں میں نے عابد کو چھو کر دیکھا۔ جیسے چھو کر جاننا چاہتی ہوں کہ اب اس کا کیا خیال ہے۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا اور ارادے مضبوط نظر آتے تھے۔ وہ میری حفاظت کیلئے ہر انتہا تک جانے کو تیار تھا۔ "عابد صاحب! آپ نے اچھا نہیں کیا" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ یہی وہ وقت تھا جب تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ سرکنڈوں کے اندر سرخ لکیریں سی چمکتی نظر آئیں............ خدا کی پناہ' کتنا خوفناک منظر تھا۔ عابد نے ایک بازو میری گردن میں ڈالا اور اوندھے منہ گیلی زمین پر گرا۔ قریباً پندرہ سیکنڈ تک ہم اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑے رہے۔ آخر فائرنگ رک گئی ٹھک ٹھک کی آوازوں سے میگزین اترنے اور چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ سرکنڈوں میں سرسراہٹ گونجنے لگی۔ میں نے عابد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے ہیں' اب ہمارے لئے جوہڑ کی طرف نکلنے کا موقع پیدا ہو جائے گا........ عابد خاموش تھا۔ اس کا مضبوط بازو کسی وزنی چیز کی طرح میری گردن پر رکھا ہوا تھا۔ اس نامانوس بوجھ نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ "عابد صاحب" میں نے اسے جھنجوڑ کر سرگوشی کی اور اس وقت میرا وہ ہاتھ خون میں لتھڑ گیا جس سے میں نے عابد کو جھنجوڑا تھا۔ ہاں یہ خون ہی تھا۔ کیونکہ کیچڑ اتنا گرم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں سے کسی ماں کے دودھ کی خوشبو آتی ہے۔ میں نے بے قراری سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ میری انگلیوں نے اس کے سر کو

چھوا اور مجھے پتہ چلا کہ ایک گولی اس کے کاسہ سر کو توڑتی ہوئی نکل گئی ہے۔ وہ عاشق صادق اپنی محبوبہ کا تعاقب کرتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا........ ہاں وہ مر چکا تھا۔

یہ نوجوان ایسے ہی چلبلے اور سیلانی ہوتے ہیں۔ جب کسی سے آنکھ لڑ جاتی ہے تو ہر جگہ اس کے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔ کالج ہو' بازار ہو' محفل ہو' کہیں ایک دوجے کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ "عابد...... عابد' یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے بلک کر کہا اور اپنا منہ کیچڑ میں رگڑنے لگی۔ ایک لمحے کے لئے جی میں آئی کہ عابد کے پستول سے خود کو بھی گولی مار لوں۔ اب سوچتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ جان دینا اس وقت میرے لئے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھوں کو کھولنا اور بند کرنا اور شاید میں یہ بھی کر گزرتی۔ مگر پھر فرحان کی صورت نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہ مجھے اس فعل سے منع کر رہا تھا۔ میں نے اپنا نچلا ہونٹ اتنی زور سے دانتوں میں دبایا کہ خون کا ذائقہ منہ میں گھل گیا اور دانت اندر تک گوشت میں اتر گئے۔ کچھ دیر میں اسی طرح بے حرکت پڑی' اردگرد کی آوازوں کو سنتی رہی۔ پھر ایک عجیب جذبے کے تحت میں نے لرزتے ہاتھوں سے عابدہ کا سر تھام کر اس کی پیشانی کو خون آلود ہونٹوں کا طویل بوسہ دیا تھا۔ معلوم نہیں یہ بوسہ میں نے ایک بھائی کو دیا تھا۔ ایک غم خوار ساتھی کو دیا یا پھر فرخندہ کو دیا تھا۔ فرخندہ جو اس آخری بوسے کے بغیر ہی مجھ سے اپنی صورت چھپا گئی تھی۔ میرے کندھوں کو اپنے احسانوں کے بوجھ سے توڑ کر سکون سے لحد میں جا سوئی تھی۔ "خدا حافظ فرخندہ....... خدا حافظ عابد" میرے دل نے پکار کر کہا "خدا حافظ........ میرے غم خوارو" میں نے پستول عابد کے ہاتھ سے لیا اور ایک کہنی اور ایک پہلو کے بل جوہڑ کے ساتھ ساتھ چارے کے کھیتوں کی طرف رینگنے لگی۔ چارے کے دو کھیتوں سے آگے گنے کی اونچی فصل لہرا رہی تھی۔

وہ کافی رقبے میں تھی اور اس کی اونچائی نو دس فٹ سے کم نہیں تھی۔ میں وہاں تک پہنچ جاتی تو بچ نکلنے کی امید پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا اندھا دھند فائرنگ کی آواز نے اردگرد کے لوگوں کو متوجہ کر لیا ہو گا۔ سڑک کی طرف سے کوئی نہ بھی آیا ہو تو اردگرد کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان ضرور موقع پر پہنچ گئے ہوں گے اور ان لوگوں کی موجودگی میں وہاب اور اس کے ساتھی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہریں گے۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ وہ ایک قتل بھی کر چکے تھے۔ میری اوڑھنی کہیں گر چکی تھی۔ چپل بھی

بھاگتے ہوئے نکل گئی تھی۔ میرا منہ اور بال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اور میں سرکنڈوں کی آڑ میں چارے کی کھیتوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اردگرد کی آوازوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ رب نواز اور وہاب کے دوسرے کارندے سرکنڈوں میں گھس آئے ہیں اور ہم دونوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ یکایک ایک آواز مجھے اپنے بالکل قریب دائیں جانب سے آئی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہی راستہ تھا جو مجھے ان سرکنڈوں سے نکال سکتا تھا۔ اب یہ بھی مسدود ہو گیا تھا۔ میں تین اطراف سے گھر چکی تھی چوتھی سمت ٹھٹھرا ہوا جوہڑ تھا۔ شاید عام حالات میں میں اس اجنبی اور ٹھٹھرتے ہوئے پانی میں اترنے کا تصور بھی نہ کر سکتی۔ مگر اس وقت یہ پانی مجھے بالکل بے ضرر محسوس ہوا۔ قدموں کی چاپ قریب پہنچی تو میں بے آہستگی جوہڑ میں اتر گئی۔ جسم کی خراشیں اور چوٹیں یخ بستہ پانی کے لمس سے جل اٹھیں۔ یوں لگا میرا تین چوتھائی دھڑ برف کی سل تلے آ گیا ہے۔ اچانک مجھ پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ جوہڑ کی گہرائی میری توقع سے زیادہ تھی۔ میرے پاؤں زمین چھونے میں ناکام رہے تھے۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ ان خوفناک ترین لمحوں میں میرے ذہن کی سکرین پر ماضی کا ایک منظر چمک کر رہ گیا۔ بہت پرانا منظر تھا میں چھوٹی سی تھی شاید تین چار سال کی۔ میرے ابو مجھے اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھائے نہر کے ساتھ ساتھ اچھرے والے پل کی طرف جا رہے تھے۔ سخت گرمی تھی۔ نہر میں نہانے والوں کا ہجوم تھا۔ ابو نے ایک جگہ سائے میں سائیکل کھڑی کی۔ پھر میرے کپڑے اتارے اور نہ جانے دل میں کیا آئی کہ مجھے کلائیوں سے تھام کر پانی میں ڈال دیا۔ مجھے اس ٹھنڈے پانی کا لمس آج تک یاد تھا۔ میں پانی میں ڈبکی کھا گئی۔ پھر ابو نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ میں کیکڑے کی طرح ان سے چمٹ گئی۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگے........ آج اتنے برسوں بعد میں ایک بار پھر ڈوب رہی تھی لیکن کوئی ہاتھ مجھے کھینچ کر باہر نکالنے والا نہیں تھا۔ میں نیچے ہی نیچے جانے لگی یہاں تک کہ پانی میرے زخمی ہونٹ کو چھونے لگا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ دائیں بائیں لہرایا اور کنارے سے کسی جھاڑی کے اندر کو جھکی ہوئی جڑیں میرے ہاتھ میں آ گئیں۔ ابو کے ہاتھ کی طرح میں نے پوری جان کے ساتھ ان جڑوں کو تھام لیا۔

سرکنڈوں میں سرسراتا ہوا جسم اب عین اس جگہ پر تھا جہاں چند لمحے پہلے میں تھی اس کا ہیولا میں صاف دیکھ سکتی تھی وہ ایک دیہاتی شخص تھا اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ

اور دوسرے میں بندوق تھی وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا میں نے صرف اپنی ناک پانی سے باہر رہنے دی اور بالکل بے حس و حرکت ہو گئی۔

یہ بڑے جاں گسل لمحے تھے۔ بندوق بردار کے قدموں کی حرکت کے ساتھ کائنات کی گردش بھی تھم گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن پانی میں لہریں پیدا کر رہی ہے اور یہ لہریں میرے دشمن کو میری طرف متوجہ کرلیں گی۔ وہ شخص مجھ سے اتنا قریب تھا کہ میں اس کی سانسوں کی آواز بھی سن سکتی تھی۔ کہیں دور سے وہاب کی مدھم آواز سنائی دی جواب میں بندوق برادر نے زور سے کہا۔

"نہیں چودھری جی۔"

میں نے آواز پہچان لی۔ میرے سر پر میرا جانی دشمن رب نواز کھڑا تھا۔ آج اس کے لئے پورا موقع تھا کہ اپنے ایک ایک زخم کا حساب چکا سکے۔ وہ ذرا سا گھوما تو میں نے اپنی سانس تک روک لی۔ اس کی ٹارچ کی "روشن لکیر" موت کی سرسراتی انگلی کی طرح میرے سر پر سے گزری اور پھر میرے چہرے پر رک گئی۔ میری آنکھوں میں اجل کا سورج چمک گیا۔ رب نواز مجھے دیکھ چکا تھا۔ ٹارچ کی مہلک کرنیں میرے چہرے کو منور کر رہی تھیں۔ رب نواز نے رائفل سیدھی کی اور دو قدم چل کر میری طرف آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی رائفل کا رخ بدل گیا اور ٹارچ کا بھی۔ کہیں دور پھر وہاب کی مدھم آواز آئی۔ جواب میں رب نواز نے کہا۔

"نہیں چودھری جی کچھ پتہ نہیں چلا۔ میرا خیال ہے اس طرف نہیں آئے۔" میرا سر چکرانے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیا کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ رب نواز نے مجھے دیکھا نہ ہو۔ اتنے میں میری دائیں جانب سرکنڈے زور زور سے سرسرائے۔ پھر دو سائے نظر آئے۔ یقیناً یہ بھی وہاب کے کارندے تھے۔ رب نواز نے انہیں ایک گندی گالی دی اور بولا "........ ادھر کیا لینے آئے ہو۔ ادھر دیکھو اس "ماں" کو چارے کے ساتھ ساتھ" وہ دونوں الٹے قدموں واپس چلے گئے۔ پھر رب نواز بھی ٹارچ دائیں بائیں لہراتا آگے نکل گیا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ موت جیسے مجھے چھو کر گزر گئی تھی۔ لیکن وہ ٹلی نہیں تھی۔ اردگرد ہی منڈلا رہی تھی۔ قدموں کی صدا۔ فصل کی سرسراہٹ، گفتگو کی آوازیں سب کچھ میرے آس پاس موجود تھا۔ میرا دل گواہی

دے رہا تھا کہ رب نواز نے مجھے نظرانداز کیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھنے کے باوجود آنکھیں بند رکھیں ہیں۔ مجھے یاد تھا جب میری امی فوت ہو گئی تھیں اور واصف نے مجھے ان کی صورت دیکھنے سے روک دیا تھا تو رب نواز ہی کو میری نگرانی پر لگایا گیا تھا۔ اس روز میں نے رب نواز کی آنکھوں میں کرب کے آثار دیکھے تھے۔ وہ سارا دن مجھ سے نگاہیں چراتا رہا تھا اور اس کے بعد بھی میں جب تک حویلی میں رہی تھی رب نواز کا رویہ میرے ساتھ نرم ہی رہا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اسے مجھ سے ہمدردی تھی لیکن وہ حویلی کے ان ملازمین میں سے تھا جو میری بے بسی کو ترس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

قریباً دس منٹ بعد سرکنڈوں کے اندر کچھ فاصلے پر ملی جلی آوازیں سنائی دیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ عابد کی لاش تلاش کرلی گئی ہے۔ اس واقعے کے تھوڑی ہی دیر بعد گاڑیاں سٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں اور میرے اردگرد پھیلی ہوئی تمام آوازیں سمٹ کر ختم ہو گئیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں موت کی زد سے نکل آئی تھی۔ موت کی پرچھائیاں بدستور مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ بلکہ اب یہ پرچھائیاں تاریک تر ہو گئی تھیں۔ پچھلے دس منٹ میں، میں نے کئی بار پانی سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔ کنارہ ڈھلوان نہیں عمودی تھا بلکہ کچھ اندر کی طرف گیا ہوا تھا۔ درخت کی جڑوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کب کی ڈوب گئی ہوتی۔ گردن تک میرا دھڑ بالکل سن ہو چکا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ دیر یہ کیفیت برقرار رہی تو شاید دل بھی ٹھٹھر کر برف کا ٹکڑا بن جائے۔ میں جتنی بار باہر نکلنے کی کوشش کرتی کنارے سے کچھ مٹی ٹوٹ کر پانی میں گر جاتی۔ پھر مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں یہ جڑیں بھی مٹی سے نہ نکل آئیں جنہوں نے مجھے تھام رکھا ہے۔ یہ جوہڑ کوئی ایسا ناقابل عبور نہیں تھا لیکن میرے لئے یقیناً موت کا گڑھا بن گیا تھا۔ فرانسیسی کی ایک کہاوت ہے کہ ڈوبنے والے کے لئے بالٹی بھی سمندر ہوتی ہے۔ میرے لئے بھی یہی جوہڑ بحر منجمد شمالی تھا۔ اس گڑھے میں، میں نے جس طرح پل پل موت کو اپنی طرف سرکتے دیکھا وہ ایک طویل روداد ہے۔ آخر میرے ذہن میں دھند سی چھانے لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں بے ہوش ہو رہی ہوں۔ اس گڑھے میں بے ہوشی کا مطلب موت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں اس وقت کو یاد کرنے لگی جب میں خان رحیمی کی کوٹھی سے نکل کر لاہور روانہ ہوئی تھی۔ شاید میں نے یہ سفر اختیار کرکے غلطی

کی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی بھائی اور اس کے گھرانے کے لئے پریشان ہونے کی۔ اب میرا کیا تعلق تھا بھائی سے' عشرت سے اور ان حالات سے جن سے عشرت گزر رہی تھی۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے تھا۔ صرف اپنے فرحان کے لئے سوچنا چاہیے تھا اور اسی کے لئے جینا چاہئے تھا۔ اب اگر اس کے قاتل اس زمین پر دندنانے کے لئے زندہ رہ گئے تو میری مامتا کے دامن میں کیا رہ جائے گا۔ میں نے اپنے ذہن کو جھنجھوڑا "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں.......... سن لو میں زندہ رہنا چاہتی ہوں" خوابیدہ ذہن پر موت کی مدہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ میری آواز سننے سے انکار کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ایک کمرے میں آتشدان دہک رہا ہے۔ میں اپنے مہکتے اور قلقاریاں مارتے ہوئے فرحان کو سینے سے لگائے ایک نرم بستر میں دھنستی جا رہی ہوں.......... دھنستی جا رہی ہوں اور ڈوبتی جا رہی ہوں۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک بوسیدہ چٹائی پر پایا۔ میرے جسم کے گرد ایک موٹی گرم چادر مضبوطی سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے بالکل پاس تین اینٹوں سے ایک چولہا سا بنا ہوا تھا اور اس میں آگ جل رہی تھی۔ غالباً آگ کے دھوئیں سے کھانستے ہوئے میں نے آنکھ کھولی تھی۔ یہ اینٹوں کا بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کا در دروازے کے بغیر تھا۔ کمرے میں آگ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے گیلے کپڑے کچھ دور ایک رسی سے جھول رہے تھے۔ اچانک مجھے سلیم کی کھانسی سنائی دی اور میں بھونچکی رہ گئی۔ وہ کمرے کے در میں سے جھک کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ خشک لکڑیاں تھیں۔ میرا چہرہ دیکھ کر وہ جلدی سے میرے پاس چلا آیا۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آگئی۔"

میں نے چادر کو اپنے گرد سمیٹتے ہوئے کہا "میں کہاں ہوں' یہ کون سی جگہ ہے.......... وہ پانی.......... اور.......... مجھے کس نے نکالا؟"

وہ بولا "میں نے نکالا ہے' اگر دو گھڑی اور نہ پہنچتا تو ڈوب گئی ہوتیں۔"

"مگر یہ جگہ کون سی ہے؟"

"سب کچھ بتاتا ہوں تمہیں ایک منٹ صبر کرو" اس نے کہا اور بجھتی ہوئی آگ کو بچانے کے لئے چولہے میں لکڑیاں رکھنے لگا۔ آگ جل گئی تو اس نے کونے سے ایک

بوسیدہ کپڑا اٹھایا اور چٹائی کے پاس سے پانی صاف کرنے لگا۔ کپڑے کو باہر پھینکنے کے بعد وہ میرے پاس آ بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر بولا۔

"تم نے لاہور جا کر اچھا نہیں کیا' کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا' اب کیا پڑا تھا تمہارے لئے اس گھر میں؟"

میں نے کہا "سلیم! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو.......... مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیسے پہنچی اور تم.......... کیسے پہنچے۔"

اس نے کہا "اخبار میں فرخندہ کی موت کی خبر پڑھی' یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اس کے ساتھ دیکھی گئی ہو اور پولیس کو تمہاری تلاش ہے۔ میں فوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ "ہوم لائیک" ہوٹل میں تمہارا سراغ ملا ہے لیکن تم پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو گئی ہو۔ "ہوم لائیک" ہوٹل فرخندہ کے منگیتر کا ہے میں سمجھ گیا کہ تم اس کے ساتھ گئی ہو' میں اپنی موٹر سائیکل پر فرخندہ کے منگیتر کا گھر تلاش کرتا پھر رہا تھا جب ایک سڑک پر میری نظر چنگیزیوں کی نیلی پجارو گاڑی پر پڑی۔ میں اس گاڑی کو لاہور میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور فوراً پیچھا شروع کر دیا۔ جلدی مجھے اندازہ ہو گیا کہ پجارو بھی ایک ہنڈا کار کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی لاہور سے نکلیں اور شیخوپورہ روڈ پر مڑ گئیں۔ میں نے تعاقب جاری رکھا مگر یہاں پہنچ کر میری موٹر سائیکل گاڑیوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے انجن نے گڑبڑ شروع کر دی۔ مجبوراً مجھے رفتار سست کرنا پڑی۔ بہرحال میں نے پیچھا جاری رکھا کیونکہ مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگلی گاڑی میں تم اور عابد ہو۔"

"شیخوپورہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی میری موٹر سائیکل بند ہو گئی۔ میں نے پلگ وغیرہ کھول کر صاف کیا اور پٹرول ڈلوا کر دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ دونوں گاڑیوں نے جھنگ کا رخ کیا ہے لہٰذا راستے میں کہیں بھی دوبارہ مڈبھیڑ ہو سکتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ شیخوپورہ سے نو دس میل آگے ایک جگہ سڑک کے کنارے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہنڈا سوک کھیتوں میں گھسی ہوئی تھی۔ اس کا اگلا پہیہ ایک کھائی میں تھا۔ قریب ہی پولیس بھی نظر آئی۔ تاہم میں ہمت کر کے وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں سے پتہ چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں زبردست فائرنگ بھی ہوئی ہے۔ سامنے سرکنڈوں میں ایک

جرائم پیشہ شخص مارا گیا ہے اور اس کی ساتھی عورت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئی ہے......... میں موٹر سائیکل لے کر آگے بڑھ گیا کچھ دور جا کر میں نے سڑک چھوڑی اور کھیتوں میں گھس گیا۔ ایک طویل چکر کاٹ کر میں سرکنڈوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹر سائیکل ایک جگہ گنے کے کھیت میں چھپائی اور ادھر ادھر گھومنے لگا۔ سرکنڈوں کے پاس سے اچانک مجھے چیخنے کی آواز آئی۔ میں بھاگتا ہوا جوہڑ کے کنارے پہنچا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ یہ تم ہو اور ڈوب رہی ہو۔ میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور تمہیں نکال لیا۔"

میں نے پوچھا "یہ جگہ کون سی ہے؟"

سلیم نے کہا "اینٹوں کا ایک بھٹہ ہے۔ اس جوہڑ سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے سوچا شاید یہاں کوئی مددگار مل جائے گا مگر بھٹہ بند پڑا تھا۔ میں تمہیں اس خالی کمرے میں لے آیا۔ تمہارے پیٹ میں پانی بھرا تھا' بڑی مشکل سے نکالا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی تم نے ایک الٹی کی ہے........" مجھے وہ پانی یاد آیا تھا جو تھوڑی دیر پہلے سلیم نے کپڑے سے صاف کیا تھا۔ پھر میری نگاہ ان کپڑوں پر پڑی جو رسی سے جھول رہے تھے۔ اچانک کسی نے میری پلکوں پر منوں بوجھ رکھ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ یہ سانس مجھے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلا رہے تھے' اور یہ احساس بھی دلا رہے تھے کہ زندگی کتنی ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ ایک شاعر کا گیت ہی نہیں نہ ہی صرف ایک مصور کی تصویر ہے اور نہ ہی فقط ایک پھول کی خوشبو' یہ زندگی ایک ٹھہرا ہوا جوہڑ بھی ہے' ایک تے بھی ہے اور ایک کھردری گرم چادر بھی......... میں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی اور چولہے میں نیم خشک لکڑیاں تڑتڑ کی آواز سے جلتی رہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے سلیم سے پوچھا "ہمیں یہاں کتنی دیر ہو گئی ہے؟" وہ بولا "قریباً ڈھائی گھنٹے' میں بارہ بجے تمہیں وہاں سے لایا تھا۔ آدھ گھنٹہ راستے میں لگا اور اب تین بجے ہیں۔"

عابد کی موت کا منظر میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اب تک ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی ہوں لیکن وہ خواب نہیں تھا ایک جیتا جاگتا المیہ تھا۔ میں نے سلیم کو عابد کی موت کے بارے بتایا تو وہ ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گیا۔ کہنے سننے کے لئے ہمارے پاس اب کیا رہ گیا تھا ہم میدان جنگ میں تھے اور جنگ میں کام آنے

والے پیاروں کا ماتم نہیں کیا جاتا۔ انہیں پھلانگ کر جنگ جاری رکھی جاتی ہے۔ جب موت ارزاں ہو جائے تو پھر وہ اہم نہیں رہتی۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہم جھنگ پہنچ گئے۔ وہاں سے خان رحیمی کے ایک خاص کارندے نے ہمیں بذریعہ ویگن خان رحیمی کے علاقے تک پہنچا دیا۔ میں اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا میں کچھ دلیر سی ہو رہی ہوں۔ اپنے گردوپیش کی ہر خوفناک چیز اب کچھ کم خوفناک محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ سب کچھ ان سنگین حالات کا نتیجہ تھا جن سے میں گزر رہی تھی' یا گزاری جا رہی تھی۔

کوٹھی میں شام کے وقت خان رحیمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ پہلے تو مجھ سے لاہور کے حالات سنتا رہا۔ میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ سوائے اس بات کے کہ میں عشرت کی شرمناک تصویریں دیکھنے کے بعد لاہور گئی تھی اور یہ کہ عشرت کی شکل میری بھابی سے ملتی ہے۔ میں نے صرف یہ بتایا کہ میں بھائیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ خان رحیمی نے پوری روئیداد اطمینان سے سنی۔ گاہے مسکراتا اور گاہے رنجیدہ ہوتا رہا۔ فرخندہ اور عابد کی ناگہانی اموات کے ذکر نے اسے بھی افسردہ کیا۔ ویسے وہ اس بارے میں بہت کچھ پہلے ہی جان چکا تھا۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے ذرائع بہت وسیع تھے........

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان دنوں وہاب چنگیزی کے ڈیرے پر ایک نوخیز لڑکی موجود ہے جسے چنگیزی کہیں سے زبردستی لائے ہیں اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ وہاب چنگیزی کے پاس ایک شیر ہے جو اس نے حال ہی میں کسی مقامی شوقین سے خریدا ہے......... لیکن اسے اس سنگین واردات کا ہرگز علم نہیں تھا۔ جس میں اس شیر نے کوٹھی میں گھسنے والے تین آدمیوں پر حملہ کر دیا تھا اور وہ موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ وہ یہ سب کچھ سن کر حیران ہوا......... گفتگو کے دوران سلیم کا ذکر چل نکلا۔ خان رحیمی نے کہا۔

"گرل! یہ شخص جو ہر وقت تیرا دم چھلہ بنا رہتا ہے۔ آخر ہے کیا چیز؟ مجھے تو اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

میں نے کہا "سر! اس شخص کی کوششوں سے آپ کو لاکھوں روپے کا باز حاصل ہوا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی تعارف کی ضرورت رہتی ہے؟"

خان رحیمی بولا "نہیں......... یہ بات نہیں ویسے تو وہ بہادر ہے' ذہین بھی ہے

لیکن تمہارے بارے میں اس کا رویہ عجیب سا ہے۔ کچھ عشق و شق کی بیماری لگتی ہے اسے۔ آئی مین کچھ اورینٹل سا ہے' وہ اتنا عرصہ گزر گیا پھر بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔"

خان رحیمی نے کتنی مشکل بات کتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی۔ میں گڑبڑا کر رہ گئی۔ وہ بغور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "سر! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ اسی سے پوچھ لیجئے۔"

خان رحیمی نے میز کے نچلے حصے سے ایک باسی اخبار اٹھالیا اور بولا "اب یہی دیکھو اس میں چودھری شہاب کا بھلا کیا قصور تھا' اسے مار کر زخمی کر دیا تمہارے اس ہیرو نے۔"

میں نے اخبار خان رحیمی کے ہاتھ سے جھپٹی۔ چودھری شہاب کے بارے ایک کالمی خبر چھپی تھی۔ سرخی تھی چنگیزی قتل کیس میں ملوث ملزم زخمی۔ نیچے لکھا تھا کل شام "ہوم لائیک" ہوٹل کے سامنے ایک نامعلوم موٹر سائیکل سوار نے چودھری شہاب سے گالی گلوچ کیا اور بعد میں اس پر جھپٹ پڑا۔ چودھری شہاب کو زخمی کرنے کے بعد وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ گلبرگ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ چودھری شہاب' واصف چنگیزی کے مشہور مقدمہ قتل میں ملوث ہے۔"

"یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"رقابت" خان رحیمی نے مختصر جواب دیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!"

"مطلب یہ ہے کہ سلیم تم سے محبت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ چودھری شہاب بھی تم میں دلچسپی لیتا ہے اس بات پر اس نے چودھری شہاب کو پیٹ ڈالا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔"

مجھے سوجھ نہیں رہا تھا اس موقع پر کیا کہوں۔ خان رحیمی نے میری پریشانی بھانپ کر خاموشی کو توڑا "درحقیقت سلیم سے پہلے چودھری شہاب ہی تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔ اخبار میں تو کوئی اطلاع نہیں تھی۔ چودھری شہاب نے ہی کھوج لگایا تھا کہ تم "ہوم لائیک" ہوٹل میں ہو۔ وہ تم تک پہنچنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا جب سلیم سے اس کی

مڈبھیڑ ہوگئی۔ سلیم نے غصے سے کہا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے اس طرح ایک اجنبی لڑکی کیلئے پریشان ہونے کی۔ شہاب نے کہا "وہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں" اس بات پر تکرار ہوگی۔ سلیم غصے سے بے قابو ہو کر شہاب پر پل پڑا۔ میرا ایک مخبر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ قصور سلیم کا ہی تھا۔ شہاب آخری وقت تک لڑائی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ مار کھا کر بھی اس نے سلیم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بعدازاں شہاب کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر رہا ہے۔ میں نے سوچا پولیس اسے پھر کسی چکر میں نہ الجھالے۔ راتوں رات میں نے اسے ہسپتال سے نکلوایا اور یہاں لے آیا یہ سب کچھ بڑی رازداری سے کیا گیا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "تو وہ یہاں ہے؟"

خان رحیمی نے اثبات میں جواب دیا۔ بولا "مہمان خانے میں ہے درد کی دوا کھا کر سویا ہوا ہے تم ابھی جا کر اسے بے آرام نہ کرنا.........."

میں گہری سوچ میں کھوگئی۔ یہ سلیم کیا تماشے کر رہا تھا کبھی کبھی مجھے اس پر بے حد غصہ آجاتا تھا مگر یہ غصہ زیادہ دیر برقرار بھی نہیں رہتا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ مجھے اس کے بارے میں کس انداز سے سوچنا چاہیئے۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر خان رحیمی نے کہا "ویسے میں نے ان دونوں کی صلح کرا دی ہے۔ تم اپنے طور پر بابری' میرا مطلب ہے سلیم کو سمجھاؤ کہ وہ ہوش سے کام لے۔ ہماری اپنی صفوں میں انتشار ہوگا تو دشمن ہمیں روئی کی طرح دھنک دے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے میں اس سے بات کروں گی۔"

خان رحیمی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

میں نے کہا "سر میرا علیحدہ سے کوئی ارادہ نہیں ہے جو آپ کہیں گے وہی ہوگا۔"

میں نے وہ خط خان رحیمی کے سامنے رکھ دیا جو فرخندہ کے ساتھی رپورٹر نے کوہاٹ کے کسی ڈاک خانے سے پوسٹ کیا تھا۔

خان رحیمی نے لفافے کو سرسری نظر سے دیکھا اور بولا "تمہارا کیا خیال ہے۔ وہاب چنگیزی کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے یہ ثبوت کافی ہیں؟"

"سب کچھ آپ کے سامنے ہے جناب" میں نے جواب دیا "وہاب کے غنڈوں نے پچھلے تین دن کے اندر دو افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور جس راز کو چھپانے کیلئے انہوں نے یہ گھناؤنے قتل کئے ہیں وہ بھی چھپا نہیں رہ سکا۔ فرخندہ کے ساتھی کی اس تحریر کے مطابق اس امر کی ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ چنگیزیوں نے ایک لڑکی کو اغوا کیا اور اس کی رہائی کیلئے آنے والے چار افراد کو اذیت ناک موت سے دوچار کرکے بے کفن دبا دیا۔ کیا یہ سب کچھ قانون کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی نہیں؟"

"نہیں" خان رحیمی نے مایوسی سے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا "یہ سب کچھ ناکافی ہے۔ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ چنگیزیوں نے قانون کو اس طرح الجھا رکھا ہے کہ وہ رسہ جسے ان کی پھانسی کا پھندا بننا تھا ان کے ہاتھ کی کمند بنا ہوا ہے اور اس کمند سے وہ جرائم کی نئی نئی چوٹیاں سر کر رہے ہیں۔ اس جمود کو توڑنے کیلئے ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ برائی کے اس درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کیلئے ایک تند آندھی درکار ہے۔"

میں نے خان رحیمی کی طرف دیکھا وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اپنے جذباتی پن کو محسوس کرکے اس نے پائپ سے چند گہرے کش لئے اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"صبر مائی ڈیئر......... تھوڑا سا صبر۔ میں تمہاری دلی کیفیت سے آگاہ ہوں اپنی عزیز فرینڈ اور اس کی منگیتر کی موت نے تمہیں زخم زخم کر دیا ہے۔ فطری بات ہے کہ تم ان کے لئے انصاف چاہتی ہو......... مگر میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں اس موقع پر کوئی بھی جلد بازی تمہاری منزل کو تم سے بہت دور کر دے گی۔ اگر دل پر بہت بوجھ ہے تو جاؤ کسی کمرے کے کونے میں منہ دے کر جی بھر کر رو لو۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر مسکراتی ہوئی میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسا خوبصورت لطیفہ سناؤں گا کہ تمہیں شرطیہ ہنسی آئے گی۔ نہ آئے تو میرا نام خان رحیمی نہیں........."

عجیب آدمی تھا وہ موقع محل دیکھے بغیر مسکرانے کی فکر میں رہتا تھا اس سے پہلے بھی ایک دن وہ بڑی سنجیدگی سے ایسی ہی شرط لگا چکا تھا۔ بڑے دعوے کے ساتھ اس نے شاہ دین ٹوانہ کو لطیفہ سنایا تھا اور جب اسے ہنسی نہیں آئی تو ہاتھ اٹھا کر بولا تھا' ٹھیک ہے میرا نام خان رحیمی نہیں۔ اس کی اس ادا پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

خان رحیمی کو ملنے سے پہلے میرے سینے میں طوفان سے اٹھ رہے تھے جی چاہتا تھا ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر فرخندہ کے قاتلوں کی تلاش میں نکل جاؤں۔ ان قاتلوں کی تلاش میں جن کی گردن پر صرف فرخندہ اور عابد کا خون ہی نہیں تھا۔ میرے فرحان کا خون بھی تھا۔ وہ جہاں بھی ہیں انہیں ڈھونڈ لوں۔ پھر خود مرجاؤں یا انہیں مار دوں.........

مگر خان رحیمی کی عام سی باتوں میں نامعلوم کیا جادو تھا کہ میرے اندر کے شعلے دھیمی آنچ میں بدلنے لگے۔ خان رحیمی کے بتائے بغیر ہی میں سمجھنے لگی کہ اس موقع پر میری کوئی بھی جلد بازی وہاب چنگیزی کے حق میں جائے گی۔ وہاب چنگیزی مجرم ضرور تھا لیکن ان مجرموں میں سے تھا جن کا جرم ثابت کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔ خان رحیمی کے کہنے پر میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ برآمدے میں پہنچ کر مجھے چودھری شباب کا خیال آیا اور میرے قدم خودبخود مہمان خانے کی طرف اٹھ گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ کوٹھی کی راہداریوں اور کمروں میں بلب جلنے لگے تھے۔ سامنے ہی دینو ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے تیز تیز قدموں سے کسی کمرے میں جا رہا تھا۔ اس کی چال میں بڑا نسوانی سا لوچ تھا۔ دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجاتی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی اور کچھ نہیں تو پانچ دس منٹ ضرور ضائع ہوتے۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے ہی پیچھے چلتی رہی۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس کی منزل بھی مہمان خانہ ہی ہے۔ دراصل وہ چودھری شباب کیلئے ہی کھانا لے کر جا رہا تھا۔

میں اس کمرے میں پہنچی تو چودھری شباب غسل خانے سے نکل کر واپس بستر پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک پاؤں پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پیشانی پر بھی بھاری بھرکم پٹی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسے سہارا دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اسے بستر پر پہنچا کر میں سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ دینو ٹرے میز پر رکھ چکا تھا۔ غصیلے لہجے میں بولا۔

"شاہدہ بی بی! یہ بابری مجھے تو بالکل چنگا نہیں لگتا۔ پتہ نہیں آپ کو کیوں چنگا لگتا ہے۔ اب دیکھیں اس نے چودھری صاحب سے بدوبدی لڑائی مول لی ہے۔ بالکل نا ضروری طور پر۔ ذرا سوچیں۔ ایک بندا لڑنا ہی نہیں چاہتا آگے سے ہاتھ ہی نہیں اٹھاتا تو دوجے کو بھی کچھ حیا آنی چاہیے۔ پتہ نہیں کس پہاڑی بکرے کی اولاد ہے وہ۔ اتنی زور سے ٹکر ماری ہے چودھری صاحب کو کہ سارا ماتھا نیلا ہوگیا ہے۔ پاؤں پر بھی اینٹ ماری

ہے دو تین انگلیاں کڑچ کر دی ہیں۔ وہ تو شکر ہے اوپر والے کا لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔"

شہاب مسکراتا ہوا بولا "اوئے میراثی تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے خود وہاں موجود تھا۔"

دینو بولا "میں موجود نہیں تھا مگر محسوس تو کر سکتا ہوں۔ اساس بھی کوئی شے ہوندی ہے۔"

میں نے کہا "چودھری شہاب مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تمہیں یہ زخم میری وجہ سے آئے ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ بولا "جی آپ کو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا اس میں کیا قصور ہے۔ مجھے تو بابری پر بھی کوئی رنج نہیں۔ بس وہ طبیعت کا کڑوا ہے۔"

شہاب کی تحمل مزاجی پر مجھے حیرانی ہو رہی تھی وہ تو زبان سے زیادہ ہاتھ استعمال کرنے کا عادی تھا۔ میں کچھ دیر چودھری شہاب کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی اس نے فرخندہ اور عابد کی موت پر گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ میں چودھری شہاب کے کمرے سے نکلی تو سامنے ہی لان میں سلیم نظر آیا۔ اس نے چبھتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی پھر بے نیازی سے منہ دوسری طرف پھیر کر عشرت کو آوازیں دینے لگا۔ وہ کوٹھی کی چھت پر ایک بڑی سی رنگین پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلیم نے "میم صاحب" کہا تو وہ جھوم اٹھی اور پکار کر کہنے لگی۔

"بابری جلدی اوپر آؤ یہ مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی۔ اوئی اللہ میری تو انگلیاں کٹ جائیں گی۔" پتنگ دائیں بائیں بے قراری سے حرکت کر رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ پتنگ نہ ہو۔ عشرت کے اپنے "جذبے" ہوں جو سنبھالے نہ سنبھل رہے ہوں اور وہ مدد کیلئے بابری کو پکار رہی ہو۔

اس روز بھی میں نے بابری کا ہیولا عشرت کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا اور ساری رات دل ودماغ میں جنگ جاری رہی۔ یہ لڑکی میری بھابی کی بہن تھی' وہ اس طرح گناہ کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھی کہ اس کا پورا وجود ایک گالی بن رہا تھا۔ اگلے روز جب وہ کاندھے پر کپڑا ڈالے اپنے بال کھولے چھت کی دھوپ میں ٹہل رہی تھی میں اس کے پاس جا پہنچی۔ اس کی ذات ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی طرح میرے دماغ سے چپکی

ہوئی تھی۔ میں اس کے بارے جاننا چاہتی تھی' اس کی یہاں موجودگی کا مطلب سمجھنا چاہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگی اور ہم دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ آج وہ میرے ساتھ گفتگو میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔ جلد ہی مجھے عجیب طرح کا احساس ہونے لگا۔ عشرت وہی کام کر رہی تھی جو میں کرنا چاہتی تھی یعنی میں تو اسے کریدنے کیلئے یہاں آئی تھی اور وہ الٹا مجھے کرید رہی تھی۔ جب میں نے اس کیفیت کو محسوس کر لیا تو جان بوجھ کر انجان بن گئی۔ میں نے عشرت کو اس کی روانی میں بہنے دیا۔ وہ خود کو بہت ہوشیار اور باخبر سمجھ رہی تھی۔ اس کا قیاس یہ تھا کہ میں خان رحیمی پر ڈورے ڈالنے کیلئے یہاں ٹھہری ہوئی ہوں اور اس بڈھے کو اپنے ہاتھوں میں کر کے مالی فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

وہ بولی "شاہدہ' یہ خان صاحب ہر دوسرے تیسرے دن کہاں جاتے ہیں میں نے سنا ہے کہ یہاں آس پاس کوئی مرغی خانہ ہے جس میں خان رحیمی کا حصہ ہے؟"

میں نے کہا "ہاں مرغی خانہ تو ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس میں خان کا حصہ ہے۔"

وہ بولی "دینو کہتا تھا کہ وہاں جا کر بازوں کو ٹریننگ دیتے ہیں۔ ٹریننگ کے لئے کیا اس مرغی خانے میں جانا ضروری ہے۔ یہاں بھی تو بہت جگہ ہے ہاں' یاد آیا کہ ایک دن تم بھی تو گئی تھیں خان رحیمی کے ساتھ' کیا بہت بڑا مرغی خانہ ہے؟"

"نہیں.......... کچھ زیادہ بڑا تو نہیں' مگر احاطہ کافی کھلا ہے۔ اگر دیکھنے کا اتنا ہی تجسس ہے تو خان رحیمی سے کہو وہ لے جائے گا۔"

"نہیں.......... تجسس کی کوئی بات نہیں" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے خان رحیمی سے ضرور فرمائش کی ہو گی مگر وہ ٹال گیا ہو گا۔ عشرت کی اس دلچسپی کا راز مجھے بخوبی معلوم تھا۔ میرے کانوں میں وہ گفتگو گونج رہی تھی جو میں نے لاہور جانے سے پہلے عشرت کے باتھ روم کی کھڑکی سے سنی تھی۔ خانم نامی اس عورت نے عشرت کو مجبور کیا تھا کہ وہ جلد از جلد کوئی عملی قدم اٹھائے ورنہ اسے یہاں بھیجنے والے اس سے بری طرح پیش آئیں گے۔ عشرت کو دھمکانے کیلئے اسے وہ منحوس لفافہ بھی دکھایا گیا تھا۔ اب اس عورت کی ہدایت پر عشرت کوٹھی کی خفیہ سرگرمیوں میں جھانکنے کی طفلانہ

کوشش کر رہی تھی۔ میں اس کو طفلانہ کوشش ہی کہہ سکتی تھی کیونکہ کسی اکیلی دکیلی عورت کیلئے اس سارے گورکھ دھندے کو سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ ہماری باتوں کے دوران ہی دور سے گرد کے بال اڑتے نظر آئے۔ دو یا تین گاڑیاں کوٹھی کی طرف آرہی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ خان رحیمی کے گھڑسوار بھی تھے۔ گاڑیاں نزدیک پہنچیں تو عشرت نے ایک گہری اور سرد سانس لی "شاہ صاحب آگئے ہیں" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ شاہ سے اس کی مراد شاہ دین ٹوانہ تھا' جسے بعض لوگ غلطی سے اس کا خاوند بھی سمجھتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ کوٹھی کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔

شاہ دین ٹوانہ کی آمد کے بعد کوٹھی میں بہت گہما گہمی رہی۔ کچن ہمیشہ سے زیادہ مصروف ہو گیا۔ خان رحیمی نے شاہ دین کے اعزاز میں رقص و سرور کی محفل کا اہتمام بھی کیا۔ ان کا پروگرام باز کے شکار کا تھا۔ تاہم فی الفور قرب وجوار میں کسی پرندے کا سراغ نہیں ملا۔ شاہ دین ٹوانہ کی آمد کے تیسرے روز خان رحیمی نے سور کے شکار کا پروگرام بنایا۔ سور کشی کیلئے خان رحیمی کا اپنا ایک انداز تھا۔ اس نے بہت سے گھوڑے پال رکھے تھے جن پر بیٹھ کر جنگلی سوروں کا تعاقب کیا جاتا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بندوقوں کے علاوہ کبھی کبھی نیزے اور بلم بھی استعمال ہوتے تھے۔ خان رحیمی نے مجھے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ تقسیم ہندوستان سے پہلے جے پور میں اس نے نیزے سے سور مارنے کے مقابلے میں طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ اس کے البم میں ایسی بہت سی تصویریں بھی تھیں جن میں وہ راجستھان کے راجوں مہاراجوں کے ساتھ سیروشکار میں مصروف نظر آتا تھا۔ نیزے سے سور کشی کے بارے میں اس نے مجھے اتنی باتیں بتائیں تھیں کہ نہ دیکھتے ہوئے بھی شکار کے سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

شکار پر روانہ ہوتے ہوئے جب خان رحیمی نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا تو میں تیار ہو گئی۔ مجھے کسی بھی مصروفیت کی ضرورت تھی تاکہ پاگل کر دینے والی سوچوں سے فرار حاصل کر سکوں.......... ہم صبح سات بجے کوٹھی سے روانہ ہوئے۔ ساری پارٹی قریباً ساٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ ان ساٹھ افراد میں اصل شکاری تو دس پندرہ ہی تھے۔ باقی تعداد ہانکا کرنے والے دیہاتیوں کی تھی۔ انہوں نے ہاتھوں میں ڈھول' کنستر' بناسپتی گھی کے ڈبے' باجے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھا رکھا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ننگے پاؤں تھے۔

لباس سب کا میلا کچیلا تھا۔ شاہ دین ٹوانہ اور خان رحیمی کے علاوہ چند اور معززین بھی اس شکار میں شریک تھے۔ ان میں ایک صاحب کوئی ریٹائرڈ کرنل تھے۔ دوسرے بھارت سے آئے ہوئے ایک سردار جی تھے۔ سردار جی کی تھل تھل کرتے جسم والی فیشن ایبل پتنی بھی ساتھ تھی۔ ایک نوجوان شکاری لاہور سے آیا ہوا تھا۔ عشرت بھی اس پارٹی میں شریک تھی۔ اس نے سرخ شرٹ' نیلی جین اور شکاری بوٹ پہن رکھے تھے۔ چتکبرے گھوڑے پر سوار وہ شاہ دین ٹوانہ کے شانہ بشانہ جا رہی تھی۔ سلیم ساتھ نہیں آیا تھا۔ کوٹھی میں کسی مہمان کی آمد متوقع تھی اور خان رحیمی نے اسے اس کے استقبال کیلئے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ شکاری پارٹی کے پیچھے پیچھے خان رحیمی کا "افسر شکار خانہ" جو گنجے سر والا ایک ادھیڑ عمر فارسٹ گارڈ تھا بہت سا سازوسامان چھکڑے پر لئے آ رہا تھا۔ اس میں سامان خوردونوش کے علاوہ بندوقیں اور نیزے وغیرہ بھی تھے۔ نیزوں کی انیوں کو صاف کیا گیا تھا اور وہ خوب چمک رہی تھیں۔ اس اسلحے میں چند تلواریں بھی تھیں۔ دینو ان تیزدھار آلات کو دیکھ دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔ غالباً اس سے پہلے دینو نے یہ چیزیں لاہور کے عجائب گھر میں ہی دیکھی تھیں۔

مجھ سے کہنے لگا' "یہ.......... خان صاحب کے بزرگ پچھلے زمانے میں جنگیں شنگیں بھی کرتے رہے ہیں۔" میں نے نفی میں جواب دیا بولا "مجھے تو لگتا ہے پانی پت کی لڑائی میں آگے آگے یہی تھے.......... اتنے ڈراؤنے اسلحے کا یہ لوگ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "تم بھی دیکھنا میں بھی دیکھوں گی۔"

قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں شکار کھیلا جاتا تھا۔ کافی گھنے درخت تھے۔ جھاڑ جھنکار بھی کثرت سے تھا۔ خان رحیمی کے کارندوں نے جلدی جلدی دھوپ میں دو خیمے کھڑے کر دیئے۔ اس وقت تک نو بج چکے تھے۔ دھوپ میں یہاں وہاں لیٹ کر سب لوگوں نے تھوڑی دیر کیلئے کمر سیدھی کی' پھر شکار کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم تو دیکھنے والوں میں تھے اس لئے ایک طرف کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ خان رحیمی نے چار چار گھڑسواروں پر مشتمل چار پارٹیاں ترتیب دیں پھر سکے کے ذریعے ٹاس کی گئی کہ کس پارٹی کو سب سے پہلے جانور کا تعاقب کرنا ہے۔ ٹاس جیتنے والی پارٹی شاہ دین ٹوانہ کی تھی۔ وہ اپنے عربی گھوڑے پر چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔

اس کے تینوں ساتھی بھی تیار تھے ان سب کے ہاتھ میں نیزے تھے شاہ دین کی کمر سے ریوالور لٹک رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی سنسنی تھی۔ میں نے ایک کارندے سے پوچھا "سور کہاں ہے؟" اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس سامنے والے جھنڈ سے نکلے گا......... وہ درختوں اور جھاڑیوں کا ایک کافی بڑا جھنڈ تھا۔ کہیں کہیں لمبی جنگلی گھاس بھی اگی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا ہانکا کرنے والے افراد جو یہاں تک پاپیادہ ہمارے ساتھ آئے تھے اپنے سامان کے ساتھ جھنڈ کی تین اطراف پھیل رہے ہیں......... جیسا کہ بعد میں پتہ چلا خان رحیمی کے بھیجے ہوئے کھوجیوں نے ہمارے پہنچنے سے پہلے دو مختلف مقامات پر دو جانوروں کو گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک جانور اس جھنڈ میں تھا۔ اب اسے ہانکا کرکے باہر نکالا جانا تھا۔ یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شاہ دین ٹوانہ کے مخصوص اشارے پر دیہاتیوں نے ہانکا شروع کیا۔ ایکا ایکی ڈھول 'کنستر' باجے سب کچھ بجنے لگا۔ ہانکا کرنے والے منہ سے بھی "ہاؤ ہو" کی آوازیں نکال رہے تھے۔ شاہ دین اور اس کی ساتھیوں کے تربیت یافتہ گھوڑے چوکس ہوگئے۔ ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ نتھنے پھول گئے اور اگلے پاؤں زمین پر گردش کرنے لگے۔ ہانکنے والے اپنا گھیرا تنگ کرتے ہوئے تین اطراف سے آگے بڑھنے لگے اور پھر......... ہم نے ایک سیاہی مائل جانور کو جو عام سائز کے کتے سے دوگنا تھا جھاڑیوں سے نکلتے دیکھا۔ اس کی لمبی تھوتھنی دیکھ کر جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے مخالف سمت میں بھاگا جا رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی شاہ دین اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور سور کے پیچھے لپکے۔ گھوڑوں کی آہٹ سنتے ہی سور کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ وہ بدک کر پوری رفتار سے بھاگا۔ گھوڑے تند بگولوں کی طرح اس کے پیچھے گئے۔ ہم سب بے ساختہ اپنی کرسیوں کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں والے گرد آلود میدان میں وہ ایک سنسنی خیز دوڑ تھی۔ جنگلی سور گھوڑوں کے آگے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک نشیبی راستے پر اوجھل ہوگیا۔ چند لمحے بعد گھوڑے بھی اس نشیب میں اتر گئے......... شاہ دین ٹوانہ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ سور نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ صرف ایک سوار کا نیزہ اسے معمولی زخم لگا سکا تھا۔ گھوڑے پسینہ پسینہ ہو کر ہانپ رہے تھے۔

سوار بھی نڈھال سے تھے۔ ابھی خان رحیمی ان سے اس "ہیٹ" کی تفصیلات پوچھ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب سے شور سنائی دیا۔ بہت سے دیہاتی ایک ساتھ چیخے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو ایک سور ہانکا کرنے والوں سے گھبرا کر سیدھا ہماری طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ عشرت کی چیخیں نکل گئیں۔ خان رحیمی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ ویسے بھی اب ان کی باری تھی۔ خان رحیمی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نیزہ سونت کر جانور کی طرف بڑھا۔ سئور نے گھوڑوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پچھلے پاؤں پر گھوم کر رخ بدلا اور مخالف سمت میں بھاگا۔ ایک بار پھر تعاقب کا سنسنی خیز منظر دیکھنے میں آیا۔ خان رحیمی نے بھاگتے گھوڑے سے سئور پر نیزہ پھینکا وہ اس کی پشت سے اچھل کر جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔ تاہم خان رحیمی کے ایک ساتھی نے جانور پر کاری وار کیا۔ بڑے شاندار طریقے سے بھاگتے گھوڑے سے جھک کر اس نے نیزہ سئور کی پسلیوں میں اتار دیا۔ یہ کاری زخم کھا کر جسیم سئور تیزی سے پلٹا اور گھوڑے پر حملہ آور ہوا۔ گھوڑا سوار سمیت اوندھے منہ جھاڑیوں میں گرا۔ سئور کی پسلیوں میں پھنسا ہوا نیزہ بڑا خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ سئور گرے ہوئے سوار پر حملہ آور ہوتا یا اپنی مہلک تھوتھنی سے گھوڑے کا پیٹ پھاڑ ڈالتا۔ پارٹی کے ایک پٹھان ممبر اصغر شاہ نے یاعلی کا نعرہ لگا کر ایسی مہارت سے نیزہ مارا کہ وہ سیدھا سئور کے سینے میں جاگھسا۔ دوسرا نیزہ کھا کر اس نے زمین پر اتنی تیزی سے لوٹنیاں کھائیں کہ دونوں نیزوں کے دستے توڑ دیئے۔ چند ہی لمحے کے بعد وہ تڑپ کر ساکت ہوگیا۔ اسے کھینچ کر خیموں کے پاس لایا گیا۔ وہ خاصا جسیم جانور تھا۔ اس شکار کے قانون کے مطابق شکار کا کریڈٹ اسی گھڑسوار کو جاتا ہے جس کا نیزہ سب سے پہلے جانور کو چھوئے۔ اس طرح یہ شکار خان رحیمی کے کھاتے میں گیا۔ حالانکہ وہ صرف ایک کمزور سا وار ہی کر سکا تھا......... میں نے خان رحیمی سے پوچھا کہ جب سئور نے گھڑسوار کو نیچے گرا دیا تھا اور چند لمحوں کیلئے سوار کی جان کو خطرہ پیدا ہوگیا تو آپ نے گولی کیوں نہیں چلائی۔ جواب میں خان رحیمی نے بتایا کہ شکار کے قواعد کے مطابق یہ لڑائی آتشیں اسلحے کے بغیر لڑی جاتی ہے شکار اور شکاری کیلئے مرنے اور مارنے کے یکساں مواقع ہوتے ہیں اور بعض اوقات واقعی شکاری کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ "ہیٹ" یعنی تعاقب شروع ہونے کے بعد اگر کوئی شکاری گھبرا کر رائفل وغیرہ کا استعمال

کرتا ہے تو اسے نہ صرف مقابلے سے خارج کر دیا جاتا ہے بلکہ ساتھی اسے بزدل بھی گردانتے ہیں۔ میں حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس دوران کھوجیوں نے آکر اطلاع دی کہ خشک نالے کی دوسری جانب گنے کے کھیتوں میں کچھ اور سوروں کا سراغ ملا ہے۔ اس اطلاع سے شکاریوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی' اور وہ گھوڑوں کے زین بند کسنے کے بعد اس جانب روانہ ہوگئے۔

مار دھاڑ کا یہ سلسلہ لنچ کے وقفے کے سوا شام تک جاری رہا۔ موسیقی کے علاوہ ناؤ نوش کا انتظام بھی تھا۔ کچھ لوگ ایک قریبی جوہڑ میں چھوٹی مچھلی کا شکار کھیلنے لگے۔ کچھ نے ائرگن سے پرندوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے جب اچانک مجھے احساس ہوا کہ عشرت کافی دیر سے نظر نہیں آ رہی۔ آخری بار میں نے اسے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دیکھا تھا جب وہ ڈینو سے باتیں کر رہی تھی۔ میں ڈینو کے پاس پہنچی اور اس سے پوچھا کہ عشرت کہاں ہے۔ اس نے کہا۔

"جی میں کی کہہ سکدا ہاں۔ ابھی تو ایتھے تھیں۔ وہ سامنے والے درختوں میں گھوڑ سواری کی مشق کر رہی تھیں۔"

میں نے پوچھا "وہ تم سے باتیں بھی تو کر رہی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی؟"

ڈینو نے کہا "وہی مرغی خانے کا ذکر چھیڑیا ہوا تھا جی۔ پچھتی تھیں یہاں سے کتنی دور ہے۔ میں نے کہا یہاں سے تو نیڑے ہی ہے۔ میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہے۔"

ڈینو کی بات سن کر فوراً میرے ذہن میں آیا کہ ہو نہ ہو وہ بیوقوف اسی طرف نکل گئی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا وہ کیا کر رہی ہے۔ اس مرغی خانے کے گرد نگران آنکھوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ جاسوسی کے شوق میں خوامخواہ مصیبت میں پھنس سکتی تھی۔ ڈینو سے بات کرنے کے بعد میں خیمے میں واپس آ گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ شاہ دین ٹوانہ کو عشرت کی غیرموجودگی سے آگاہ کروں تاکہ وہ اسے ڈھونڈ کر واپس لائے۔ مگر خیموں میں پہنچ کر پتہ چلا کہ شاہ دین اور خان رحیمی تو گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے ہیں اور معلوم نہیں اب کب لوٹیں گے۔ ہو سکتا ہے سب لوگوں کو رات بھی یہیں گزارنا پڑے۔ میرے پوچھنے پر ایک کارندے نے بتایا کہ کہیں قریب ہی باز کا ایک گھونسلہ ملا ہے۔

اگر معاملہ باز کے گھونسلے کا تھا تو پھر واقعی آج شکار پارٹی کا واپس جانا ممکن نہیں تھا

شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ میں نے سوچا اندھیرا ہونے سے پہلے عشرت کو تلاش کر لینا چاہئے۔ میں نے ڈینو کو ساتھ لیا اور ہم دونوں دو بھلے مانس سے گھوڑوں پر سوار ہو کر عشرت کو ڈھونڈنے نکلے۔ مرغی خانے کی جانب اندازاً" دو میل تک سفر کے باوجود جب مرغی خانے کے آثار نظر نہیں آئے تو مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ ہم اصل راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ راستے میں ایک بوڑھے کسان سے مرغی خانے کا پتہ پوچھا تو میرے شبہے کی تصدیق ہوئی۔ مرغی خانہ ہم کوئی ایک میل پیچھے دائیں جانب چھوڑ آئے۔ شام گہری ہو گئی تھی اور تاریکی تیزی سے قرب و جوار کے مناظر کو نگلتی جا رہی تھی۔ ہم اپنا رخ درست کرکے پھر مرغی خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ تقریباً" پانچ چھ فرلانگ فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک سامنے سے روشنیاں نظر آئیں۔ یہ روشنیاں اچھلتی کودتی تیزی سے پاس آ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مشعل بردار گھڑسوار ہیں۔ اس دوران ایک ہیولا سرپٹ بھاگتا ہمارے سامنے سے گزرا۔ یہ کوئی عورت تھی۔ بدحواسی میں وہ ہمیں دیکھ نہیں سکی تھی۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا' یہ عشرت ہے۔ میں نے چیخ کر آواز دی "عشرت" میری پہلی آواز پر ہی متحرک ہیولا ساکت ہو گیا۔ میں نے دوبارہ "عشرت" کہہ کر پکارا تو وہ جتنی رفتار سے پہلے بھاگ رہی تھی' اتنی ہی رفتار سے بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی......... ڈینو اور میں گھوڑوں سے اتر چکے تھے۔ عشرت "شاہدہ شاہدہ" پکارتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھ سکتی۔ عقب میں ناچتی ہوئی روشنیاں ہمارے سروں پر پہنچ گئیں۔ یہ تقریباً" آٹھ گھڑسوار تھے' ان میں سے پانچ کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ انہوں نے تین اطراف سے ہمیں گھیر لیا۔ مشعلوں کی مدہم روشنی میں میں نے پہلی بار غور سے عشرت کو دیکھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ سرخ قمیض اور نیلی پتلون گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ وہ خوف سے بری طرح لرز رہی تھی۔ گھڑسوار چھلانگیں لگا کر گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ ان میں سے اگلے شخص کو میں نے پہچان لیا۔ وہ خشو سوتیلی تھا وہی شخص جو ایک بدنام ڈاکو کے طور پر جانا جاتا تھا اور جس نے چند ہفتے پہلے کفن میں پرندے چھپا کر خان رحیمی کی کوٹھی میں پہنچائے تھے۔ اس کے بالوں بھرے چہرے پر آنکھیں دو انگاروں کی طرف دہک رہی تھیں۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے مرغی خانے میں خان رحیمی کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ تاہم عشرت سے وہ

ہرگز واقف نہیں تھا۔

اس نے بے باکی سے مجھے گھورا اور گھنی مونچھوں کے نیچے مسکرا کر بولا "بیگم جی! آپ یہاں؟"

میں نے کہا "ہاں.......... لیکن تم اس بیچاری کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟"

"بیگم سائیں ہم تو آرڈر کا بندہ ہے۔ ہمیں آرڈر ہے کہ جو اس طرف آئے اسے پکڑلو اور اس وقت تک نہ چھوڑو جب تک دوسرا آرڈر نہ مل جائے یہ چھوکری ادھر تاکا جھانکی کر رہی تھی اس لئے پکڑنا ضروری ہوگیا تھا۔"

"یہ راستہ بھٹک کر چلی گئی تھی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا "ہم خان رحیمی کے ساتھ ادھر شکار پر آئے ہوئے ہیں۔ نالے کے اس پار ہمارا کیمپ ہے۔"

"اچھا تو بڑے سائیں بھی ساتھ ہیں۔ ان کو ہمارا سلام بولنا انہیں کہنا کہ آپ کا چوکیدار بالکل چوکس ہے۔"

میں نے کہا "عشرت تیرا گھوڑا کدھر ہے؟"

وہ اپنا کولہا دباتی ہوئی کراہ کر بولی "میں گر گئی تھی پتہ نہیں کس طرف نکل گیا ہے۔"

میں نے بخشو سولنگی سے کہا "اب گھوڑے کا کیا ہوگا۔ تم اسے کوٹھی پہنچا دو گے؟"

وہ سر ہلا کر بولا "بالکل جی۔ گھوڑا بھی پہنچ جائے گا اور گھوڑے والی بھی۔ اب آپ بالکل بے فکر رہیں کچھ نہیں ہوگا دونوں کو۔"

"کیا مطلب!" میں نے آنکھیں پھاڑیں۔ "دونوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ دانت نکال کر بولا "سائیں مطلب تو سیدھا سادھا ہے یہ لڑکی تو اب ہمارے ساتھ ہی جائے گی نا۔ دیکھیں نا جی آرڈر جو ہوا۔ ہم آرڈر سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ خان رحیمی کہے کہ ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا ہے تو چاہے میری ایک بھی ٹانگ نہ ہو میں لکڑی کی ٹانگ پر کھڑا رہوں گا۔"

مجھے سولنگی کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ یوں عشرت کو جانے نہیں دے گا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے تم حکم کے اتنے ہی پابند ہو تو چلو ہمارے ساتھ کیمپ میں۔ وہاں خان رحیمی سے جھاڑ کھالو۔"

وہ سر ہلا کر بولا "نہ جی۔ آپ کیوں مجھے غلط کام پر مجبور کر رہی ہیں۔ جو میرے آرڈر ہیں میں نے آپ کو بتا دیئے ہیں۔ میرا کام صرف بندے کو پکڑنا ہے' پکڑ کر لانا نہیں۔ آپ اس لڑکی کو بے فکر ہو کر ہمارے پاس چھوڑ جائیں اور اگر بڑے سائیں آپ کے ساتھ ہیں تو انہیں جا کر بتا دیں۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے کر لیں گے۔"

عشرت نے ان خطرناک صورتوں والے خدائی فوجداروں کی طرف دیکھا اور میرے بازو کے ساتھ چمٹ گئی۔

"نہیں شاہدہ' مجھے ان غنڈوں کے حوالے نہ کرنا" وہ گڑگڑا کر بولی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "سولنگی' یا تو ہمیں جانے دو یا ہمارے ساتھ چلو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "یہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں جی۔"

ہماری گفتگو تکرار کا رنگ اختیار کر گئی اور تکرار جب زیادہ بڑھی تو میں نے عشرت کا بازو تھام کر اپنے گھوڑوں کی طرف قدم بڑھایا۔ سولنگی بازو پھیلا کر میرے راستے میں آ گیا۔ میں نے گرم چادر کے نیچے سے وہ ریوالور نکال لیا جو میں خان رحیمی کے خیمے سے ساتھ لے کر آئی تھی۔ ریوالور میں پوری گولیاں موجود تھیں۔ ریوالور دیکھ کر سولنگی ٹھٹھک گیا۔ میرے دماغ میں دھند سی بھرتی جا رہی تھی۔ میں جانتی تھی یہ غصے کی دھند ہے اس دھند سے میری آشنائی پہلی بار اس وقت ہوئی تھی جب میں نے لاہور میں میڈم نادرہ کو گاڑی سے ٹکر مار کر اپنے راستے سے ہٹایا تھا۔ اس کے بعد جیسے اس دھند کیلئے کوئی راستہ سا کھل گیا تھا۔ جب بھی ناانصافی یا زیادتی کا لمحہ آتا تھا میرے رگ وپے میں طیش کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ کوئی غیر مرئی آواز میرے اندر سے مجھے پکار کر کہتی تھی۔ "ثناء' ہوش کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ اپنے بچے کا انتقام لینا چاہتی ہو تو مصلحتوں کو ٹھوکر مار دو۔ سب کچھ فراموش کر ڈالو"۔ میں ابھی تک اس آواز پر قابو پائے ہوئے تھی لیکن مجھے لگتا تھا کہ کسی روز میرے لئے اس آواز سے کان بند رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ اور اس روز میں ایک بدلی ہوئی عورت بن جاؤں گی۔ اس موجودہ عورت سے بالکل مختلف اور ناقابل یقین حد تک دلیر اور نڈر.......... میں نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر ریوالور سیدھا کیا تو سولنگی غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کوئی عام شخص ہوتا تو میرے اس انداز پر گھبرا جاتا مگر وہ ایک مفرور ڈاکو تھا۔ یہ ریوالور اس کیلئے کھلونے

سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی پیچھے ہٹنے کی وجہ میرے چہرے کے تاثرات تھے جو یقیناً" مرعوب کر دینے والے تھے۔ میں نے پر زور لہجے میں کہا۔

"سولنگی' ہمارے راستے میں نہ آنا۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔"

"گولی چلا دو گی تو کیا ہو گا۔ کیا یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گی؟"

میں نے دیکھا سولنگی کے ساتھیوں نے کم از کم تین رائفلوں کے منہ ہماری طرف کر رکھے ہیں۔ خود کو بھری ہوئی رائفلوں کی زد میں محسوس کرنا ایک عجیب تجربہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ میں نے گولی چلائی تو وہ بھی گولی چلانے کیلئے آزاد ہوں گے۔ ہم تینوں کو پلک جھپکتے میں موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا لیکن مجھے یہ یقین تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ہمیں مارنا اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ تو صرف اعصاب کی لڑائی تھی جو ڈر کر ہاری جاسکتی تھی اور دلیر ہو کر جیتی بھی جاسکتی تھی۔ میں گھوڑوں کی طرف بڑھی تو سولنگی نے آگے آ کر مجھے روکنا چاہا میں نے دونوں انگلیوں سے ریوالور کا گھوڑا دبا دیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور گولی۔ سولنگی کے پاؤں کے پاس زمین میں پیوست ہو گئی۔ وہ جھٹکا کھا کر رک گیا۔ میں نے کہا۔

"سولنگی' مجھے آزمائش میں نہ ڈال۔ بات معمولی ہے لیکن میں اس پر جان دے بھی سکتی ہوں اور لے بھی سکتی ہوں۔"

میرے لہجے نے سولنگی پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ کچھ دیر میرا چہرہ پڑھتا رہا۔ تب اس کے بالوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے مشعل والا ہاتھ نیچے کیا اور اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کی اشارے سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ رائفلیں جھکا کر پیچھے ہٹ گئے۔ سولنگی بھاری آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے بیگم جی تم جاؤ۔ میں بڑے سائیں سے بات کروں گا اس بارے میں۔"

سولنگی کا ایک ساتھی بولا "ہم عورت جات پر ہاتھ نہیں اٹھاتے ورنہ آپ کو بتاتے کہ یہ لڑکی یہاں سے کیسے جاسکتی ہے۔"

میں عشرت کو ساتھ لے کر گھوڑے پر آ بیٹھی۔ دینو بھی لرزتا کانپتا گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ بخشو سولنگی نے ایک شاخ سے دونوں گھوڑوں کو ضرب لگائی اور وہ ہمیں لے کر آگے بڑھنے لگے۔

رات سرد اور تاریک تھی۔ خیموں کے گرد تین چار جگہ الاؤ دہک رہے تھے۔ ان کے قریب پارٹی کے ارکان بیٹھے اونگھ رہے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ میرے اور عشرت کیلئے ایک چھوٹی سی چھولداری علیحدہ لگا دی گئی تھی۔

چھولداری سے باہر خان رحیمی کا ایک مسلح پہریدار موجود تھا۔ وہ بھی اپنا چھوٹا سا علیحدہ الاؤ دہکائے بیٹھا تھا۔ خود کو بیدار رکھنے کیلئے وہ گاہے گاہے نسوار کی چٹکی ناک میں چڑھا لیتا اور ایسی دھواں دھار چھینکیں مارتا کہ سناٹے میں دور تک آواز گونجتی۔ خان رحیمی' شاہ دین ٹوانہ اور دیگر افراد ابھی باز کے تعاقب سے واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے دستی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ دونوں سوئیاں بارہ کے ہندسے پر گلے مل رہی تھیں۔ عشرت میرے بالکل پاس لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پاؤں میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ جیسے وہ میری موجودگی کے احساس کو اجاگر رکھنا چاہتی ہو۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ میں خود چاہتی تھی کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور اپنی ذات کے گرداب سے نکل کر مجھے کچھ بتانے کے قابل ہو سکے.......... میرے دماغ میں کئی دنوں سے ایک شک یقین کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری بڑی بھابی ثمینہ کی ایک چھوٹی بہن ناروے میں اپنے کسی ماموں کے پاس رہتی ہے اور وہیں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ کم از کم ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ناروے میں تعلیم حاصل کرنے والی بہن یہی عشرت ہے جو ناروے کی بجائے جھنگ کے مضافاتی علاقے میں ہے اور کچھ عیاش زمینداروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے.......... آج میں نے اسے جس طرح سولنگی کے ہاتھوں سے بچایا تھا وہ بہت احسان مند ہوئی تھی۔ اس کے دل میں میرے لئے انسیت اور اعتماد کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور اجنبیت کی ایک دیوار سی ہم دونوں کے درمیان ڈھ گئی تھی۔ اس کی دلی کیفیت محسوس کر کے مجھے امید پیدا ہو چلی تھی کہ آج کی رات وہ مجھے اپنے دکھوں میں ضرور شریک کرے گی.......... اور میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ کچھ دیر بعد عشرت نے تکئے سے سر اٹھا کر چھولداری کے بانس سے ٹیک لگائی اور کہنا شروع کیا۔

"ہم دو بہنیں تھیں۔ ہماری ماں بہت مہربان اور نیک خاتون تھیں لیکن وہ ہماری سگی ماں نہیں تھی۔ یہ بات صرف ہم دونوں بہنوں کو ہی معلوم تھی۔ معلوم بھی کیا تھا بس ایک اندازہ سا تھا جسے ہماری ماں نے بھی کبھی جھٹلایا نہیں تھا۔ عام لوگوں کو یہی پتہ تھا کہ

ہمارا گھرانہ سابقہ مشرقی پاکستان سے اجڑ بجڑ کر آیا ہے اور اب آگے پیچھے ہمارا کوئی نہیں.......... میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میری بڑی بہن ثمینہ ان دنوں سیکنڈ ائر میں پڑھتی تھی۔ یہاں میں تمہیں بتادوں کہ میرا اصل نام عشرت نہیں زرینہ ہے۔ زرینہ کے عشرت بننے کی کہانی بڑی مختصر مگر بڑی المناک ہے۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اب کہانی ہی نہیں رہی۔ اسے تو ایک رسم کہنا چاہیے جو ہوس کی قربان گاہ پر نادان محبتوں کو بھینٹ چڑھا کر ادا کی جاتی ہے۔ ہمارے محلے میں اشرف نامی ایک لڑکا تھا۔ سکول میں آتے جاتے وہ اکثر مجھے راستے میں کھڑا ملتا۔ دھیرے دھیرے میں بھی اسے پسند کرنے لگی۔ وہ بے حد شرمیلا تھا اور بات کرتے ڈرتا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی سال ڈیڑھ سال چلتا رہا پھر اس نے مجھے خطوط دینے شروع کر دیئے۔ پتہ نہیں کیوں میں نے اس بارے میں ماں کو بتا دیا۔ ماں نے اس لڑکے کو سرراہ روک کر ڈانٹا۔ تین چار ماہ کیلئے یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کچھ عرصہ بعد میری ایک سہیلی کے ہاتھ اس نے پیغام بھجوایا کہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں انکار نہ کر سکی اور ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہم ان دنوں کراچی میں رہتے تھے اور کراچی کی کوئی سیرگاہ ہم نے نہیں چھوڑی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں کالج میں ماں کی طرف سے چھٹی کی درخواست دے دیتی اور اشرف کے ساتھ کسی طرف نکل جاتی۔ اب سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ لگتا تھا ہم ہی عقلمند ہیں' باقی سب بے وقوف ہیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہم کیا کر رہے ہیں۔ ایک روز حسب معمول میں نے گھر سے کالج کی راہ لی مگر کالج جانے کی بجائے اپنی سہیلی کے ساتھ بس میں بیٹھی اور تفریحی پارک چلی گئی اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ اس پارک میں اشرف سے ملاقات ہو چکی تھی۔ مگر اس روز نہ جانے کیا ہوا کہ وہ مقررہ ٹائم پر پہنچ نہ سکا۔ میں اور عذرا یونہی ادھر ادھر گھوم رہی تھیں کہ آوارہ لڑکوں کا ایک گروہ ہمارے پیچھے لگ گیا۔ انہوں نے ہمیں اس قدر ستایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ہم پارک سے نکلنا چاہتی تھیں مگر وہ ہمیں گھیر کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اتنے میں درمیانی عمر کا ایک لمبا تڑنگا شخص آیا۔ اس نے دو لڑکوں کو تھپڑ مارے اور باقی کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی۔ وہ ہمیں لے کر قریب ہی کھڑی نیلی گاڑی میں آ گیا۔ گاڑی میں ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ انہوں

نے بتایا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس کے آدمی ہیں اور آوارہ گرد طالب علموں کو پکڑنے کیلئے یہاں ڈیوٹی پر ہیں انہوں نے ہمارے اور گھر کا نام پتہ پوچھنا شروع کیا تو ہم گھبرا گئیں۔ اس وقت ہمارے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور ان کا تعلق قانون کے محافظوں سے نہیں قانون شکنوں سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پولیس اسٹیشن چلنا ہو گا اور وہاں سے ہماری رہائی والدین کی ضمانت پر ہو گی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو سخت گھبراہٹ کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے کار سواروں سے کہا کہ وہ گاڑی روکیں اور ہمیں کسی وردی والے سے بات کرنے دیں۔ انہوں نے سنی ان سنی کر کے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس دوران عذرا نے جو بائیں طرف بیٹھی تھی ایک سنسان موڑ پر دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی میں نے اسے دور تک کنارے کی مٹی میں لڑھکنیاں کھاتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھی عذرا والا قدم اٹھاتی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے بے بس کر دیا۔ اس کے دوسرے آہنی ہاتھ نے میرے منہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ جلد ہی دم گھٹنے کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آیا تو میں ایک ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ وال کلاک بتا رہا تھا کہ میں تقریباً چار گھنٹے بعد ہوش میں آئی ہوں۔ اجنبی چار دیواری میں جوان لڑکی کے گزارے ہوئے چند لمحے بھی ناقابل معافی ہوتے ہیں۔ میں تو کئی گھنٹے گزار چکی تھی۔ میں اب اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جو صبح کالج جانے کی آڑ میں اپنے محبوب سے ملنے نکلی تھی۔ اس روئے زمین پر کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں۔ پشیمانی اور ندامت کے منحوس پرندے اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میری ناتواں پلکوں پر بسیرا کر چکے تھے۔ اب ان پلکوں کو کبھی اس بوجھ سے آزاد نہیں ہونا تھا۔ ہر سپنا ٹوٹ گیا تھا۔ تصور کی سب تتلیوں کے رنگ اڑ چکے تھے۔ پھر آہٹ ہوئی اور کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے بے ہوشی اور غنودگی کی درمیانی حالت میں دیکھا کہ میری بوڑھی والدہ روتی آنکھوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہیں۔ مجھے سینے سے لگا رہی ہیں۔ سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں ٹوٹے برتن کے ٹکڑوں کی طرح ان کے ہاتھوں سے گر گر جا رہی تھی۔ صدمے کی زیادتی سے ایک بار پھر میں بے ہوش ہو گئی.......... اس مرتبہ آنکھ اپنے گھر میں کھلی۔ مجھے تیز بخار تھا اور میری ماں اور بہن مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ اگلے چند روز میں نے عجیب

خوابناک سی کیفیت میں گزارے۔ ٹرنکولائزر دواؤں سے ذہن پر غنودگی طاری رہی تھی۔ میں جان چکی تھی کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے اور میں کیسے یہاں پہنچی ہوں۔ میرے اغوا کے تین گھنٹے بعد کسی نے میرے گھر والدہ کو پیغام بھجوایا کہ اس کی بیٹی فلاں ہوٹل کے فلاں نمبر کمرے میں موجود ہے۔ وہ خاموشی سے آئے اور اسے وہاں سے لے جائے۔ اگر پولیس کو درمیاں میں لانے کی کوشش کی تو لڑکی کی جگہ اس کی لاش بھی مل سکتی ہے۔ جو بدنامی ہوگی وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس دوران عذرا بھی ایک خدا خوف رکھنے والے کی مدد سے گھر پہنچ چکی تھی۔

اس کی والدہ نے آکر میری والدہ کو ساری صورت حال بتائی۔ میری والدہ روتی بلکتی اس ہوٹل میں پہنچی اور میری زندہ لاش کو ٹیکسی میں ڈال کر خاموشی سے گھر لے آئی۔ سفید پوش گھرانوں کیلئے نیک نامی ہی سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ سب کچھ لٹ جائے تو بھی وہ نیک نامی بچانے کی کوشش کرتے ہیں.......... اس مہینے ہم نے خاموشی سے کراچی کو خیر آباد کہہ دیا اور حیدر آباد چلے گئے۔ دھیرے دھیرے حالات معمول پر آنے لگے۔ ہم دونوں بہنیں بوتیک ڈریس ڈیزائن کرتی تھیں اور ہماری والدہ ان کی سلائی کرتی تھیں اس سے ہمیں معقول آمدنی ہوتی تھی۔ نہ صرف ہم کراچی جیسے شہر میں ایک کشادہ مکان کا کرایہ دیتی تھیں بلکہ دیگر اخراجات بھی بہ احسن طریق پورے ہوتے تھے۔ حیدر آباد میں شروع شروع میں تو دشواری پیش آئی' تاہم جلد ہی ہمارا کیا ہوا کام بکنے لگا۔ جسم و جان کے زخم مندمل ہونے لگے۔

اندھیروں میں سویرے کی جھلک نظر آنے لگی۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس صدمے کو خاموشی سے جھیل کر اور قانونی جھمیلوں میں نہ الجھ کر شاید ہم نے اچھا ہی کیا ہے۔ ہماری یہ خاموشی ایک نئی زندگی کے دروازے ہم پر کھول رہی تھی۔ ایسی زندگی جس میں ماضی کی متعفن لاش سے اٹھنے والی بو کا گزر نہیں تھا.......... مگر یہ سب ہماری خام خیالی تھی۔ ایک روز میں دفتر پہنچی تو (میں نے ایک پرائیویٹ ادارے میں جز وقتی ملازمت بھی کر رکھی تھی) مجھے بذریعہ ڈاک ایک بھاری لفافہ ملا۔ اُس لفافے میں ان تین گھنٹوں کی تصویریں تھیں جو میری "زندگی کے جسم" پر تین سرطانی پھوڑوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ زمین و آسمان میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ جی میں آیا کہ خودکشی کر لوں مگر

خودکشی میرے گھرانے کو بدنامی کے داغ سے بچا نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے قفس میں بہت سر پٹخا' بہ زبان خاموش بہت چیخی چلائی مگر رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئی.......... پھر مجھے وقفے وقفے سے گمنام ٹیلی فون ملنے لگے۔ پتہ نہیں کیوں کوشش کے باوجود میں اس بارے میں والدہ اور بہن کو کچھ نہیں بتا سکی۔ سب کچھ خاموشی سے جھیلتی رہی۔ شاید میں اپنے گھر کا وہ عارضی سکون چھیننا نہیں چاہتی تھی' جس کے شکرانے میں میری والدہ دن رات سجدے کرتی تھیں' اور جس کی سلامتی کیلئے آٹھوں پہر دست بہ دعا رہتی تھیں۔ مجھے بلیک میل کرنے والا سالار نامی ایک شخص تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں کسی طرح دس ہزار روپے کا انتظام کر دوں تو وہ تصویریں بمعہ نیگیٹو میرے حوالے کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے یہ تصویریں پانچ ہزار روپے میں خریدی ہیں۔ میں بھولپن کے سبب اس کی باتوں میں آگئی اور رقم اکٹھی کرنے میں لگ گئی۔ اس دوران اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس سے ملوں اور تمام باتیں تفصیل سے طے کر لوں۔ میں ایک روز اس کے بتائے ہوئے پتے پر اس سے ملنے پہنچی۔ یہ گھر سے نکلنے والا میرا آخری قدم تھا۔ پھر میں کبھی اپنوں کی صورتیں نہیں دیکھ سکی' نہ ہی لوٹ کر واپس جا سکی۔ سالار مکروہ چہرے والا ایک سیاہ رنگ انتہائی مکار شخص ہے۔ میں اس کے جال میں چڑیا کی طرح پھنس کر رہ گئی۔ وہ پہلے مجھے کئی روز حیدر آباد میں لئے پھرتا رہا پھر لاہور لے آیا۔ میں نے کئی دفعہ بھاگنے کا سوچا لیکن ہر مرتبہ ماضی کے وہ تین گھنٹے میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ اس زنجیر نے میرے ہر ارادے کو پابند اور ہر فیصلے کو معطل کر دیا۔ میں حالات کے تند دھارے میں ایک حقیر سنگ ریزے کی طرح لڑھکنے لگی.......... لہر لہر' شہر شہر۔ اس مکروہ چہرہ سالار نے مجھے عورت کا سب سے گھناؤنا روپ دے دیا۔ طوائف کا روپ اب میں ایک طوائف ہوں۔ ماضی سے میرا ہر ناطہ کٹ چکا ہے۔ میرا کام اب صرف سالار کے اشاروں پر ناچنا ہے۔"

اپنی روئیداد کے اس مرحلے پر پہنچ کر زرینہ عرف عشرت نے آنسوؤں کے دھارے اپنی اوڑھنی میں جذب کئے اور اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ چھولداری سے باہر دور کہیں جنگلی کتوں اور گیدڑوں کی طویل آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان آوازوں میں کبھی کبھی ایک پرہول آواز شامل ہو جاتی تھی جس کے بارے سرشام

ہمارے پہریدار نے بتایا کہ یہ بھیڑیئے کی آواز ہے۔ پڑاؤ کے گرد آگ بدستور روشن تھی۔ شب کا سناٹا اتنا گھمبیر تھا کہ شعلے بھی سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے تھے۔ زرینہ عشرت نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

"شاہدہ' میرا دل چاہتا ہے' آج تم سے کچھ نہ چھپاؤں۔ تم میرے بارے اتنا ہی جاننے لگو جتنا میں اپنے بارے خود جانتی ہوں۔ شاید اس طرح میرے دل کو کچھ سکون ملے.......... شاہدہ' تمہارا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ میں یہاں کسی کی بھیجی ہوئی آئی ہوں۔ مجھے بھیجنے والا سالار ہی ہے۔ اب وہ کوئی بھوکا ننگا شخص نہیں۔ نئی کار میں گھومتا ہے۔ بوسکی کے سوٹ اور ہزار ہزار روپے کی جوتی پہنتا ہے۔ بڑا "خوشحال ہے" وہ۔ اس کے تعلقات بہت سے جرائم پیشہ لوگوں سے ہیں۔ ان میں ہی سے کوئی شخص بازوں عقابوں وغیرہ کے چکر میں ہے۔ وہ علاقے کے زمینداروں کے متعلق سن گن لینا چاہتا تھا۔ سالار مجھ سے پہلے بھی ایسے کام لیتا رہا ہے لہٰذا اس نے مجھے شاہ دین کی طرف بھیج دیا لیکن یہ کام اس طرح کیا گیا کہ شاہ دین سمجھتا ہے کہ وہ خود مجھے لے کر آیا ہے۔ اس نے مری میں سالار کے ایک دو کارندوں کی پٹائی بھی کی تھی اور اپنی مردانگی پر اب تک فخر کرتا ہے۔ وہ سب ایک ڈرامہ تھا۔"

(میں اس ڈرامے کے بارے جانتی تھی۔ سلیم نے مجھے بتایا تھا کہ "شاہ دین اور عشرت" سے اس کی ملاقات مارکٹائی کے سلسلے میں ہوئی تھی) میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

"عشرت' تمہاری ماں بہن اب کہاں ہیں؟"

وہ بولی "انہیں میرے بارے میں کوئی خبر نہیں لیکن مجھے ان کے بارے تھوڑا بہت پتہ چلتا رہتا ہے۔ کوئی تین سال پہلے وہ بھی حیدر آباد سے لاہور آگئی تھیں۔ حیدر آباد میں ہی میری بہن ثمینہ کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ وہ لاہور کی ایک تعلیم یافتہ فیملی میں بیاہی گئی ہے۔ شوہر ڈاکٹر ہے۔ اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ اللہ اچھا رکھے۔ امی جان نے لاہور میں ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کھول رکھی ہے۔ وہ صرف خواتین کے کپڑے بیچتی ہیں اور خود ہی دکان پر کام بھی کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے محنتی رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے دکھوں کا علاج ہمیشہ سخت محنت میں ڈھونڈا ہے۔ میں ایک دفعہ برقعہ پہن کر ان کی دکان پر بھی گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہاں کاروبار چلانے والا کوئی مرد ہوگا اور میں نقاب کی اوٹ سے ماں کو اچھی طرح دیکھ سکوں گی۔ مگر وہاں سیلزمین کی جگہ بھی ایک عورت ہی کام کر رہی تھی میں مایوس ہو کر واپس آگئی.........."

اچانک عشرت کو چپ ہونا پڑا۔ شب کے سناٹے میں گھوڑوں کی تیز ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ٹاپوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک ہی گھوڑا ہے اور سیدھا پڑاؤ کی طرف آرہا ہے۔

"کون ہو سکتا ہے؟" ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونجا۔ عشرت کے پاؤں میں تو سخت موچ آئی ہوئی تھی میں اٹھ کر چھولداری کے دروازے کی طرف گئی۔ گھوڑا پڑاؤ میں پہنچ چکا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ پڑاؤ میں آکر بھی رکا نہیں تھا چاروں طرف بھاگتا پھر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے چھولداری کے در کی رسی کھول کر موٹا پردہ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ گھوڑا سوار کے بغیر ہے اور غالباً زخمی بھی ہے۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

یہ گھوڑا یقینی طور پر اپنے سوار کو گرا کر یہاں پہنچا تھا اب بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہا تھا۔ غالباً وہ خود بھی زخمی تھا۔ گھوڑے کی مچائی ہوئی ہڑبونگ سے سب لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ گھوڑے کو لگام سے تھام کر روکا گیا۔ وہ زور زور سے ہنہنا کر پچھلی ٹانگوں پر اچھل رہا تھا میں نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ اس کی بائیں ران پر گہرا زخم تھا۔ ہمارے پڑاؤ میں موجود ایک جہاندیدہ شخص نے مشعل کی روشنی میں اس زخم کو بغور دیکھنے کے بعد دعویٰ کیا کہ یہ بھیڑیئے کے کاٹنے سے آیا ہے۔ اس اطلاع نے سب میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ زخم بھیڑیئے کے کاٹنے سے آیا تھا یا نہیں مگر وقتی طور پر سب نے خوف محسوس کیا اور یہ بات کوئی ایسی بعید از قیاس بھی نہیں تھی۔ رات کے آغاز سے ہم کئی دفعہ بھیڑیئے کی آواز سن چکے تھے۔

گھوڑے پر قابو پانے کے بعد اس کے سوار کی تلاش شروع ہوئی۔ امکان یہی تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گرا ہوگا.......... قریباً نصف گھنٹے کے بعد اس کا سراغ مل گیا۔ وہ ہمارے پڑاؤ سے چار فرلانگ دور ایک گڑھے میں بے ہوش پڑا تھا۔ اسے ایک اسٹریچر پر

ڈال کر پڑاؤ میں لایا گیا.......... وہ درمیانی عمر اور اچھے قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس نے دیہاتی لباس پہن رکھا تھا۔ اسٹریچر پر اس کا پستول اور گولیوں سے بھری ہوئی بیلٹ بھی رکھی تھی۔ اس کے بائیں رخسار پر شدید رگڑ آئی تھی۔ ساری جلد چھلی ہوئی تھی منہ میں بھی خون بھرا تھا۔ اچھی طرح معائنہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ زبان دانتوں تلے آکر بری طرح زخمی ہوگئی ہے۔ ہماری شکار پارٹی میں ایک سابق سرکاری ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے فرسٹ ایڈ باکس منگوایا اور مضروب کے منہ سے بہتا ہوا خون بند کیا اس کے بعد ضروری مرہم پٹی کر دی۔ ان کے خیال میں زبان پر ٹانکے لگنے ضروری تھے مگر فی الفور ٹانکے لگانے کا سامان موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد مضروب ہوش میں آگیا پہلے حیران نظروں سے اردگرد دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور کچھ بولنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں زبان نے حرکت کی اور وہ کراہ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے ہدایت کی کہ وہ بولنے سے پرہیز کرے کیونکہ وہ "شے" زخمی ہے جو اسے بولنے میں مدد دے سکتی ہے۔ باقی کی رات ہم نے نامعلوم بھیڑیئے کے خوف میں سوتے جاگتے گزار دی۔ اس بھیڑیئے سے یا کسی بھی بھیڑیئے سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی مگر میرے تصور میں آج تک وہ رات زندہ ہے جب ہرپل میں نے ایک خون آشام درندے کا سایہ اپنے اردگرد محسوس کیا۔ یاد رہے کہ میں اصلی بھیڑیئے کی بات کر رہی ہوں۔ ورنہ انسانی روپ میں تو لاتعداد بھیڑیئے میں نے دیکھے ہیں جو اپنی حرص و ہوس کے پنجوں سے ہر زندہ جسم کو ادھیڑنے کی فکر میں رہتے ہیں اکیلی عورت ان کے لئے لقمہ تر ہوتی ہے اور اسے ہڑپ کرنے کی آرزو میں ان کی سرخ زبانیں منہ سے نکل کر زمین پر گھسٹتی رہتی ہیں۔

صبح دم خان رحیمی اور شاہ دین وغیرہ اپنی مہم سے واپس آگئے وہ ایک شاندار باز پکڑنے میں کامیاب رہے تھے۔ خان رحیمی اس فتح پر مسرور نظر آتا تھا۔ نوگرفتار شدہ باز ایک پنجرے میں بند تھا اور خان رحیمی کی نگاہیں پنجرے سے ایسے چپکی ہوئی تھیں جیسے مقناطیس سے لوہ چون۔ وہ ہر ہر زاویئے سے پرندے کو دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ شہد خور باز کہلاتا ہے۔ شہد کے علاوہ چوہے، سانپ خرگوش حشرات غرض ہر چیز ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک ایسے ہی باز کو چالیس میٹر کی بلندی سے جھپٹ کر ایک چھوٹے سے کاکروچ کو پکڑتے دیکھا تھا۔

خان رحیمی زخمی دیہاتی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے اس بارے میں تفصیل بتائی گئی۔ میں نے اسے کل شام عشرت کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے متعلق بھی بتایا اور سولنگی کی بدتمیزی کا ذکر کیا۔ خان رحیمی نے ان دونوں واقعات سے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ اس کا سارا دھیان باز کی طرف تھا یا پھر واپس جانے کی طرف اس کا خیال تھا کہ وہ کافی لیٹ ہوگئے ہیں۔ انہیں کل رات ہی کوٹھی پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ شہر سے ایک مہمان کی آمد متوقع تھی.......... خان رحیمی کی ہدایت پر ملازموں نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور خیمے وغیرہ گرا کر چھکڑوں پر رکھ دیئے۔ ہلاک شدہ سوروں کی دموں کو کاٹ کر بطور نشانی محفوظ کر لیا گیا۔ جو دیگر چھوٹے چھوٹے جانور شکار ہوئے تھے ان میں سے قابل استعمال کو رات ہی ڈنر کا "حصہ" بنا لیا گیا تھا باقی کی کھالیں اتار کر اور مسالہ وغیرہ لگا کر رکھ لی گئیں.......... نو بجے ہماری پارٹی شکارگاہ سے روانہ ہو کر دوپہر ڈیڑھ بجے کوٹھی پہنچی۔ وہاں مہمان نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ ہاں مہمان کے استقبال کے لئے خان رحیمی جو ہدایات دے گیا تھا ان پر پوری طرح عمل ہوا تھا۔ سلیم اب بھی کوٹھی کے صدر دروازے پر وردی پوش ملازموں کے ساتھ ایک رنگین چھتری لئے موجود تھا۔ پورچ سے کوٹھی کے اندرونی حصے تک مخمل جیسی وہ طویل سرخ پٹی بھی بچھی ہوئی تھی جس پر مہمان کو قدم قدم چل کر ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہونا تھا۔

خان رحیمی، سلیم سے سوال جواب میں مصروف ہوگیا جبکہ ہم سب کوٹھی میں چلے گئے۔ زخمی دیہاتی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اسٹریچر پر لدا ہوا تھا اس کے علاوہ عشرت کو بھی گھوڑے سمیت اس کے بیڈ روم تک پہنچایا گیا۔ موچ کی وجہ سے وہ نازک اندام دو قدم بھی نہ چل سکتی تھی کوٹھی کے سن رسیدہ ڈاکٹر مرزا ہمایوں نے پہلے عشرت کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ دیہاتی کی زبان پر ٹانکے لگانے کے درپے ہوگیا۔ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔ زبان پر ٹانکے لگانے میں بیچارے کو دانتوں پسینے آگئے۔ لگوانے والے کا کیا حال ہوا ہوگا وہ بھی ظاہر ہے۔ پانچ چھ ٹانکے لگنے کے بعد وہ شخص کچھ غوں غاں کرنے کے قابل ہوا۔ تاہم اس کی بات سمجھنا اب بھی مشکل تھا۔ زبان کی سلائی کے بعد جب مرزا ہمایوں نے مضروب کے چھلے ہوئے چہرے پر ہائیڈروجن کا محلول ڈالا تو وہ اچھل اچھل کر دھاڑنے لگا۔ مرزا ہمایوں نے اسے بار بار ڈانٹ پلائی مگر اس نے احتجاج جاری

رکھا۔ یہ تمام شور و غل خان رحیمی کو سخت زچ کر رہا تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے سے لاہور ٹرنک کال کرنے میں مصروف تھا یہ ٹرنک کال اسی مہمان کے سلسلے میں ہو رہی تھی جسے آنا تھا مگر نہیں آیا تھا۔ زخمی کے واویلے سے جھنجلا کر خان رحیمی دندناتا ہوا چلا آیا۔ اس نے دیہاتی کو سخت سست کہا۔ غالباً کچھ اور بھی کہتا مگر دیہاتی نے ہاتھوں کے مسلسل اشاروں سے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ ان اشاروں کے ساتھ ساتھ اب وہ زبان سے بھی ٹوٹے پھوٹے لفظ ادا کر رہا تھا۔ اس کی چہرے پر گھبراہٹ کی بجائے غصہ تھا۔ اچانک زخمی کا کہا ہوا کوئی لفظ خان رحیمی کی سمجھ میں آیا اور وہ بری طرح چونک گیا اس نے پوری توجہ سے زخمی کی غوں غاں سنی اور سمجھ گیا کہ یہی وہ مہمان ہے جس کے انتظار میں وہ اور کوٹھی کا سارا عملہ کل سے سوکھ رہا ہے۔ اس نے مرزا ہمایوں کو قہر آلود نظروں سے گھورا جس نے دیہاتی کے بال باقاعدہ مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ مرزا ہمایوں ڈر کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ خان رحیمی اور دیہاتی باتیں کرنے لگے۔ خان رحیمی نے اس موقعے پر میرے سمیت سب کو کمرے سے نکال دیا۔

یہ ایک نیا ہی چکر چل گیا تھا۔ اس چکر کے بارے سوچتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے کے لئے مہمان خانے کے پاس سے گزری تو چودھری شہاب کا کمرہ خالی پایا۔ ایک ملازم سے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ رات ہی چلا گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ خان رحیمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اس نے چودھری شہاب کو واپس بھیج دیا ہے۔ چودھری شہاب چنگیزیوں کا دشمن نمبر ایک تھا اور اس کی یہاں موجودگی کسی طور مناسب نہیں تھی۔

دیہاتی کے روپ میں یہاں آنے والا مہمان درحقیقت ایک سرکاری ملازم تھا کسی خاص وجہ سے اس نے خود کو چھپانے کی کوشش کی تھی اور عام دیہاتی لباس اور وضع قطع میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا عہدہ ہیڈ کلرک کا تھا اور تعلق شعبہ درآمدات اور برآمدات سے تھا۔ کہنے کو تو یہ شخص کلرک تھا مگر ٹھاٹ باٹھ سیکریٹری یا ڈپٹی سیکریٹری سے کم نہیں تھے۔ لب و لہجے سے لے کر چال ڈھال تک سب کچھ افسرانہ شان کا حامل تھا۔ جیسے ہی اس کی زبان ہلنے جلنے کے قابل ہوئی اس نے اسے ہلا ہلا کر سب ملازموں کا ناک میں دم کر دیا۔ دو تین روز ہی میں وہ ہر کس و ناکس پر یوں حکم چلانے لگا جیسے خان رحیمی نے اسے رعب ڈالنے کا ٹھیکہ دے دیا ہو۔ یہ شخص شکل و صورت سے ہی لپاڈیا نظر آتا تھا۔ لگتا تھا افسران

کی چاپلوسی اور مٹھی چاپی کرنے میں اس نے کافی تجربہ کمایا ہوا ہے۔

اس کی یہاں آمد کا مقصد مجھ پر واضح نہیں تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ کھیل کا آغاز ہو چکا ہے اور جلد یا بدیر مرغی خانے میں موجود پرندوں کو تہہ خانے سے نکال کر کہیں لے جایا جائے گا۔ خان رحیمی اور رئیس احمد گھنٹوں کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے.......... اور پھر ایک روز خان رحیمی نے مجھ پر انکشاف کیا کہ پرندے لاہور جا رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ تمام انتظام ہو چکا ہے۔ اس مقصد کے لئے دو گاڑیوں کا انتظام کیا گیا ہے اور یہ گاڑیاں دو پھیروں مین پرندے لاہور پہنچا دیں گی۔ میں نے خان رحیمی سے پوچھا۔

"آپ جس سرکاری ملازم کا ذکر کر رہے تھے کیا وہ یہی شخص ہے؟"

خان رحیمی نے کہا "نومائی ڈیئر' یہ تو اس کے کارندے کا کام کر رہا ہے۔ اصل آدمی لاہور میں بیٹھا ہے۔ میں ابھی تک اس کے کوائف سے پوری طرح آگاہ نہیں لیکن شک ہے کہ وہ کامرس منسٹری کا کوئی انڈر سیکریٹری ہے۔"

میں نے پوچھا "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

وہ بولا "تیل دیکھو' تیل کی دھار دیکھو۔"

دوسرے روز کی بات ہے میں نے دیکھا کہ دینو کوٹھی کے پچھلے لان میں واقع ہینڈ پمپ چلا رہا ہے۔ ہینڈ پمپ کبھی کبھار ہی استعمال ہوتا تھا لہٰذا پانی کھینچنے میں سخت دشوار ہوتی تھی۔ بازو چلا چلا کر دینو کا برا حال ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ غصے میں بڑبڑا بھی رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا ہوا دینو؟"

وہ بھنا کر بولا "ہونا کیا تھا جی۔ وہ جو لاٹ صاحب کی دم آئی ہوئی ہے یہاں۔ عزت ماب مابدولت رئیس احمد بارا صاحب۔ کہندا ہے ٹینکی کا پانی مجھے پسند نہیں میرے لئے نلکے سے تازہ پانی لاؤ۔ بندا پوچھے ساری کوٹھی یہی پانی پیندی ہے وہ آسمان سے اترا ہوا ہے۔ پری زاد کہیں کا۔ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا۔"

میں دینو کے غصے کی وجہ سمجھ گئی اسے مہمان کے پینے کے لئے ہینڈ پمپ سے پانی لے جانا پڑتا تھا۔ میں نے کہا "دینو! ایسے نہیں کہتے۔ وہ افسر آدمی ہے۔ افسر ایسے ہی

ہوتے ہیں۔"

وہ بھڑک کر بولا۔ "آخ تھو ایسے افسر پر۔ افسر تو ہوندا ہے خدمت کرنے والا۔ خدمت کرانے والا تو حاکم ہوندا ہے۔ پانچ روز سے یہ خبیث مجھ سے نلکا چلوا رہا ہے۔ اب تو نلکا چلانے کے بعد بھی میرا بازو نلکا ہی چلاندا رہندا ہے۔ خیر وہ خبیث ہے تو میں بھی بڑا کمینہ ہوں۔ صاف پانی تو میں نے بھی ایک بار نہیں دتا اس کو۔ گند ہی پیتا رہا ہے۔"

"کیا مطلب!" میں نے پوچھا۔

"ابھی دسدا ہوں آپ کو۔ میں کوئی ڈرتا نہیں ہوں کسی سے۔"

اس نے زور لگا کر پانی نکالا۔ جگ بھرا پھر اس میں دو تین بار تھوکا اور بڑبڑاتا ہوا تیز قدموں سے مہمان خانے کی طرف چل دیا۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔

"ٹھہرو" میں نے آواز دے کر کہا۔ وہ رک گیا۔ "نہیں دینو' یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "برے کے ساتھ برے نہیں بن جاتے۔ گراؤ یہ پانی۔"

"نہیں جی' میں تو نہیں گراؤں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "یہی پلاؤں گا اس باہمن کو۔"

میں نے اسے پچکارا۔ "دینو! کم از کم میرے سامنے تو ایسا نہ کرو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "نہیں' میں تو ایسا ہی کروں گا۔ اگر آپ کو اتنا ہی درد ہے اس کا تو خود لے جائیں پانی۔"

وہ بڑا جھنجلایا ہوا تھا میں سمجھ گئی کہ بحث فضول ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جگ لے کر پانی گرا دیا اور دوسرا بھرنے لگی...... پانی لے کر مہمان خانے پہنچی تو رئیس احمد مہمان خانے کے لان میں آرام کرسی ڈالے دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے پاس ہی انگریزی کا اخبار رکھا تھا جسے وہ پڑھتا کم اور گھورتا زیادہ تھا۔ (گھورنے کے لئے اس میں عورتوں کی بہت سی رنگین تصویریں موجود تھیں) مجھے دیکھ کر اس نے ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑیں مجھ پر ہی کیا موقوف کوٹھی کی ہر عورت کو وہ ایسے ہی دیکھتا تھا۔ خان رحیمی کی خاطر اب سب مرد و زن اس کی بیہودگیاں خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے تھے۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟" اس نے افسرانہ شان کے ساتھ اپنی کنپٹی انگلی سے

ٹھونک کر کہا۔

"شاہدہ" میں نے مختصر جواب دیا۔

"شاہدہ!" اس نے میرے نام کو چبا چبا کر ادا کیا۔ کچھ دیر بے باکی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "اس وقت فارغ ہو؟"

میں نے کہا "فارغ تو نہیں...... لیکن فرمائیے۔"

وہ بولا۔ "کل اس بدبخت دینو سے سر کی مالش کرائی تھی اب تک کھوپڑی میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ یوں ہاتھ چلاتا ہے جیسے ہتھوڑے چلا رہا ہو۔ اوپر سے گلابی اردو بول بول کر جان عذاب میں ڈال دیتا ہے...... یہ میز کے نیچے تیل کی شیشی پڑی ہے تھوڑی سی مالش کر دو۔ شاید طبیعت کچھ سنبھل جائے۔"

میں نے پوچھا "اور اس پانی کا کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا "ادھر دے آؤ باورچی خانے میں وہ کیا نام ہے اس کا...... سلطانہ سے کہنا میری چائے میں یہی پانی ڈالے۔"

پانی دے کر میں واپس آئی اور رئیس احمد کے سر کی مالش کرنے لگی۔ وہ مجھ سے بھی عام ملازموں کی طرح بے تکلف لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ سر کی مالش کے بعد اس نے کہا کہ میں اس کے ہاتھوں پاؤں کی انگلیاں کھینچ کھینچ کر ان کے پٹاخے نکالوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شاعرانہ گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھا کہنے لگا "اچھی لڑکی ہو تم۔ مجھے تو لگتا ہی نہیں شادی شدہ ہو۔ تمہارے جیسی تو فرسٹ سیکنڈ ائر میں ہوتی ہیں۔ کیوں اس بڈھے کے پاس خود کو برباد کر رہی ہو۔ شہر کا موج میلہ دیکھو تو ہوش اڑ جائیں تمہارے۔ کتنا پڑھی ہوئی ہو؟"

میں نے کہا "جی ایف اے کیا ہے۔"

وہ بولا "اوہ مائی گاڈ! ایف اے کر کے اور اتنی خوبصورتی سمیٹ کر تم اس ذلیل کوٹھی میں پھنسی ہوئی ہو۔ تمہیں تو ایک پل یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ میں آج ہی بات کرتا ہوں رحیمی سے۔"

"کیسی بات؟"

"بھئی تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ اچھے اور قدردان لوگوں سے ملواؤں گا۔ تم شہر کی

سوشل لائف میں انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہو۔ دفع کرو اس آسیب زدہ کوٹھی کو............"

میں جان رہی تھی کہ یہ لعنتی شخص مجھے کیا سمجھ رہا ہے۔ اس کی نظروں میں میں ایک ایسے منقش اگالدان کی طرح تھی جو بیچ چوراہے کے پڑا تھا اور جس میں کوئی بھی تھوک سکتا تھا۔ جی چاہا اپنی انگلیوں سے اس کی چمکدار آنکھیں نوچ لوں مگر پھر خان رحیمی کی ہدایات یاد آگئیں اور میں دل مسوس کر رہ گئی۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ بولا۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ چلو گی نا؟"

نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر اقرار میں ہلا دیا۔

............اسی روز سہ پہر کی چائے پر جب خان رحیمی سے اکیلے میں بات ہوئی تو میں نے اسے سارا واقعہ بتا دیا اور کہا کہ اگر رئیس احمد مجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو آپ مجھے جانے دیں۔ اس طرح ان لوگوں کے عزائم جاننے میں مزید آسانی ہو جائے گی۔"

خان رحیمی کو میری یہ بات بری لگی۔ اس نے کہا "گرل! میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم کو اس طرح اپنے مقصد کیلئے استعمال کروں.......... اٹ از ناٹ فیئر۔ اس اس باسٹرڈ رئیس احمد نے ایسا کیوں سوچا۔"

میں نے کہا "سر! کسی کے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ انسان وہی ہوتا ہے جیسا وہ اپنے آپ کو تصور کرتا ہے۔ میں وہ کیسے ہو سکتی ہوں جو مجھے رئیس احمد تصور کر رہا ہے۔"

وہ بولا "گرل! اس میں بہت رسک ہے تم اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈال رہی ہو۔ معلوم نہیں وہ کیسے لوگ ہیں۔ کیا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"سر! آپ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ مجھے یقین ہے میں دھوکا نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی بھٹکوں گی۔ میرا بچہ مر کر میرا سب کچھ لے گیا ہے لیکن ایک نہ ختم ہونے والا اعتماد دے گیا ہے۔ یہ اعتماد مجھے رسوا نہیں ہونے دے گا۔ آپ یقین رکھیں۔"

خان رحیمی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا "گرل! ایک ہی دائرے میں جینا اچھا نہیں ہوتا۔ تمہارا بچہ ایک حقیقت تھا مگر تمہاری زندگی اب بھی ایک حقیقت ہے۔ عورت کے بہت سے روپ ہیں اور ہر روپ کی اپنی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کو سمجھنے

کی کوشش کرو............"

میں خاموشی سے خان رحیمی کی باتیں سنتی رہی۔ گفتگو کا یہ سلسلہ مختلف موضوعات کا احاطہ کرتا ہوا اختتام پذیر ہوا تو ہم دونوں میں یہ طے ہو چکا تھا کہ مجھے ہر صورت رئیس احمد کے ساتھ شہر جانا ہے۔

رات بہت سرد تھی۔ ہوا بند کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے سیٹیاں بجاتی گزرتی تھی۔ میں بستر پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹی ہوئی تھی کہ پھر وہی منحوس آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ جو میری شب بھر کی نیند اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتی تھی۔ یہ سلیم کے بہکے قدموں کی آہٹ تھی۔ وہ زور زور سے کھنکار رہا تھا تاکہ مجھے اس کی موجودگی کا علم ہو۔ اسے دیکھے بغیر اس کی سانس سونگھے بغیر ہی میں بتا سکتی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میرا دل دہل گیا۔ آج اس کے قدم عشرت کے کمرے کی طرف جانے کی بجائے میرے دروازے پر آگئے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ دروازہ نہ کھولوں مگر دوسری دستک ہوئی تو اٹھنا پڑا۔ اس کی یہ پر شور دستک کوٹھی میں ہنگامہ جگا سکتی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ لڑکھڑا کر اندر آگیا۔ آج بھی اس کی آنکھیں کبوتر کا خون ہو رہی تھیں۔ بدبو سے بچنے کیلئے میں کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ پھنکارا "خیر سے کب جا رہی ہو اپنے نئے خریدار کے ساتھ؟"

میں سمجھ گئی اس کا اشارہ رئیس احمد کی طرف ہے۔ وہ پوری صورت حال جان چکا تھا۔

میں نے کہا "سلیم، تم ہوش میں نہیں ہو۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"میں بھی تم پر تھوکنا نہیں چاہتا۔" وہ غرایا "لیکن ایک بات یاد رکھو میرے دل سے نکلی ہوئی بددعا تمہیں زندگی بھر چین سے نہیں رہنے دے گی۔ یاد رکھنا میری آہ تمہارا پیچھا کرے گی۔ قبر کی دہلیز تک اور اس کے بعد بھی۔ تم نے مجھے برباد کیا ہے۔ ناگن بن کر مجھے ڈسا ہے۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔"

نہ جانے کیوں وہ منظر میری آنکھوں میں چمک گیا جب اینٹوں کے بھٹے کی تنگ و تار کوٹھڑی میں وہ بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اور میں صرف ایک گرم چادر اوڑھے زمین پر لیٹی تھی۔ اس گھڑی کتنا مہربان نظر آتا تھا وہ، کتنا ہمدرد اور مخلص۔ ناقابل یقین حد تک نیک۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے اسے کیا ہو جاتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر اتنا سنگدل بن جاتا تھا۔ میں نے کہا۔

"سلیم بہتری اس میں ہے کہ تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ دوسری صورت میں ہم دونوں نقصان اٹھائیں گے۔"

وہ دانت پیس کر بولا "تم کیا نقصان اٹھاؤ گی بڑی سے بڑی بدنامی اب تمہارا کوئی نقصان نہیں کر سکتی۔ تمہیں تو بے غیرتی کا "اجازت نامہ" مل چکا ہے۔ جس شخص کے ساتھ چاہو جا سکتی ہو۔ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ ابھی تو ابتداء ہے۔ آگے آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ رئیس احمد تمہیں تہجد گزار بنانے کیلئے شہر نہیں لے جا رہا۔ نہ ہی وہ دو بول پڑھا کر تمہیں گھر میں بٹھائے گا۔ وہ تمہیں چمکا دمکا کر دیکھنے والی چیز بنائے گا اور اس دیکھنے والی چیز کو دیکھ دیکھ کر لوگ انگلیاں دانتوں میں دبائیں گے۔ واہ........... واہ کیا انجام ہے ایک عورت کی پارسائی کا۔ یہی وہ عورت ہے نا جو گھر سے منہ باہر نہیں نکالتی تھی۔ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی رہتی تھی اور بات کرتی تھی تو لگتا تھا وظیفے پڑھ رہی ہے۔ آج اس عورت سے علی الاعلان کہا جاتا ہے کہ تو برائے فروخت ہے تو اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ خود کو گالی دینے والے کا منہ توڑنے کی بجائے اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہے۔"

سلیم کی باتیں میرے کانوں میں دہکتی ہوئی سلاخوں کی طرح اتر گئیں۔ میں کوشش کے باوجود خود پر ضبط نہ رکھ سکی۔ میرا ہاتھ گھوما اور چٹاخ سے اس کے رخسار پر پڑا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یوں لگا جیسے میں نے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی سنگلاخ بت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ یہ طمانچہ سلیم کی نہیں خود میری توہین تھا۔ اپنی توہین کا منظر مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

وہ زہریلے لہجے میں پھنکارا "میں جانتا ہوں، تمہارے پاس میرے لئے تھپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں اور مجھے تم سے کچھ چاہیے بھی نہیں۔ بہت کچھ ہے میرے پاس اور

بہت کچھ مل سکتا ہے۔ تیرے جیسیاں راستوں میں پلکیں بچھائے رہتی ہیں۔ یقین نہیں تو چل آ میرے ساتھ میں دکھاؤں تجھ کو۔"

اس نے بڑی نفرت سے دیوار پر تھوکا اور مجھ پر لعنت بھیجتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

"کہا جا رہے ہو؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ گھوما "وہیں جہاں جا رہا ہوں۔ جہاں سکون ہے جہاں طمانچے نہیں ہیں۔"

وہ عشرت کے پاس جا رہا تھا اور آج عشرت تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ شاہ دین ٹوانہ بھی تھا' جس کی حیثیت اس کے شوہر سے کم نہیں تھی۔ وہاں جا کر سلیم مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ ممکن تھا کوئی زبردست ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ میں نے اس کا دامن کھینچا "سلیم! نشے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم جانتے ہو شاہ دین آ چکا ہے۔ وہ تمہیں گولی مار دے گا۔"

"ہاں.......... گولی مار دے گا۔ لاش کو کون گولی مارتا ہے۔ اور میں تو لاش ہوں ساری دنیا کے قاتل مل کر بھی ایک مرے ہوئے شخص کو دوبارہ نہیں مار سکتے۔"

میں نے سختی سے کہا "رک جاؤ سلیم۔ یہ اچھا نہیں ہوگا۔"

وہ پھنکارا "تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔ تمہارے پاس کیا ہے مجھے روکنے کیلئے؟ کچھ بھی نہیں۔ تھپڑ اور گالیاں کسی کو نہیں روک سکتے۔"

"سلیم! میں نے کب دی ہے تمہیں گالی؟"

"ہر قدم پر دی ہے۔ ہر روز ہر گھڑی دی ہے۔ تم چار سال سے مجھے گالیاں دے رہی ہو۔"

اس نے باہر جانے کیلئے زور لگایا میں نے اسے روکنے کیلئے کھینچا "رک جاؤ سلیم" میں نے لجاجت سے کہا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ کھینچا تانی میں وہ پلٹ کر میری طرف آیا' میں الٹے قدموں دیوار سے ٹکرائی۔ ایک لمحے وہ مجھے بڑا خونخوار محسوس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے ایک معصوم بچے کی طرح لگنے لگا ایسا بچہ جو حالات کی سنگینی سے گھبرا کر کسی محفوظ گوشے میں دبکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایک میکانکی حرکت کے تحت اس نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے انگارہ ہونٹ میرے چہرے سے ہمکلام ہو گئے۔ اس کے گرم آنسوؤں کا لمس میں نے اپنے رخساروں پر محسوس کیا۔ ایک عجیب وارفتگی تھی اس کے انداز میں۔

"سلیم" میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ نہیں سنا۔ وہ بہرہ ہو رہا تھا.......... میں نے اسے بمشکل دھکیل کر دروازے سے باہر نکال دیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ وہ وہیں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سنا وہ سسکیوں سے رو رہا تھا۔ کچھ دیر رونے کے بعد وہ دھیمے قدموں سے واپس چلا گیا۔ اس تند سیلاب کی مانند جو شور مچاتا آتا ہے اور آہستہ روی سے چپ چاپ لوٹ جاتا ہے۔

علی الصبح میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا وہ ابھی تک برآمدے کے ایک ستون سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا اور آس پاس سگریٹ کے بے شمار ٹکڑے بکھرے تھے۔ کوئی اسے اس حالت میں دیکھتا تو ضرور حیران ہوتا۔ مجھے اس کی رات والی حرکت پر سخت غصہ تھا۔ تاہم جلد ہی یہ غصہ ایک بے نام سی ہمدردی میں ڈھل گیا۔ وہ مجھے ایک نادان بچے کی طرح لگا جو روٹھ کر دروازے کے سامنے بیٹھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کی سب کھڑکیاں بند کر دی تھیں اور دماغ کی بجائے دل سے سوچ رہا تھا۔ اس روز میں نے پہلی بار سلیم کو ایک مختصر خط لکھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"سلیم ایک چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہیں چاہا تھا مگر بہت پہلے میں نے حالات کی یورش کے سامنے ہار مان لی تھی۔ اب میری زندگی کی کتاب سے یہ ورق پھٹ چکا ہے۔ تم بھی اس حقیقت کو سمجھ لو۔ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ میری زندگی اب ایک کانٹوں بھرے مختصر راستے کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم مجھے معاف کر کے کوئی دوسرا ہم سفر ڈھونڈ لو۔ یہ سمجھ لو کہ اپنے بچے کے ساتھ میں خود بھی مر چکی ہوں.......... جہاں تک تمہارے الزامات کا تعلق ہے ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ میری زندگی اب صرف ایک انتقام کی خاطر ہے۔ میرا اٹھایا ہوا ہر قدم اسی ایک منزل کی طرف جاتا ہے۔ میں یہاں رہوں' شہر چلی جاؤں' یا دنیا کے کسی اور حصے میں پہنچ جاؤں میں اب ایک ماں ہوں صرف ماں۔ رئیس احمد یا کوئی دوسرا شخص میرے

اس روپ کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔" یہ خط لکھنے کے بعد میں نے کسی طرح سلیم تک پہنچا دیا اور اس سے اگلے ہی روز میں رئیس احمد کے ساتھ شہر روانہ ہو گئی۔

لاہور میں اندرون شہر رئیس احمد ایک حویلی نما مکان میں رہتا تھا زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اندر سے خوب سجا سنورا تھا۔ لگتا تھا کلرک رئیس احمد جس کرسی پر بیٹھا ہے وہاں دھن بارش کی طرح برستا ہے۔ رئیس احمد کی دو بیویاں تھیں۔ دوسری شادی اس نے چند ماہ پہلے ہی کی تھی۔ یہ ایک قبول صورت پہاڑی لڑکی تھی۔ گوڑی چٹی اور چھریرے جسم والی۔ بائیں ابرو پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ لڑکی کا نام نگینہ تھا وہ شستہ اردو بولتی تھی اور کافی تیز طرار تھی۔ پہلی عورت فاطمہ ویسی ہی تھی جیسی پہلی عورتیں ہوتی ہیں۔ گم صم' ڈری ڈری' روٹیاں پکانے اور کام کاج کرنے والی۔ اس کے برعکس نگینہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی۔ سارا دن ہمسائیوں سے چخ چخ کرتی سرشام رئیس کے دفتر سے لوٹتے ہی میاں بیوی کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے میں فاطمہ عجیب نظروں سے اس بند دروازے کو دیکھتی۔ اس گھر میں پہنچ کر تصدیق ہو گئی کہ رئیس احمد ایک عیش پسند شخص ہے۔ گھر اور محلے میں اس کا کافی رعب داب تھا۔ اس لئے کوئی اسے روک ٹوک نہیں کرتا تھا۔ پیسہ بھی اس کے پاس کافی تھی۔ چاہتا تو اقبال ٹاؤن یا گلبرگ میں اچھی سے اچھی کوٹھی میں رہ سکتا تھا اور خستہ حال سکوٹر کی بجائے کار پر دفتر جا سکتا تھا۔ لیکن ہیڈ کلرک کیلئے گلبرگ سے کار پر دفتر جانا ممکن نہیں ہوتا سرکاری نوکری اور ظاہری ٹھاٹ باٹھ ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر کے کسی حصے میں قالین بافی کا ایک کارخانہ رئیس احمد کی ملکیت ہے اور وہ دفتر کے بعد سیدھا اس کارخانے میں جاتا ہے۔ رئیس احمد کے گھریلو اخراجات دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اپنی تنخواہ میں تو وہ مہینے کا پہلا ہفتہ بھی بمشکل گزارتا ہو گا۔ اس نے مجھے بڑے دھڑلے سے گھر میں رکھا ہوا تھا دونوں بیویوں میں سے کسی کو جرات نہیں تھی کہ میری موجودگی پر انگلی اٹھا سکتیں۔ ہاں.......... وہ دور دور سے مجھے تیکھی نظروں کی مار مارتی اور سرگوشیاں کرتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر دوسری بیوی بہت چوکنا تھی۔ غالباً" اسے خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ نمبر دو کے بعد نمبر تین بھی آنے والی ہے۔ بہرحال رئیس احمد کے رویے سے کسی ایسی بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا اور وہ اب تک

شرافت سے ہی پیش آ رہا تھا اس نے گھر میں بتایا تھا کہ اس کے نئے افسر کو ایک پڑھی لکھی ملازمہ درکار تھی اور وہ اس سلسلے میں مجھے ڈھونڈ کر لایا ہے۔ افسر دورے پر شہر سے باہر ہے جونہی واپس آیا مجھے اس کے سپرد کر دیا جائے گا.......... آٹھ دس روز اس طرح گزر گئے۔ سلیم کا خیال رہ رہ کر میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ میں اسے جس حال میں چھوڑ آئی تھی وہ کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ وہ شدید بخار میں تھا اور کوئی دوا بھی نہیں کھا رہا تھا۔ صبح سویرے کوٹھی سے نکل جاتا اور معلوم نہیں سارا دن کہاں گزار کر رات گئے واپس آتا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ بیرون ملک جانے کیلئے ویزے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے دوسری پریشانی عشرت کے متعلق تھی۔ وہ میری بھابی کی بہن تھی اور کچھ عیار لوگوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ گناہ کی دلدل میں اتنی گہرائی تک دھنس چکی تھی کہ سوچ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کی ماں ان کی سگی ماں نہیں۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ بات شادی کے وقت چھپائی کیوں گئی.......... ان پریشان کن سوالوں کے علاوہ فرخندہ اور عابد کی المناک موت بھی ذہن کو کچوکے لگاتی رہتی تھی ان کی موت کی ذمے دار میں تھی۔ وہ سب کچھ میری اور صرف میری وجہ سے ہوا تھا۔ کیسی سبز قدم تھی میں۔ میری ذات حادثوں کی علامت بن گئی تھی اور لگتا تھا ایک دن میں اپنے وجود سے ہی نفرت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔

لاہور آئے آٹھ دس روز ہوئے تھے۔ جب ایک دن رئیس احمد میرے لئے ایک ریڈی میڈ سوٹ لے کر آیا۔ اس نے ہدایت کی کہ میں یہ لباس پہن لوں اور ہلکا سا میک اپ بھی کر لوں وہ مجھے اپنے افسر سے ملانا چاہتا ہے۔ میں نے خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ میں تیار ہو چکی تو رئیس احمد نے مجھے ایک سیاہ ریشمی برقعہ پہننے کو دیا۔ گھر سے باہر دفتر کی ایک لمبی سی پک اپ کھڑی تھی۔ اس پک اپ میں دیسی گھی کے تین کنستروں کے علاوہ مرغیوں کا ایک ٹوکرا بھی تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں سے آیا ہوا باداموں والا تازہ گڑ تھا۔ غالباً" مجھ سمیت یہ سب کچھ اس افسر کی خدمت میں پیش ہو رہا تھا۔ دیسی گھی کے کنستروں' مرغیوں کے ٹوکرے اور گڑ کے لفافوں کے درمیان بیٹھ کر مجھے لگا جیسے میں کوئی جنس ہوں۔ کوئی بے جان شے جسے کسی کی تواضع کیلئے خوبصورت لباس میں پیک کر کے ارسال کیا جا رہا ہے۔ پک اپ اندرون شہر سے نکلی اور بھری پری سڑکوں پر سفر کرتی ملتان

روڈ سے گزر کر اقبال ٹاؤن کی ایک بنگلہ نما کوٹھی کے سامنے جا رکی۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی رئیس احمد نے کال بیل بجائی ایک مستعد خادم باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر رئیس باچھیں کھول کر مسکرایا۔ ملازم نے گیٹ کھول دیا۔ پک اپ اندر چلی گئی۔

رئیس احمد نے ملازم سے پوچھا "صاحب کہاں ہیں؟"

رئیس نے کہا "ٹھیک ہے تم لوگ یہ سامان اتروا کر اندر رکھو" پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور کوٹھی کے اندرونی حصے میں آ گیا۔ کوٹھی میں تازہ تازہ رنگ و روغن ہوا تھا۔ فرنیچر بھی سارا نیا تھا۔ لگتا تھا مکین حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ کوٹھی کے اندر ایک بوڑھے خانساماں سے رئیس احمد نے رازونیاز شروع کر دیا۔ خانساماں غور سے رئیس کی باتیں سنتا رہا۔ بعد ازاں رئیس نے مجھے خانساماں کے سپرد کر دیا۔ مگر اس سے پہلے چند ہدایات بھی دے دیں۔ کہنے لگا۔

"صاحب نو بجے کے قریب آئیں گے۔ ساڑھے نو بجے ڈنر کریں گے۔ اس کے بعد گیارہ بجے تک چہل قدمی کریں گے۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ بیڈ روم میں پہنچ جائیں گے اس وقت تم دودھ کا گلاس لے کر ان کے کمرے میں جانا۔ اندر جانے سے پہلے دو بار ہلکی دستک دینا۔ اگر ٹی وی آن ہو تو اس کے پیچھے سے گزر کر بائیں جانب والی میز پر گلاس رکھ دینا۔ اگر صاحب پوچھیں کہ کون ہو تو میرا حوالہ دینا۔ اگر وہ "اوکے" کہہ دیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں مزید تمہاری ضرورت نہیں۔ اس صورت میں فوراً باہر آ جانا مگر میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری ضرورت محسوس کریں گے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے رئیس کی آنکھوں میں ایک مکروہ سی چمک عود کر آئی۔ مجھے سرتاپا گھورنے کے بعد ایک گہری سانس لی اور بولا "بہت بڑے افسر ہیں فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو دو کوڑی کا محتاج بنا سکتے ہیں۔ بڑی تمیز سے پیش آنا۔ ان کو خوش کرو گی تو خان رحیمی جیسے بوڑھے کتے تمہارے تلوے چاٹتے نظر آئیں گے۔"

اس کے بعد رئیس واپس چلا گیا۔ خانساماں نے مجھے ایک ملحقہ کمرے میں بٹھا دیا یہ چھوٹا سا کمرہ ملازموں کیلئے مخصوص تھا۔ یہاں ایک ٹی وی بھی چل رہا تھا میں کچھ دیر بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی پھر لان میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ بنگلے کی وضع قطع اور یہاں کے ماحول سے مکینوں کی خوشحالی اور ان کے اثرورسوخ کا اندازہ ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا

کہ یہاں کی فضا میں کچھ گھٹن سی ہے۔ ایک خوف سا درودیوار سے لپٹا ہوا تھا۔ قریباً نو بجے گھنی مونچھوں والا ایک شخص موٹر سائیکل پر بنگلے پہنچا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ "افسر صاحب" کا ہیڈ اردلی تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب کچھ لیٹ ہیں، دس بجے تک ڈنر پر پہنچیں گے۔ دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب پورچ میں سرخ پردوں والی ایک لمبی کار آ کر رکی اسے باوردی ملازم ڈرائیو کر رہا تھا۔ خدمت گار نے لپک کر عقبی دروازہ کھولا۔ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک کلین شیو شخص برآمد ہوا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ شکل و صورت سے ہی وہ اعلیٰ سرکاری افسر لگتا تھا۔ خدمت گار نے بڑھ کر بریف کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا.......... انڈر سیکرٹری نواز افروز حسنی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ شخص کار سے اترتے ہی سیدھا کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بعد تمام کام پروگرام کے مطابق ہوئے۔ بارہ بجے کے قریب خانساماں نے ایک ٹی ٹرالی پر دودھ کا جگ اور گلاس رکھا۔ انہیں خوان پوش سے ڈھانپا اور مجھے خواب گاہ کی طرف بھیج دیا۔ میں ٹی ٹرالی دھکیلتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔ دو بار دستک دی اور اندر چلی گئی۔ دل انجانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔ کار سے اترنے والا شخص سلیپنگ گاؤن پہنے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کے عقب میں دیوار پر ایک لڑکی کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ بیڈ کے ساتھ والی منقش تپائی پر بریف کیس کھلا رکھا تھا اور وہ شخص ایک انگلش رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔

"عبدل کہاں ہے؟" اس نے نہایت بارعب آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا "سر وہ آج چھٹی پر ہے۔"

وہ مجھے گھورنے لگا۔ ایک لمحے کیلئے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھے بطور ایک مفرور قاتلہ کے پہچان نہ لے۔ اخبار میں میری تصویر چھپے کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا.......... تاہم جلد ہی مجھے اس کی نگاہوں سے اندازہ ہوا کہ میرا چہرہ اس کیلئے اجنبی ہے۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے.......... میں رئیس صاحب کے ساتھ آئی تھی.......... آج شام" میں نے

جواب دیا۔ اس نے عینک اتار کر مجھے سرتاپا گھورا اور گھورتا چلا گیا۔ چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گئی۔ اس نے انٹرکام پر خانساماں کو اندر بلایا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور سیلوٹ کے انداز میں سلام کرکے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پوچھا "خانساماں' کیا رئیس احمد آیا تھا؟" خانساماں نے اثبات میں جواب دیا۔

"یہ لڑکی اس کے ساتھ آئی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"اور کیا لایا تھا؟"

"جی۔ گاؤں کی ایک دو سوغاتیں ہیں جی' کچھ گھی ہے۔ مرغیاں ہے اور گڑ وغیرہ ہے۔"

"گڈ.......... وری گڈ.......... ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

خانساماں چلا گیا تو نواز حسنی نے ٹیلی فون پر کسی سے رابطہ قائم کیا۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دوسری جانب رئیس احمد ہی ہے۔ اس نے رئیس احمد کو فوراً بنگلے میں حاضر ہونے کی ہدایت کی۔

ریسیور رکھ کر وہ میری طرف دیکھنے لگا "کہاں سے لایا تھا تم کو؟"""

میں اس سوال کیلئے پہلے سے تیار نہیں تھی اس لئے گڑ بڑا گئی۔ ایک ہوشیار افسر کے سامنے سچ بولنا ہی بہتر سمجھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس سے پہلے خان رحیمی کے پاس ملازم تھی رئیس وہیں سے مجھے لایا ہے۔

"کیا کہہ کر لایا تھا؟"

"ملازمت کا کہہ کر۔"

"تم نصف شب کو اس سج دھج کے ساتھ ملازمت کرنے آئی ہو؟"

"جی' مجھے جو ہدایت کی گئی تھی میں نے اس پر عمل کیا ہے۔ بطور ملازمہ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

"جانتی نہیں یا بھولی بنی ہوئی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے یہاں کے طور طریقوں کا کچھ پتہ نہیں۔"

نواز حسنی مجھ سے اسی طرح سوال و جواب کرتا رہا۔ کبھی کبھی رسالے کی ورق گردانی بھی کرنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد گیراج میں سکوٹر رکنے کی آواز آئی۔ رئیس احمد پہنچ گیا تھا۔ نواز حسنی نے مجھے باہر جانے کی ہدایت کی۔ میں خواب گاہ سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں بھی اس لڑکی کی تصویر موجود تھی جو بیڈ کے عقب میں نظر آ رہی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد خواب گاہ سے چیخم دھاڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ پتہ چلا کہ رئیس احمد کی شامت آئی ہوئی ہے۔ کافی گرما گرمی ہو رہی تھی۔ پھر خواب گاہ کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے رئیس احمد کو دھکا کھا کر باہر نکلتے دیکھا۔ اس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو رہا تھا۔ "سر میری بات تو سنیں" وہ بار بار یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔

"آئی سے گیٹ آؤٹ.......... آئی سے گیٹ آؤٹ" نواز افروز حسنی کی دھاڑوں میں رئیس احمد کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ دم دبا کر برآمدے کی طرف نکل گیا.......... ذرا ہی دیر بعد میں نے دیکھا وہ مرغیاں' گڑ کے لفافے اور گھی کے کنستر ایک ریڑھے پر لدوا رہا تھا۔ تب وہ ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور مجھے برقعہ پہننے کو کہا۔ ابھی میں برقعہ پہن ہی رہی تھی کہ نواز حسنی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ مجھے جانے کو تیار دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تشویش لہرا گئی۔ بولے "نہیں۔ اس کو رہنے دو۔ کسی بے سہارا لڑکی پر تجھ جیسے مرد کا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ میں اسے خود خان رحیمی کے پاس پہنچاؤں گا۔"

"او کے سر.......... ٹھیک ہے سر.......... جیسے آپ کی.......... مرضی سر" رئیس احمد نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ پھر ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سکوٹر سمیت غڑاپ سے بنگلے سے باہر تھا۔

نواز حسنی صاحب کے کردار کا یہ پہلو میرے لئے بڑا متاثر کن تھا۔ سول سروس میں ان جیسے افسر خال خال ہی دیکھنے میں آیا کرتے ہیں اور اس دور میں تو زیادہ سے زیادہ انگارے پیٹ میں بھرنے کی دوڑ سی لگی ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں نواز حسنی کے کردار کی معترف ہو گئی اور اسکے ساتھ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی کہ شاید میں غلط جگہ پر آ گئی ہوں۔ اگر کوئی اعلیٰ سرکاری افسر پرندوں کی سمگلنگ میں ملوث تھا تو وہ نواز حسنی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کسی پہلو سے اس طرز کا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ غالباً لاہور میں اس کی

ٹرانسفر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اس کے قریبی ماتحت بھی اس کے مزاج سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئے تھے۔ رئیس احمد بھی ان میں سے ایک تھا۔ زبردست جھاڑ کھانے کے بعد وہ دو تین دن تک بالکل نظر نہیں آیا لیکن چوتھے روز رات کے وقت مجھے اس کی صورت پھر دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی نواز حسنی کے بارے میں میری تمام خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ نواز حسنی وہی تھا جس کی طرف حالات پہلے اشارہ کر چکے تھے۔

اس رات گیراج میں رئیس احمد کا سکوٹر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آیا ہوا ہے۔ ظاہر تھا کہ نواز حسنی صاحب کے کمرے میں ہوگا۔ مجھے یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ میں نے کوشش کی اور حسن اتفاق سے ایک ایسی کھڑکی تک پہنچ گئی جو ادھ کھلی تھی اور جہاں سے ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔ اس کے لیے کھڑکی ساتھ لگی ہوئی کانٹوں بھری بیل میں کئی منٹ تک سر گھسیڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ گردن اور چہرے پر جابجا خراشیں پڑ گئیں لیکن ان خراشوں کے عوض نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

کمرے میں رئیس احمد شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ نواز حسنی صاحب کہہ رہے تھے "خیر جو کچھ بھی ہوا۔ آئندہ سے احتیاط رکھنا۔ یہ طریقہ مجھے پسند نہیں۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد حسنی صاحب کی آواز دوبارہ آئی "ہاں کارخانے میں سب ٹھیک ہے نا۔ ارد گرد کسی کو شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں سر" رئیس کی آواز آئی "بس پرسوں تھوڑی سی گڑبڑ ہوئی تھی۔ ایک کٹی ہوئی پتنگ اس احاطے میں جا گری جہاں پرندے ہیں۔ ایک قالین باف لڑکا دس فٹ اونچی دیوار پھاند کر اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے دیکھ لیا۔ اب میں نے دیوار پر سیمنٹ سے شیشے کے ٹکڑے لگوا دیے ہیں اور نگران بھی مقرر کر دیا ہے۔"

نواز حسنی نے پوچھا "لڑکے نے کچھ دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں سر" رئیس نے پورے وثوق سے کہا۔ "میں نے پوری تسلی کرنے کے بعد ہی اسے چھوڑا ہے آپ بے فکر رہیں۔"

نواز حسنی نے کہا "بس چند دن کی بات اور ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ الیکشن

کے ہنگامے میں ہی یہ سارا کام مکمل ہو جائے۔ بس ایک وائلڈ لائف والے کا تھوڑا سا چکر ہے۔ وہ نبٹ جائے تو مال روانہ کر دیں گے.......... پرندوں کی ہائی جین کا پورا خیال رکھو اور ڈاکٹر چوبیس گھنٹے موجود رہنا چاہئے۔"

"ڈونٹ وری سر۔ میں خود بھی زیادہ وقت وہیں گزار رہا ہوں۔ سارے کام پر میری نظر ہے۔"

اسی دوران صدر دروازے کی طرف کچھ آہٹیں سنائی دیں اور میں کھڑکی سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے جتنی بھی گفتگو سنی تھی وہ یہ سمجھانے کیلئے کافی تھی کہ نواز حسنی اس کھیل میں پوری طرح شریک ہے۔ رئیس اس کے کارندے کے فرائض انجام دے رہا تھا اور پرندے رئیس نے اپنے کارخانے میں کہیں چھپا رکھے ہیں.......... حیرانی کی بات یہ تھی کہ اگر رئیس، نواز حسنی کا کارندہ ہے تو اس رات رشوت پیش کرنے پر اسے جھاڑ کیوں پلائی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ حسنی جرائم پیشہ ہونے کے باوجود رشوت نہیں لیتا تھا لیکن یہ تو ایسا ہی تھا کہ بوٹی سے پرہیز کیا جائے اور شوربے کو بارغبت استعمال کیا جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ حسنی نے اپنے ماتحت کی پیش کی ہوئی رشوت کو اپنے شایان شان نہ سمجھا ہو.......... یا پھر اسے رشوت پیش کرنے کا طریقہ پسند نہ آیا ہو۔ میں اس بارے میں جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی الجھ رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں نواز حسنی کے کردار نے میری نگاہوں کے سامنے کئی رنگ بدلے تھے۔ شروع میں میں نے اسے ایک بدعنوان سرکاری افسر جانا تھا۔ بعد وہ مجھے بے حد متقی اور پرہیزگار شخص محسوس ہوا اور اب ایک بار پھر وہ مجھے گلے تک گندگی میں دھنسا ہوا نظر آ رہا تھا..........

حسنی اس بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ بیوی پندرہ سولہ برس پہلے فوت ہو چکی تھی۔ ایک لڑکی اور لڑکا تھا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔

نواز حسنی مجھے خان رحیمی کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ ایسے ضروری کاموں میں الجھا ہوا تھا کہ میری روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی ایک روز میں نے یہ حیران کن خبر سنی کہ نواز حسنی کا اکلوتا لڑکا جو جیل میں تھا رہا ہو کر گھر آ رہا ہے۔ اتنے بڑے افسر کا بیٹا اور جیل میں.......... یقیناً اس نے کوئی ٹھیک ٹھاک جرم کیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیٹے سے نواز حسنی کے تعلقات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ اس دوپہر میں کچن میں

خانساماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی دفعتاً صدر دروازے کی طرف سے شور سنائی دیا۔ ایک ملازم نے آکر بتایا کہ چھوٹے مالک گھر پہنچ گئے ہیں اور ان کے یار دوست انہیں جلوس کی صورت میں گھر لے کر آئے ہیں۔

خانساماں نے اس خبر پر ناک بھوں چڑھائی لگتا تھا اسے یہ خبر اچھی نہیں لگی۔ میں نے کچن کی کھڑکی میں سے "چھوٹے مالک" کی صورت دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ چند دوستوں کے ساتھ پورچ میں سے گزر کر اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب یہ شخص یوسف کے کٹے ہوئے ہونٹ کو سگریٹ سے داغ رہا تھا۔ اس کی کرخت صورت میرے ذہن پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ اختر زماں عرف چیف تھا۔ میں نے آخری بار اسے پولیس مقابلے کے وقت دیکھا تھا جب وہ اور اس کے ساتھی عاطف، مقصود اور کبوترا خان پولیس کے نرغے میں آگئے تھے اور میں موقع دیکھ کر صغراں کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ اب مجھ پر یہ راز کھل رہا تھا کہ اختر زماں عرف چیف نواز حسنی کا فرزند ارجمند ہے۔ اس کے جیل جانے کی وجہ بھی اب بخوبی سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقیناً پولیس مقابلے کے بعد وہ لوگ پکڑے گئے تھے۔ اب کئی ماہ بعد اسے ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی تھی۔ اگر یہ اختر زماں کا گھر تھا تو میرا یہاں رکنا سخت خطرناک تھا۔ وہ مجھے پہچان لیتا تو پرانے بدلے چکائے بغیر نہ چھوڑتا۔ میں یہاں سے کافی معلومات حاصل کر چکی تھی۔ مزید معلومات کے لالچ میں کھیل بگڑ بھی سکتا تھا۔ لٰہذا میں نے فیصلہ کیا کہ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں۔

سہ پہر کے وقت نواز حسنی دفتر سے واپس آیا تو باپ بیٹے میں سخت جھڑپ ہوئی پہلے تو دونوں کافی دیر ایک بند کمرے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر اچانک اختر زماں چیختا ہوا باہر نکلا "بس ڈیڈ' میں بے غیرت بن کر نہیں جی سکتا۔ آپ چند دن کہتے ہیں میں چند گھڑیاں بھی انتظار نہیں کر سکتا۔"

نواز حسنی غصے سے بے قابو ہو کر اندر گیا اور ایک سیون ایم ایم رائفل نکال لایا۔ اس نے رائفل دور سے اختر زمان کے سینے پر کھینچ ماری اور دھاڑ کر بولا "یہ لے رائفل اور جا.......... کر لے اپنی مرضی۔ لیکن یاد رکھ اس کی اور اپنی موت کا ذمے دار تو خود ہوگا۔"

اتنے میں نواز حسنی کا کوئی عمر رسیدہ رشتے دار اندر سے نکل آیا۔ اس نے باپ بیٹے کو جھاڑ پلائی کہ وہ کیوں چیخ چیخ کر سارے گھر کو سنا رہے ہیں۔ جو بھی بات ہے وہ اندر بیٹھ کر کریں۔ انہیں دھکیل کر وہ دوبارہ کمرے میں لے گیا.......... یہ کافی سنگین معاملہ لگتا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس معاملے کا تعلق اس لڑکی سے ہے جس کی تصویریں جا بجا گھر میں لگی ہوئی ہیں۔ خانساماں کی زبانی مجھے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ یہ لڑکی نواز حسنی کی صاحب زادی ہے اور اس سے بے پناہ پیار کرتے ہیں.......... میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ صاحب زادی کہاں ہے لیکن کوئی ٹھوس بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ جب عمر رسیدہ شخص کے سمجھانے پر باپ بیٹا دوبارہ کمرے میں چلے گئے تو کچن میں آلو کاٹتے ہوئے بوڑھے خانساماں نے ایک گہری سانس لی اور مایوسی کے انداز میں سر کو دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس گھر کے معاملات پر گہری نظر رکھتا ہے اور جو چکر یہاں چل رہا ہے اس سے بخوبی واقف ہے۔ میں نے اسے ایک بار پھر کریدنے کی کوشش کی اور پوچھا کہ یہ باپ بیٹا ملتے ساتھ ہی کیوں جھگڑنے لگے ہیں۔

خانساماں نے تاسف سے کہا "اولاد خراب نکلے تو والدین کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے میں تو کہوں گا اس گھر پر جو مصیبت آئی ہے اس کا سبب یہ لڑکا ہی ہے۔ دوسروں کی بہو بیٹی کو بری نظر سے دیکھتا تھا آج اپنی.........." کچھ کہتے کہتے بوڑھا خانساماں ایک دم خاموش ہو گیا۔ جو بات وہ کئی دنوں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے منہ سے نکل ہی گئی تھی۔ میرا یہ شبہ درست نکلا تھا کہ اس معاملے کا تعلق نواز حسنی کی بیٹی اور اختر زماں کی بہن سے ہے۔ یکایک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اپنی جگہ سن کھڑی رہ گئی.......... ایک ہی ساعت میں واقعات کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئیں اور پلک جھپکتے میں ایک تصویر بن گئی.......... کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں تھی جو جھنگ کے منہ زور چنگیزیوں کے قبضے میں تھی اور جسے رہا کرانے کی کوشش میں چار افراد پر اسرار طور پر ہلاک ہو چکے تھے.......... اگر ایسا تھا تو نواز حسنی واقعی قابل رحم تھا۔

میں خانساماں سے کوئی سوال پوچھنا چاہتی تھی لیکن وہ خود ہی بول اٹھا۔ "لے بیٹا یہ کافی اندر پہنچا دے۔"

اس نے کافی کے برتنوں کو خوان پوش سے ڈھکتے ہوئے کہا۔ میں چکرا گئی۔

خانساماں کو انکار کرنا مشکل تھا اور کافی لے کر اندر جانا اس سے بھی مشکل۔ اختر زماں کا سامنا کرنا جان بوجھ کر مصیبت مول لینا تھا۔ میں ٹرالی لے کر کچن سے نکل آئی۔ لیکن ٹرالی کو منزل تک پہنچانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا' بیچ راستے کے ٹھہر کر میں سوچنے لگی کہ کیا کروں۔ کوئی دوسرا ملازم بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کے ذمے یہ کام لگا دیتی۔ اچانک خیال آیا کہ جانا تو مجھے ہے ہی تو کیوں نہ ابھی نکل چلوں۔ میرا یہاں کون سا لمبا چوڑا سامان پڑا تھا اور اگر ہوتا بھی تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس وقت میرا اصل مقصد اختر زماں کی نگاہ میں آئے بغیر یہاں سے نکل جانا تھا۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور ٹرالی کو وہیں جیسے کا تیسا چھوڑ کر بغلی راہداری میں مڑ گئی۔ دو کمروں کے اندر سے گزر کر پورچ میں پہنچی اور وہاں گاڑدینا کی قد آدم باڑ کے ساتھ ساتھ چلتی صدر دروازہ پار کر گئی۔

سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آرہی تھیں۔ میں نے ایک کار والے سے لفٹ مانگی جو اس نے بخوشی دے دی۔ بنگلے سے نکلتے ہی میں کار میں سوار ہوگئی اور وحدت روڈ والی سڑک سے میرا فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ جب تک بنگلے میں میری غیر موجودگی محسوس کی جائے گی' میں سٹیشن یا بس اڈے تک پہنچ چکی ہوں گی۔ بس تیار مل جاتی تو رات نو دس بجے تک میں خان رحیمی کے پاس پہنچ سکتی تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ابھی ہماری گاڑی چوک یتیم خانہ سے کافی دور تھی کہ ایک سبز ڈاٹسن کار تیزی سے آئی اور اس نے اوور ٹیک کر کے ہماری گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ مجھے لفٹ دینے والے شخص نے گھبرا کر بریک لگا دیئے گاڑی سڑک سے اتر کر رک گئی۔ میں نے سبز کار میں جھانکا اور دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اختر زماں عرف چیف بیٹھا تھا۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا آنکھوں پر حسب معمول کمانی دار عینک تھی۔ بڑا سا طلائی لاکٹ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے سرد نگاہوں سے گھورا اور ٹھہرے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

"چل نیلوفر' نکل باہر۔ ورنہ تماشا لگا دوں گا۔"

مجھے لفٹ دینے والے نے گھبرا کر کہا "کیا بات ہے مسٹر! یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟"

اختر زماں نے روانی سے کہا "میں تمہارا باپ لگتا ہوں اور یہ تمہاری ماں لگتی ہے۔ چونچ بند رکھ بچہ ورنہ سارے پر جھاڑ دوں گا۔"

پھر اس نے اپنی خونی نگاہیں مجھ پر گاڑیں اور سفاک لہجے میں بولا "کیوں اترتی ہے نیچے یا اتاروں تجھ کو؟"

میں اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ویسے بھی مجھے اب ایسے اکھڑ مردوں سے بات کرنے کا ڈھنگ آگیا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا "تم میری مرضی کے بغیر مجھے کیسے لے جاؤ گے؟"

اس نے کہا "تم اپنی مرضی سے ہی جاؤ گی۔ میں جانتا ہوں تم شوروغل پسند نہیں کرو گی۔ تماشا لگ گیا تو پولیس بھی آ جائے گی اور مجھے پتہ ہے پولیس سے تمہارے تعلقات اتنے اچھے نہیں ہیں۔"

اختر زماں نے میرا ٹھیک نشانہ لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ جان چکا ہے۔ واقعی میں کسی ہنگامے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کیوں کہ قانون کے کاغذوں میں مفرور قاتلہ تھی۔ میں کچھ دیر سنجیدگی سے اختر زماں عرف چیف کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بڑے اعتماد سے کھڑکی پر جھکا کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

اس نے کہا "سب کچھ یہاں بتادوں گا تو باقی کیا رہ جائے گا۔"

میں نے لفٹ دینے والے کا شکریہ ادا کیا اور پچھلا دروازہ کھول کر اختر زماں کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے شاہراہ قائداعظم پر جا رہے تھے۔ ایک معروف ہوٹل کے پارکنگ میں اس نے گاڑی روکی اور مجھے لے کر کاؤنٹر پر آگیا۔ یہاں ایک کمرہ پہلے سے اس کے نام پر بک تھا۔ چابی لے کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا میں نے بااعتماد لہجے میں کہا۔

"اختر صاحب! ہماری گفتگو ڈائننگ ہال میں ہوگی۔"

اس کا پارہ چڑھ گیا.......... اور چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ مگر موقع محل دیکھ کر اس نے خود پر قابو پایا اور ایک گہری سانس لے کر پلٹ آیا۔ ہم ڈائننگ ہال میں ایک نیم تاریک کونے کی میز پر جا بیٹھے۔ اختر زماں نے کافی کا آرڈر دے دیا اور مجھ سے بولا "تم ایک سنگین جرم کرکے بھاگی ہوئی ہو اور تمہارا اصل نام شاہدہ نہیں ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے

تمہارا جرم قتل سے کم ہرگز نہیں ہاں قتل سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے کہا "اختر زماں تم نے کچھ کہا ہی نہیں تو غلط اور صحیح کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ تمہیں کچھ اتہ پتہ نہیں۔ صرف اندھیرے میں تیر چلا رہے ہو۔"

میری بات سچی تھی اس لئے اختر زماں کو بہت کڑوی لگی۔ وہ تلملا کر رہ گیا اور بولا "میرے لئے یہی یقین کافی ہے کہ تم مجرم ہو۔ جرم اگلوانا میرا نہیں پولیس کا کام ہے۔"

اس کی بات میں وزن تھا وہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی مجھے پھانسی کے پھندے کی طرف روانہ کر سکتا تھا۔ درحقیقت میواتی بستی کی لڑائی میں ہلاک ہونے والے عاطف بخاری نے مجھے کافی حد تک پہچان لیا تھا اور اگر وہ کچھ دیر اور میرے ساتھ رہتا تو شاید سو فیصد پہچان لیتا۔ مگر بعد ازاں وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کا چھوڑا ہوا شک اختر زماں کے دماغ میں اب تک موجود تھا۔ میرے رویے نے اس شک کو اور تقویت دی تھی۔ جنگل میں پولیس مقابلے کے دوران میں صغراں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس سے اختر زماں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں مفرور ہوں۔ اب وہ اپنی ان معلومات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر انتہائی سنگین لہجے میں بولا۔

"دیکھو شاہدہ، میری بہن اغوا ہوئی ہے اور مجھے پتہ چلا ہے کہ اس معاملہ میں خان رحیمی بھی ملوث ہے۔ اب میرے گھر میں تمہاری موجودگی سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی ہے۔ میں بڑا برا آدمی ہوں شاہدہ......... تم اور خان رحیمی سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ شام سے پہلے پہلے میری بہن کو رہا کر دو۔"

اختر زماں بظاہر نارمل لہجے میں بولا تھا مگر اس کے لہجے کے نیچے دہکتے ابلتے لاوے کی روانی میں صاف محسوس کر رہی تھی۔ اختیار اور دولت کے نشے میں دوسروں کی پگڑیاں اچھالنے والے کے اپنے چہرے پر جوتے کا سایہ پڑا تھا تو وہ جلے پاؤں کی بلی بن گیا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ باپ نے اس سے بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا اپنی حماقت یا جلد بازی کے سبب معاملے کو سنگین تر بنا دے اس نے اس تمام پریشانی کو اپنے تک محدود......... رکھا ہوا تھا۔ اختر زماں کے شعلہ نشاں

مزاج کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے حقائق کو چھپا کر اچھا ہی کیا گیا ہے۔ میں نے اختر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ تمہاری بہن کے اغوا میں میرا ہاتھ ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو نکال لو میرے اندر سے اپنی بہن۔"

وہ خوفناک لہجے میں غرایا "خدا کی قسم، تمہیں معلوم نہیں تم کس موت کو دعوت دے رہی ہو۔ میں تمہیں ایسی موت ماروں گا کہ........."

بات ادھوری چھوڑ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ غصے میں وہ نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کیلئے تو مجھے لگا کہ وہ میز اٹھا کر مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ تاہم تمام خدشات کے باوجود میں اپنی جگہ بااعتماد بیٹھی رہی۔ آج اختر زماں عرف چیف سے خوف آنے کی بجائے مجھے اس پر ترس آ رہا تھا......... میرے سکون اور اعتماد کو دیکھ کر اس کا غصہ متزلزل ہو گیا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بائیں جانب دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "سوچتے کیا ہو اختر زماں۔ پکڑ لو مجھے اور لے جاؤ کسی عقوبت خانے میں۔ آخر تمہاری بہن اغوا ہوئی ہے......... اتنے بڑے غنڈے کی عزت پر حرف آیا ہے۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ۔"

وہ خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا اور ہونٹ کاٹتا رہا۔ میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اختر زماں، خدا جب انسان سے ناراض ہوتا ہے تو انسان کی عقل بھی اس سے ناراض ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کتنا بھی ذہین اور نکتہ داں ہو غبی اور احمق بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ہر کام کا نتیجہ الٹ نکلتا ہے۔ سونے میں بھی ہاتھ ڈالے تو وہ مٹی ہو جاتا ہے۔ جس کی بھلائی کا سوچتا ہے اس کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔ نحوست ناکامی اور مصیبت کے سائے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تمہاری گمراہیاں بھی تمہیں اس سٹیج پر لے آئی ہیں۔ تمہارا وجود نہ صرف تمہارے اپنے بلکہ تمہارے لواحقین کیلئے بھی مصیبت بن چکا ہے۔ اپنے نفس کی من مانیوں سے جو گناہ تم نے کمائے ہیں ان کے خمیازے میں سے تمہارے گھر والوں کو بھی حصہ مل رہا ہے اور انشاء اللہ ملتا رہے گا........."

میرے سینے میں غبار بھرا ہوا تھا۔ یوسف کی چیخیں، صغراں کی گریہ زاری اور اپنی

بے بسی سب کچھ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ میں دیر تک بولتی رہی اور وہ آنکھیں پھاڑے سنتا رہا۔ اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور اب ایک طرح کی لاچاری اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھی آخر وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مس شاہدہ! اگر ارسی کے اغوا میں تمہارا یا خان رحیمی کا ہاتھ نہیں تو پھر وہ کون ہے جس نے یہ جرات کی ہے؟"

میں نے کہا "اخترزماں تم کوئی اکیلے ہی جرات مند اس علاقے میں نہیں ہو۔ بڑے بڑے کافر بھرے ہوئے ہیں یہاں۔ یہاں ہر بڑی مچھلی چھوٹی کو نگلتی ہے۔"

وہ بولا "مس شاہدہ' میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ اگر میری کوئی مدد کر سکتی ہو تو کرو' ورنہ......... چند گھنٹے کے اندر اندر میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ اب اس کے اندر کا غصیلا حیوان خجالت کے دھوئیں میں تحلیل ہو چکا ہے۔ اس کی شیطانیت ایک طرح کی بے بسی میں ڈھل چکی تھی مجھے اب اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ اختر اب باقی باتیں کمرے میں کرتے ہیں۔"

کمرے میں پہنچ اخترزماں نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ اغوا ہونے والی لڑکی کا نام ارسہ ہے۔ گھر میں اسے پیار سے ارسی کہتے ہیں۔ وہ میٹرک کا امتحان دے چکی ہے۔ نواز افروز حسنی بیٹی سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی پیدائش کے چند ہی ماں بعد نواز حسنی کی محبوب بیوی انہیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ ان کی موت کے بعد نواز حسنی نے بیٹی کو ماں اور باپ بن کر پالا۔ اخترزماں تو بچپن میں ہی اپنی خالہ کے پاس انگلینڈ چلا گیا تھا لہٰذا ان کی تمام خوشیاں مسرتیں اور محبتیں ننھی ارسہ سے وابستہ ہو گئیں۔ انہوں نے اس کیلئے کبھی آیا کا انتظام نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی دوسرے مددگار کا سایہ اپنی بچی پر پڑنے دیا۔ وہ اس کے سب کام خود کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب تک وہ چار سال کی نہیں ہو گئی حسنی صاحب نے دفتر کا منہ نہیں دیکھا۔ چند برس پہلے تک وہ خود اسے نہلاتے تھے' اس کے بالوں میں کنگھی کرتے تھے' اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے اور گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے' اب بھی جب وہ اتنی بڑی ہو چکی تھی بے تکلفی سے ان کی گود میں بیٹھتی تھی اور ان سے چمٹ کر سوتی

تھی۔ دیکھنے والے ان کی محبت کی مثالیں دیتے تھے اور حیرت میں ڈوب جاتے تھے۔ نواز حسنی صاحب کی سب سے بڑی خوشی ارسی کیلئے شب و روز محنت کرنا اور اپنی کمائی کو اس پر خرچ کرنا تھا۔ وہ اس کے لئے یورپ سے خوشبوئیں اور لباس منگواتے تھے۔ اس کی لذت کام و دہن کے لئے انہوں نے نفیس نفیس کھانے پکانے کے کورس کر رکھے تھے اور اعلیٰ سرکاری خانساماؤں اور باورچیوں سے بھی مدد لیتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر وہ دنیا کی ہر دستیاب چیز حاضر کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کی تربیت پر بھی بے پناہ توجہ دی تھی' وہ اسے ایک مثالی شخصیت بنانے کے آرزومند تھے۔

اور اس کوشش میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی......... اب یہی خوش جمال اور خوش سیرت لڑکی جو حسنی صاحب کی جان اپنے جسم میں لئے پھرتی تھی ایک اوباش شخص کی سفاکی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اسے اغوا کرنے والے نے اس کی واپسی کے لئے ایک کڑی شرط رکھی تھی۔ اس شرط نے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو گھٹنے ٹیکنے اور ہر اصول کو پس پشت ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

واقعات کے تسلسل سے ظاہر تھا کہ چنگیزی نہایت عیار قسم کے بلیک میلر ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کے لئے وہ بڑے بڑے جرائم بغیر ہچکچاہٹ کے کر جاتے ہیں۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ شاید خان رحیمی بھی کسی قسم کی بلیک میلنگ کا شکار ہے۔ وہ کیوں اس غیر قانونی کاروبار میں چنگیزیوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا؟ اب کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میرا خان رحیمی سے ملنا اور اس سے تفصیلی گفتگو کرنا ضروری تھا۔ مجھے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر اخترزماں عرف چیف نے عاجزی سے کہا۔

"مس شاہدہ! پلیز......... اگر تمہیں کچھ معلوم ہے تو مجھے بتاؤ۔ کہاں ہے میری بہن' کیوں اغوا کیا گیا ہے اسے؟ کیا چاہتے ہیں وہ لوگ؟ ان سوالوں کے جواب نہ ملے تو میرا دماغ الٹ جائے گا اور میں ایسا کچھ کر جاؤں گا جو سب کو تباہ و برباد کر ڈالے گا۔"

میں نے بغور اخترزماں کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی برداشت اور ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اسے مزید اندھیرے میں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے اسے دھیمے لہجے میں سمجھانا شروع کیا کہ وہ تحمل سے کام لے اور اپنے

غضب کو قابو میں رکھے۔ کیونکہ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے مجرم کا نام جان کر بھی آپے سے باہر نہیں ہوگا اور باہمی صلاح مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ جب اس نے وعدہ کرلیا اور مجھے اس کے وعدے کا یقین بھی آگیا تو میں نے محتاط لفظوں میں وہاب چنگیزی کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے یہ نام حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر سنا' اور چند لمحے کے لئے کچھ بھی نہ بول سکا.......... آخر اس نے لرزاں لہجے میں پوچھا "چنگیزیوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ وہ اسمگلنگ میں ملوث ہیں اور تمہارے ڈیڈ کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کس قسم کی اسمگلنگ؟ کہیں.......... کہیں یہ کوئی پرندوں وغیرہ کا چکر تو نہیں۔ میرا مطلب ہے باز عقاب وغیرہ کا.........."

"ہاں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ" اس نے ہونٹ سکوڑے "تو کیا خان رحیمی بھی اس میں ملوث ہے؟"

"خان رحیمی بھی اسی طرح ملوث ہے' جس طرح میں ہوں۔ میں ابھی تمہیں اس بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی۔"

اخترزماں کے چہرے پر سنسنی خیز سوچ کے آثار تھے۔ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آج سے چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے وہاب چنگیزی نے اچانک ہمارے ہاں آنا جانا شروع کیا تھا۔ اس کی آمدورفت دس پندرہ روز چلی۔ زمیندار لوگ سرکاری افسروں سے بنا کر رکھنے کے لئے ایسے دورے کیا ہی کرتے ہیں۔ پھر ایک روز میں نے وہاب چنگیزی کو برہمی کی حالت میں اپنے گھر سے نکلتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جس غرض سے ڈیڈ کے پاس آ رہا تھا وہ پوری نہیں ہوئی۔ غلط خواہشات لے کر ڈیڈ کے پاس آنے والے لوگ ایسے ہی مایوسی کے عالم میں ہمارے گھر سے نکلا کرتے ہیں مگر وہاب چنگیزی کو یوں جاتے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ چنگیزیوں جیسے گھرانے سے دشمنی مول لینا کسی بھی افسر کے لئے گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ مجھے ایک نامعلوم سے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ اس بارے میں ڈیڈ سے بات کروں گا مگر پھر یہ واقعہ ذہن سے نکل

گیا.......... اب تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ انہی ملاقاتوں کا شاخسانہ ہے۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ باتیں کرتے ہوئے اخترزماں کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جوش وجذبہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جس کی میں توقع کر رہی تھی وہاب چنگیزی کے نام نے اس کے بھڑکتے جذبوں کو ایک موٹے سرد کمبل میں لپیٹ دیا تھا اگر میں کہوں کہ وہ ہراساں نظر آ رہا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

"اوہ گاڈ۔ یہ کیا ہوگیا۔ ڈیڈ نے ایسی حماقت کیوں کی۔"

وہ مٹھیوں کو بھینچ رہا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"مس شاہدہ! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ لڑکی جو چنگیزیوں کے قبضے میں ہے' ارسی ہی ہے۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور اس پر انکشاف کرتے ہوئے کہا "اس سے پہلے تمہارے ڈیڈ بزور بازو ارسہ کو چھڑانے کی ایک ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کوشش کے نتیجے میں تین چار افراد ہلاک بھی ہوئے ہیں۔"

یہ اطلاع اخترزماں کیلئے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ سفید پڑ گئے وہ بولا "ان کم بخت چنگیزیوں سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ کاش ڈیڈ یہ دشمنی مول لینے سے پہلے کسی سے مشورہ کر لیتے لیکن وہ تو مشورے کو توہین سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں میں دودھ پیتا بچہ ہوں۔ میں اسی روز سمجھ گیا تھا کہ چنگیزی ضرور کوئی گل کھلائیں گے۔ اوہ مائی گاڈ۔ یہ سب کیوں ہوا۔"

اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ کر سر میز پر جھکا دیا۔ وہ خود بھی ایک جرائم پیشہ شخص تھا بڑے بڑے غنڈے اس کے نام سے تھراتے تھے۔ مگر یہ سن کر کہ اس کی بہن چنگیزیوں کے قبضے میں ہے اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ یہ بالواسطہ طور پر چنگیزیوں کی طاقت اور بالادستی کا اعتراف تھا۔ ثابت ہوتا تھا کہ سفاکی کی دنیا میں چنگیزی ایک "معتبر" نام ہے.......... یہ نام اب الیکشن کے مرحلے سے گزر کر اور عوام کے کندھے پر بندوق رکھ کر جمہوریت کا سینہ چھلنی کرنے والا تھا۔ کیسا سنگین اتفاق تھا کہ آج میں وہاب چنگیزی کے کردار سے پوری طرح آگاہ ہوئی تھی اور آج ہی الیکشن ہو رہا تھا۔ انتخابی حلقوں میں

صبح سے پولنگ جاری تھی۔ میں نے حسرت کے ساتھ سوچا کاش میں یہ سب کچھ تھوڑا عرصہ پہلے جان جاتی۔ اب میری یہ معلومات کم از کم الیکشن کے حوالے سے بیکار تھیں.......... اخترزماں تشویش ناک نظروں سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ غالباً وہ تصور ہی تصور میں اپنی نوعمر بہن کی بے بسی اور ذلت کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے پناہ اضطراب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"مس شاہدہ' اب آپ کے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟"

میں نے الٹا اس سے سوال کیا "تمہارے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ارسہ کو بزور بازو چھڑایا جاسکتا ہے؟"

وہ دردناک لہجے میں بولا "میرا خیال ہے نہیں۔ چنگیزی جیتی جاگتی ارسہ کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے اور اگر خدا نخواستہ ارسی کو کچھ ہوگیا تو اس کا ایک ہی مطلب ہوگا۔ ارسی اور ڈیڈ کی موت۔ ایک فیصد امکان بھی نہیں کہ ڈیڈ اس کا صدمہ برداشت کرسکیں۔"

اخترزماں کی آنکھوں میں ہراس ہی ہراس تھا۔ فلمی انداز میں گالیاں بکنے والا اور ریوالور کو ہردم انگلی پر گھمانے والا چیف' نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔

میں نے کہا "تو پھر اٹھو اخترزماں' ہم خان رحیمی کے پاس چلتے ہیں۔ اس مرحلے میں خان رحیمی سے بہتر مشورہ ہمیں کوئی نہیں دے سکتا۔"

کمرے کو لاک کرکے ہم ہوٹل کے صدر دروازے سے نکلے اور پارکنگ میں آگئے۔

اس روز رات ٹھیک نو بجے ہم جھنگ پہنچ گئے۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ پولنگ ہو رہی تھی۔ راستے بھر میں انتخابی جوش و خروش کے مناظر دیکھتی رہی اور دل سے رہ رہ کر ایک دعا نکلتی رہی۔ وہ دعا یہ تھی کہ اے رب کریم تو قادر مطلق ہے۔ دلوں کے راز جانتا ہے۔ ایک شخص جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے سیدھے سادھے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ انہیں دھوکا دے رہا ہے اس کا فریب نیچے سے لے کر اوپر تک اور وزیر سے لے کر منسٹر تک چل رہا ہے۔ اپنی عیاری سے اس نے نہ صرف ایک خلقت کو دھوکا دیا ہے بلکہ حکومتی مشینری کو بھی دغا دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ کوئی اور نہ جانتا ہوگا مگر

اے اللہ تو تو جانتا ہے۔ یہ شخص روئے زمین کا سب سے قابل نفرت شخص ہے۔ اس نے ایک معصوم فرشتے کو تڑپا تڑپا کر مارا ہے اور ایک مجبور ماں کو اپنی ہوس کی آگ میں جلایا ہے۔ اے خدا! یہ شخص جو اندر سے گناہوں کے کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے نیکی کا سفید لبادہ پہن کر عوام کے سامنے آیا ہے۔ اے مالک! اسے سرنگوں کر اسے ذلیل و رسوا کرکے مظلوموں اور بے کسوں کی لاج رکھ لے۔ یہ دعا مانگتے ہوئے میرا دل بار بار بھر آیا۔ کسی وقت میں آنکھیں بند کرکے کار کے دروازے سے سر لگادیتی۔ ایسے میں ہزاروں انسانوں کا ہجوم میری آنکھوں کے سامنے آتا۔ میں تصور ہی تصور میں ان کے سامنے روتی چیختی اور پکار پکار کر کہتی۔

"اے لوگو وقت نے تمہارے ہاتھوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ دیکھو.......... اچھا فیصلہ کرنا۔ اس شخص کو پہچان لینا۔ دھوکے میں نہ آنا۔"

رات کے اندھیرے میں ہماری کار خان رحیمی کی وسیع و عریض کوٹھی کے اندر رکی خان رحیمی کی مخصوص جیپ پورچ ہی میں تھی۔ میں اخترزماں کے ساتھ صدر گیٹ پر پہنچی تو سلیم سے ملاقات ہوگئی۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ واقعی مریض دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی' چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ۔ ایک کمبل لپیٹے وہ سست قدموں سے گیٹ کی طرف آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا پھر نفرت سے منہ پھیر لیا اور بغیر کچھ کہے اپنے راستے پر بڑھ گیا۔ اس منظر نے میرے دل کو ٹھیس پہنچائی۔ میں اخترزماں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر واپس آئی تو سلیم گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے گیٹ کیپر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ چہل قدمی کے لئے نکلا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد واپس آجائے گا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں خان رحیمی کے پاس آئی وہ اپنے ریڈنگ روم میں تھا۔

عقابوں کے بارے میں ایک بڑی موٹی سی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوا پھر اس کی آنکھوں میں خاص چمک نظر آئی۔ رسمی کلمات کے بعد پائپ سلگا کر بولا "آؤ گرل! میرا اندازہ ہے کہ تم کوئی اہم خبر لائی ہو.......... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے اس کے خیال کی تصدیق کی۔ وہ خوش ہو کر بولا "میرے پاس بھی

تمہارے لئے ایک چھوٹی سی نیوز ہے۔"

میں نے کہا "پہلے آپ سنا دیجئے۔"

اس نے کہا "نہیں پہلے تم۔"

میں بولی "سر آپ نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ آپ کی خبر چھوٹی سی ہے لہٰذا آپ پہلے ہی فارغ ہو جاتے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا "یعنی تم اگری کرتی ہو کہ تمہاری نیوز بڑی ہے......... بہرحال' میری نیوز یہ ہے کہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق چودھری وہاب اپنے حلقے میں تیس ہزار ووٹوں کے فرق سے ہار گیا ہے۔ اس حلقے میں اصل مقابلہ چودھری وہاب چنگیزی اور چودھری شہاب کے چچا چودھری حکم دین کے درمیان تھا۔ غیر حتمی نتائج کے مطابق چودھری شہاب کے چچا نے پچاس ہزار کے قریب ووٹ حاصل کئے ہیں اور وہاب چنگیزی کے ووٹ بیس ہزار اکٹھے ہیں........."

میرے دل کی گہرائیوں سے شکر الحمدللہ کی خاموش صدا نکلی' کاش اس وقت میری آنکھوں میں آنسو ہوتے اور میں انہیں شکریے کے طور پر بہا سکتی۔ ایکاایکی مجھے محسوس ہوا کہ دوران سفر میں نے تصور ہی تصور میں ہزاروں لاکھوں کے مجمع کے سامنے جو خاموش تقریر کی تھی وہ کسی طرح حقیقت کا روپ دھار کر خلق خدا کے کانوں تک پہنچ گئی ہے ووٹ کاسٹ کرنے والے ہاتھوں نے وہاب چنگیزی کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا ہے۔

کچھ دیر خان رحیمی اور میں اس خوش کن خبر پر تبصرہ کرتے رہے' پھر خان رحیمی نے کہا "میری اطلاعات کے مطابق تم اس وقت انڈر سیکرٹری نواز حسنی کی کوٹھی سے آ رہی ہو اور تمہارے ساتھ جو شخص ہے وہ نواز حسنی کا بیٹا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا "گڈ" خان رحیمی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا "اب بتاؤ۔ تمہاری نیوز کیا ہے؟"

میں نے کہا "سر! میری نیوز یہ ہے کہ چنگیزیوں کی سازش کا جال ٹوٹ گیا ہے ان کا سارا کیا دھرا سامنے آ گیا ہے۔ اب آپ پورے اعتماد سے ایک ایسا کیس رجسٹر کرا سکتے ہیں جو چنگیزیوں کو جہنم واصل کر سکے۔"

"تمہارا مطلب ہے ٹھوس ثبوت فراہم ہو گئے ہیں؟"

"یس سر۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ لڑکی جسے چنگیزیوں نے اغوا کر رکھا ہے اور جس کی رہائی کے لئے آنے والے چار افراد کو ہلاک کر دیا گیا تھا' کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"اسی نواز حسنی کی بیٹی' جو آپ کے خیال میں چنگیزیوں کا کارندہ ہے۔"

خان رحیمی نے بے قراری سے کہا "گرل مجھے شروع سے اور تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔"

جواب میں میں نے اسے رئیس احمد کے گھر سے مال رشوت کے طور پر انڈر سیکرٹری کی خوابگاہ تک پہنچنے اور وہاں سے آگے کا سارا احوال تفصیل سے بتا دیا۔

خان رحیمی' حیرت اور بے یقینی کے عالم میں سنتا رہا' اس نے گاہے گاہے سوالات بھی کئے۔ جب میری بات ختم ہوئی تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے کہا "سر اختر زماں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ اس کی "غیرت کا مردہ" کفن پھاڑ کر جاگا ہے' اب وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

ایک طویل خاموشی کے بعد خان رحیمی نے کہا "میرا خیال ہے چنگیزیوں کے خلاف کافی شہادتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ میں نے اس مجذوب شخص کو بھی بلا لیا ہے جس نے فرخندہ اور اس کے ساتھی رپورٹر کو چاروں لاشوں تک پہنچایا تھا۔ اور وہ رپورٹر بھی کوہاٹ سے میرے پاس پہنچ چکا ہے۔ یہ دونوں گواہ عدالتی کارروائی کے دوران بہت اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔"

خان رحیمی نے اپنے پرس سے نکال کر کچھ فوٹو گراف میرے سامنے رکھ دیئے۔ یہ ان چاروں ڈھانچوں کی تصویریں تھیں جو پریس رپورٹر نے رات کے وقت فلیش گن کی مدد سے لی تھیں۔ ایک ڈھانچے کی گردن عجیب طرح سے مڑی ہوئی تھی......... میرے کہنے پر خان رحیمی نے ان دونوں افراد کو بلا لیا۔ فرخندہ کا ساتھی رپورٹر پچیس چھبیس سالہ جوان تھا۔ شیو بڑھی ہوئی' آنکھیں چمکدار اور پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ دوسرا شخص نیم دیوانہ قسم کا تھا۔ اس نے قمیض کے گریباں کو غلط بٹن سے بند کر رکھا تھا۔ بار بار سر کھجاتا تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں افراد بڑے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ

ہم پولیس کو اس جگہ تک پہنچائیں گے جہاں چاروں لاشیں مدفون ہیں.......... تاہم میں نے محسوس کیا کہ خان رحیمی کچھ افسردہ نظر آرہا ہے۔ دونوں افراد باہر چلے گئے تو میں نے خان رحیمی سے اس کی افسردگی کی وجہ پوچھی۔ وہ کہنے لگا۔

"گرل! تم نے حسنی کی بیٹی کا بتا کر مجھے شش وپنج میں ڈال دیا ہے۔ فاریور کائینڈ انفریشن میں چند روز پہلے جان چکا ہوں کہ اسمگلنگ میں استعمال ہونے والے افسر کا نام نواز حسنی ہے۔ اس شخص سے میری پرانی صاحب سلامت ہے۔ اس کے اہل خانہ سے بھی شناسائی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ اپنی لڑکی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اگر.......... اگر تمہاری اطلاعات کے مطابق واقعی یہ معاملہ اس کی لڑکی کا ہے تو پھر ہمیں بے حد احتیاط کی ضرورت ہوگی.......... کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ میرا خیال ہے میں اس وقت فون کرکے اسے یہاں بلالوں۔"

میں نے کہا "سر ہو سکتا ہے حسنی صاحب کی نگرانی ہو رہی ہو۔ ممکن ہے ان کا فون بھی ٹیپ کیا جا رہا ہو۔"

خان رحیمی نے کہا "یقینی بات ہے کہ ایسا ہو رہا ہوگا۔ تم نے اس طرف میری توجہ دلا کر اچھا کیا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے اس سے رابطہ کرنے کے لئے خصوصی احتیاط کرنا ہوگی۔"

وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھا اور فون والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں خان رحیمی کے ریڈنگ روم سے نکلی تو دینو سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ منہ پھلائے اندرونی کمروں سے چلا آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ سلام و دعا ہوئی میں نے دیکھا اس کے رخسار پر طمانچے کا نشان ہے۔ کسی سے مار کھا کر آیا تھا۔ میں نے اس نشان کے بارے میں پوچھا پہلے تو وہ سٹپٹایا پھر غرا کر بولا "وہی خبیث' خصم کھانی ڈائن بیٹھی ہوئی ہے راجکماری بن کے۔ چانٹے مارتی ہے 'جیسے زر خرید غلام ہوں ہم۔"

"دینو! یہ کس کا ذکر خیر کر رہے ہو؟"

"وہی عیش و عشرت بی بی اور کون۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "تو وہ ابھی تک یہیں ہے؟"

دینو نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا "لیکن شاہ دین ٹوانہ تو چلا گیا ہے۔ ابھی مجھے خان صاحب نے بتایا ہے۔"

دینو بولا "شکار پر پاؤں مڑ گیا تھا نا اس کا' وہ موچ کا بہانہ کرکے یہیں بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک حکیم کے مشٹنڈے پتر سے علاج شلاج کراندی پئی ہے۔ ہم سے کون سی گل چھپی ہے۔ بابری سے آنکھ لڑی ہوئی ہے اس کی۔ دونوں اندھیرے سویرے ملتے رہتے ہیں۔ منہ کھلوائے گی تو میں کھول دوں گا پورے کا پورا۔ ساری گل دس دوں گا جا کر خان صاحب کو۔"

میں نے پوچھا "اب کہاں ہے وہ؟"

اس نے بتایا "منہ سر لپیٹ کر پڑی ہوئی ہے اپنے کمرے میں۔ میرا خیال ہے۔ رات بابری صاحب نے اسے تاؤنی شاؤنی لگا دی ہے۔"

"تاؤنی شاؤنی" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تاؤنی شاؤنی.......... مطلب.......... مار پیٹ.......... میرا خیال ہے کل آدھی رات کے وقت بابری اور عیش عشرت بی بی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ سر پھٹ گیا ہے اس کا کہندی ہے غسل خانے میں تلک (پھسل) گئی تھی۔ بندہ پوچھے غسل خانے میں تلکنے سے تالو پھٹ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے بابری صاحب نے اس کے تالو میں کوئی شے ماری ہے۔ ڈنڈا' گلدان یا ٹائم پیس وغیرہ.......... میں نے اپنے کانوں سے عشرت کے رونے کی آواز سنی تھی۔ بارش کی وجہ سے میں برانڈے میں آکر سو گیا تھا۔ میں نے چوڑیوں کی چھن چھن کی آواز سنی۔ پھر عشرت بی بی بابری کے کمرے سے نکلی اور بھاگتی ہوئی جا کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اب کہتی ہے تلک گئی ہوں۔"

میں ان اطلاعات پر حیران ہو رہی تھی۔ دینو کی بات میں وزن تھا۔ سلیم بیمار تھا۔ ہو سکتا ہے عشرت اس کی بے رخی اور سرد مہری سے اکتا کر اس کے کمرے میں گئی ہو اور سلیم نے اسے غصے میں کوئی شے دے ماری ہو۔ غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے دینو سے پوچھا۔

"لیکن تجھے چاٹنا کس خوشی میں پڑا ہے؟"

وہ جل کر بولا "میں نے بی بی سے بس اتنا ہی کہا تھا جی کہ غسل خانے میں گر کر تالو

نہیں پاٹ سکتا۔ شاید چوٹ لگنے کی وجہ تو آپ کچھ بھول شول رہی ہیں۔"

میں نے کہا "دینو' تم ایک ملازم ہو۔ گھریلو معاملات میں دخل دو گے تو ایسا ہی ہو گا۔"

جواب میں اس کی "جگت باز" زبان قینچی کی طرح چلنے لگی اسے رئیس احمد پر بھی بہت غصہ تھا جو کئی روز اس سے دستی نلکا چلواتا رہا تھا۔ دینو سے بمشکل جان چھڑا کر میں عشرت کے کمرے میں پہنچی وہ سر پر پٹی باندھے کروٹ کے بل بستر پر پڑی تھی میں نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے رخساروں پر پھر آنسو پھسلنے لگے۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر رونے کی وجہ پوچھی۔ عشرت پہلے تو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس نے پہلی دفعہ میرے سامنے اعتراف کیا کہ بابری (یعنی سلیم) سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

"شاہدہ' میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ بے وفا نکلا ہے۔ اس نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ سارے مرد مطلب پرست کیوں ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "شاہدہ دغابازی اور مطلب پرستی کا الزام صرف مردوں پر ہی کیوں' عورتیں بھی تو اس قسم کی ہوتی ہیں۔ تم اپنی طرف ہی دیکھو' تم نے کس سے وفا کی ہے۔ کس سے بے لوثی کا برتاؤ کیا ہے؟"

میرے صاف سیدھے لہجے نے عشرت کو کاٹ کر رکھ دیا۔ الفاظ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر وہ بلک اٹھی۔ دردناک آواز میں بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو شاہدہ' میں عورت کا بدترین روپ ہوں۔ میں ہوں ہی اس قابل۔ دنیا جہان کی برائیاں مجھ میں ہیں اور ان میں ایک خود غرضی بھی ہے۔ کس قدر خود غرض ہوں میں۔ میں جانتی تھی کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھتی ہو تو میں جانتی تھی وہ تم سے محبت کرتا ہے اور میں اس کے لئے ناراض وقت کو منانے والے کھلونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے باوجود اس کی مردانگی کے بھنور میں ڈوبتی چلی گئی اور خود کو گنوا کر اسے جیتنے کی کوشش کرتی رہی میرے جیسی سستی اور ارزاں عورت کا یہی انجام ہونا تھا۔ دنیا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کاش میں مر جاؤں اور ان ساری

مصیبتوں سے میری جان چھوٹ جائے۔"

مجھے عشرت پر غصے کے ساتھ ترس بھی آرہا تھا۔ اس کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ ایک آنکھ تھوڑی سی سوجی ہوئی تھی۔ اپنے زخمی سر اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ ایک مظلوم ہستی نظر آرہی تھی۔ میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"عشرت! کچھ بھی ہے بابری کو اس طرح تمہاری تذلیل کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ عورت کو مارنا مردانگی نہیں اور اگر وہ مردانگی کا دعویدار ہے تو اسے تم سے معافی مانگنا ہوگی۔"

وہ کراہ کر بولی "نہیں شاہدہ' مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ قصور سراسر میرا ہی تھا مجھے اس کی سزا ملی ہے۔ رہی اس کی بات تو وہ.......... وہ تو تمہاری محبت کا روگی ہے۔ نہ اسے خود پر قابو ہے اور نہ اپنی سوچوں پر اور جو شخص اتنا بے بس ہو اس کی کسی حرکت کا کیا برا ماننا.........." اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکیوں کو روکا اور نسبتاً پرسکون لہجے میں بولی۔

"شاہدہ' میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اتنا دکھی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ سچ پوچھتی ہو تو وہ مایوسی کے سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ دنیا میں تم وہ واحد عورت ہو جو اسے ڈوبنے سے بچا سکتی ہو۔ پلیز' اس کا کچھ کرو اگر تم چاہتی ہو کہ وہ زندہ رہے تو تمہیں آگے بڑھ کر اسے تھامنا ہوگا۔"

اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوٹھی کے اندر زبردست سرگرمی دیکھنے میں آئی۔ انڈر سیکرٹری نواز افروز حسنی کے علاوہ شعبہ وائلڈ لائف کا ایک اعلیٰ سرکاری افسر بھی یہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ نیم گنجے سر والے ایک ڈی ایس پی کی پراسرار آمدورفت بھی جاری تھی۔ میٹنگ پر میٹنگ ہو رہی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی اہم فیصلہ ہونے والا ہے۔ مجھے خان رحیمی پر غصہ آرہا تھا میں ہر ہر قدم پر اس کی مدد کر رہی تھی لیکن اس نے مجھے ان صلاح مشوروں سے یکسر علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ میں ان میٹنگوں میں شریک ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ مجھے صورت حال سے باخبر تو رکھ سکتا تھا۔ اس نے ان دو دنوں میں پلٹ کر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ ایک اڑتی اڑتی خبر میرے کانوں میں یہ بھی پہنچ چکی تھی کہ الیکشن میں شکست کھانے کے بعد چودھری وہاب چنگیزی ملک چھوڑنے کا ارادہ

رکھتا ہے۔ اگر اس خبر میں تھوڑی بہت بھی صداقت تھی اور وہاب چنگیزی کے ملک چھوڑنے کا امکان تھا تو ہمیں تیزرفتاری سے عمل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ چنگیزی پر ہاتھ ڈالنے میں اتنی تاخیر کیوں کی جارہی ہے۔ تیسری شب جب میں اپنے کمرے میں بے چین سی بیٹھی ہوئی تھی دینو نے آکر بتایا کہ خان رحیمی مجھے خواب گاہ میں بلا رہا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں جس حالت میں ہوں فوراً پہنچ جاؤں۔ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ شاید پھر "روحانی قوت" حاصل کرنے کا کوئی چکر ہے۔ اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جہاندیدہ لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے گریٹ گرل ناراض ہے۔ آئی نو.......... میں تمہیں اگنور کر رہا ہوں۔ ویری ساری فار دیٹ' بیٹھ جاؤ' میں آج تمہارے سارے شکوے دور کر دینا چاہتا ہوں۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ بولا "میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں بہت سے سوال سر اٹھاتے رہے ہیں۔ تم نے بڑے صبر سے ان کے جوابات کا انتظار کیا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں اس لئے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ مختصراً حالات سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگا میری شہرت ایک شکاری کے طور پر ہے اور میں پچھلے پچاس سال سے اس لائن پر ہوں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے مجھے شکاری پرندوں کو پکڑنے میں دلچسپی ہوئی اور میں نے نہ صرف انہیں پکڑنا بلکہ سدھانا بھی شروع کیا۔ اس پیشے میں میں نے کافی پیسہ کمایا۔

اچھے برے ہر طرح کے لوگوں سے ملا ہوں اور بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ مگر کچھ عرصہ پہلے ایک منفرد واقعہ پیش آیا۔ ایک روز تمہارے مرحوم شوہر واصف چنگیزی نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ وہ مجھے ایک کہنہ مشق شکاری کے طور پر جانتا ہے اور میرے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا خواہشمند ہے۔ میں نے وضاحت چاہی تو اس نے مجھے پوری طرح اعتماد میں لینے کے بعد انکشاف کیا کہ وہ وسیع پیمانے پر شکاری پرندوں کی تجارت کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک کے طول وعرض میں جو بھی لائسنس یافتہ اور غیرلائسنس یافتہ حضرات شکاری پرندے پکڑتے ہیں ان سے رابطہ کیا جائے اور پرندے ان سے خرید لئے جائیں.......... ان فیکٹ وہ ان پرندوں کو مشرق وسطی میں سمگل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور مجھے پرندوں کے حصول کے لئے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ علاقے کے شکاریوں سے میرے تعلقات ہیں اور میں یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔ مجھے درمیان میں لانے سے اسے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس دھندے سے بالکل علیحدہ رہ سکتا تھا۔ وہ ایک سیاستدان تھا اس لئے ایسے کالے دھندے سے کوسوں دور رہنا چاہتا تھا۔ واصف چنگیزی کا مطمع نظر جاننے کے بعد میں نے اس کے لئے کام کرنے کی حامی بھرلی۔ ہمارے درمیان طے پاگیا کہ ہم ایک دوسرے سے قطعی رابطہ نہیں رکھیں گے اور کسی وقت ملنا اشد ضروری بھی ہوا تو یہ ملاقات انتہائی رازداری سے ہوگی.......... میں نے واصف چنگیزی کی ہدایات پر عمل کیا اور علاقے کے شکاریوں سے اونے پونے داموں پرندے خریدنے شروع کردیئے۔ بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ میری طرح جنوبی اور شمالی علاقوں میں بھی واصف چنگیزی نے اپنے ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں جو اس کے لئے ناجائز پرندے اکٹھے کرنے میں مصروف ہیں۔ تاہم پرندوں کی تربیت کی تمام ذمے داری صرف مجھ پر تھی۔ دوسرے علاقوں سے پکڑے گئے اور خریدے گئے پرندے بھی میرے پاس پہنچا دیئے جاتے تھے۔ چند ہفتے پہلے ایک مفرور ڈاکو سولنگی جو دراصل چنگیزیوں کا ایجنٹ ہے ایک کفن میں پرندے بھر کر یہاں لایا تھا.......... تم اس بارے میں جانتی ہی ہو میں خواہ مخواہ تمہیں بتا رہا ہوں۔ جانتی ہو نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ پائپ کے دو تین کش لے کر بولا "اب چنگیزیوں کی سازش کا سارا تانا بانا بکھر چکا ہے۔ ان کے سارے مہرے ہماری نظر میں ہیں۔ مگر وہ کمبخت ہم سے اتنی ہی دور ہے جتنا ان انکشافات سے پہلے تھا۔ میرا خیال ہے تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو۔ مسئلہ وہی حسنی کی بیٹی کا ہے۔ یہ معاملہ بہت نازک شکل اختیار کر گیا ہے۔ جس روز تم لاہور سے آئی ہو اسی روز چنگیزی نے نواز حسنی سے رابطہ قائم کیا ہے اور اس پر واضح کر دیا ہے کہ اگر پولیس نے بڑی حویلی کے کسی فرد پر ہاتھ ڈالا تو وہ اس کی تمام ذمے داری حسنی پر ڈالے گا اور اس کی کم از کم سزا ارسہ کی موت ہوگی۔ ان فیکٹ وہ عیار جاگیردار حسنی کی سب سے نازک رگ ہاتھ میں لے چکا ہے اور اس سے سب کچھ منوا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "سر' میں نے سنا ہے کہ شکست کے بعد واصف چنگیزی ملک چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

خان رحیمی نے لہجے کو مزید دھیما کرتے ہوئے کہا "تم نے درست سنا ہے۔ وہ

باسٹرڈ اس ماہ کی پندرہ تاریخ سے پہلے پہلے یہاں سے فرار ہو رہا ہے۔ اس نے ارسہ کی رہائی کے لئے دو شرطیں رکھی ہیں۔ پہلی یہ کہ پروگرام کے مطابق حسنی اپنی نگرانی میں پرندوں کو مشرق وسطیٰ پہنچائے۔ دوسری یہ کہ ملک سے اس کی بحفاظت روانگی کا انتظام کرے۔ شرائط کے مطابق حسنی کی بیٹی بھی جاگیردار کے ساتھ ہی امریکہ یا کینیڈا جائے گی۔ اور اس کی رہائی وہاں پہنچ کر ہوگی۔"

میں نے پوچھا "اب حسنی صاحب کا کیا ارادہ ہے؟"

خان رحیمی نے کہا "حسنی واقعی ایک دیانتدار شخص ہے۔ اپنے ملک سے اس کی وفاداری ہر شعبے سے بالاتر ہے۔ وہ ایک ایسی کرسی پر بیٹھا ہے جہاں اس کے لئے چنگیزیوں کی ڈیمانڈ پوری کرنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ وہاب چنگیزی اس کے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر گیا تھا مگر اس نے بڑی جرات سے اس دولت کو ٹھوکر مار دی۔ نتیجے میں وہاب چنگیزی نے وہ چال چلی جس نے حسنی کے پہاڑ جیسے حوصلے اور فولاد جیسی جرات کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ وہ چال تھی جس کا کبھی حسنی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آئی تھنک ہم میں سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ حسنی کے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہے۔ انسانی ڈکشنری میں سے شاید ہی کوئی لفظ اس محبت کی شدت بیان کر سکے جو حسنی اپنی بیٹی سے رکھتا ہے۔ گاڈ نو۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے۔"

میں نے پوچھا "تو کیا' وہ اب چنگیزیوں کے مطالبے ماننے پر تیار ہیں؟؟"

خان رحیمی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں......... وہ تیار ہے۔ وہ ایک انسان ہے۔ ایک عظیم رشتے کی محبت میں بندھا ہوا۔ اس کا دوسرا نام مجبوری ہے۔ ہر انسان ایک حد تک برداشت کر سکتا ہے اور حسنی کے لئے یہ حد گزر چکی ہے۔ وہ اپنی معصوم بچی کو بچانے کے لئے زہر کا ہر گھونٹ پینے کو تیار ہے۔"

یکایک ساتھ والے کمرے سے شوروغل کی صدائیں آنے لگیں۔ کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ مجھے پھانسی نہیں چڑھنا ہے۔ جانے دو مجھے۔

ایک دوسری آواز التجائیں کر رہی تھی اور جانے والے کو روکنے کی کوشش میں تھی۔ وہ آواز یقیناً حسنی صاحب کی تھی۔ شوروغل سن کر میں اور خان رحیمی برآمدے

میں پہنچے تو وہاں عجیب منظر دیکھا۔

حسنی صاحب اپنے ایک ہم عمر شخص سے لپٹے ہوئے تھے اور اسے باہر جانے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا شخص محکمہ وائلڈ لائف کا ضلعی انچارج تھا۔ اس کا نام محمد رفیع خان تھا۔ وہ پینترے بدل بدل کر حسنی صاحب کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون کے دباؤ سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ حسنی صاحب کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ "حسنی......... میں بھی بال بچے دار ہوں۔ میں باقی زندگی جیل میں گزارنا نہیں چاہتا۔ تم جانے دو مجھے۔" وہ حسنی کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا باہر صحن تک لے گیا اور پھر خود کو چھڑا کر کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھا اس وقت حسنی کا بیٹا اخترزماں عرف چیف لپک کر آگے آیا اور رفیع خان کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے تو رفیع خان اسے دھکے دے دے کر پیچھے ہٹاتا رہا پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اخترزماں نے بجلی کی طرح تڑپ کر بھاری بھرکم رفیع خان کو زمین سے اٹھایا اور لان کی گھاس پر پٹخ دیا۔ وہ غصے میں بے قابو ہو کر رفیع خان کو گالیاں دے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر خان رحیمی تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے نوجوانوں جیسی قوت اور پھرتی سے رفیع خان کو اخترزماں کے پنجے سے نکالا۔ اتنے میں کچھ اور ملازمین بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے مشتعل اخترزماں کو گھیرے میں لے لیا۔ اخترزماں اچھل اچھل کر اور لپک لپک کر رفیع خان کی طرف آ رہا تھا۔ رفیع خان کے ہونٹوں پر خون تھا اور وہ ہانپتی ہوئی آواز میں باپ بیٹے کو ٹوٹی پھوٹی دھمکیاں دے رہا تھا۔ "تباہ کر دوں گا تم کو......... ایک گھنٹے کے اندر ہتھکڑیاں نہ لگواؤں تو نام نہیں......... دیکھتا ہوں اب کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔"

پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ انڈر سیکرٹری نواز افروز حسنی' اپنے گھر میں جن کا رعب اور دبدبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا' ملازمین کی پرواہ کئے بغیر رفیع خان کے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگے اور اس کی منتیں کرنے لگے کہ وہ یوں انہیں برباد نہ کرے۔

رفیع خان چیخنے لگا۔ "نہیں......... مجھے مارو' مجھے گالیاں دو' اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی نکال لو۔ میں اب رکنے والا نہیں ہوں۔"

خان رحیمی نے اپنی فہم و فراست کو استعمال میں لا کر بڑی مشکل سے اس صورت

حال پر قابو پایا اور شعلے کی طرح بھڑکے ہوئے رفیع خان کو کسی نہ کسی طرح سردار محمد کے ساتھ واپس مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ خان رحیمی نے اخترزماں کو بھی سرزنش کی کہ اس نے اپنی جوشیلی طبیعت سے معاملے کو پیچیدہ تر کر دیا ہے۔ اخترزماں جھاڑ کھانے کے بعد اندر ہی اندر کھولتا ہوا پائیں باغ کی طرف چلا گیا۔ حسنی صاحب سر جھکائے ہوئے پہلے ہی اپنے کمرے کی طرف جا چکے تھے۔ میں خان رحیمی کے ساتھ پھر اس کی خوابگاہ میں آگئی خان رحیمی نے کرسی پر گر کر طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ اب تک ہونے والی جھڑپوں میں سے شدید ترین تھی۔ پرسوں سے حسنی اور رفیع میں مسلسل تکرار ہو رہی ہے......... ان فیکٹ حسنی کی سوچ بھی معقول نہیں ہے۔ وہ ایک زیرک اور جہاندیدہ افسر ہونے کے باوجود بچوں کی طرح سوچ رہا ہے۔ بیٹی کی خاطر وہ چنگیزی کا ہر مطالبہ غیر مشروط طور پر مان لینا چاہتا ہے۔ چاہے اس کوشش میں خود ہی پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے۔ مایوسی کی انتہا کو چھونے کے بعد وہ سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ امریکہ یا کینیڈا پہنچتے ہی چنگیزی اس کی بیٹی کو چھوڑ دے گا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ حسنی ان کے مطالبات پورے کر سکے اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو چنگیزی اتنی آسانی سے اپنے ہاتھ نہیں کاٹے گا۔ وہ بہت سے اور مطالبات بھی حسنی کے سامنے رکھے گا۔ رفیع خان کا اس جھگڑے میں زیادہ قصور نہیں۔ وہ سرکاری ملازم ہے اور اصولی طور پر اپنی انسپکشن کی رپورٹ دینا اس کا فرض ہے۔ اس کی انسپکشن کہتی ہے کہ کروڑوں روپے کے پرندے اس وقت نواز حسنی کی تحویل میں ہیں۔"

میں نے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہونا چاہئے؟"

وہ بولا "ہمارے پاس اب مناسب شواہد موجود ہیں۔ چنگیزی قانون کی مضبوط گرفت میں آسکتا ہے۔ مگر سوال پھر حسنی کی بیٹی کا آجاتا ہے۔ پچھلا ریکارڈ گواہ ہے کہ چنگیزی جدی پشتی بلیک میلر ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس سے پہلے حسنی نے اپنی بیٹی کو رہا کرانے کے لئے طویل اور سر توڑ کوشش کی ہے......... تقریباً ڈھائی ماہ سے وہ دن رات اس کوشش میں لگا ہوا ہے......... یہاں تک کہ اس نے پرائیویٹ طور پر غیر ملکی کمانڈوز کی خدمات بھی حاصل کی ہیں۔ چنگیزیوں کے ڈیرے پر مرنے والے غیر ملکی درحقیقت کمانڈوز ہی تھے۔ ان میں رابرٹ نامی ایک مقتول تو بہت

مشہور شخص ہے۔ مارشل آرٹ کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں اس کا نام اکثر سنا جاتا تھا۔ معلوم نہیں چنگیزیوں کے ڈیرے پر ان چاروں کے ساتھ کیا بیتی۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے' وہ شیر والی بات صحیح ہو۔ ڈھانچوں کے جو فوٹوگراف آپ نے مجھے دکھائے تھے ان میں ایک ڈھانچے کا نرخرہ صاف ٹوٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

خان رحیمی نے میری بات کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ گہری سانس لے کر بولا "وہ چاروں بدنصیب عیدالضحیٰ کے بعد تین اور چار اکتوبر کی درمیانی شب کو شکاریوں کے بھیس میں چنگیزیوں کے ڈیرے کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ چار اکتوبر کو وہ سارا دن اپنے کیمپ کے اردگرد سور کے شکار میں مصروف رہے۔ ان کا کیمپ چنگیزیوں کے ڈیرے سے قریباً پون میل کے فاصلے پر تھا۔ انہوں نے کئی سور مارے اور چنگیزیوں کے خاص ملازم رب نواز سے بھی ان کی ملاقات ہوئی یہ تمام باتیں اس نیم دیوانے اور نیم سیانے نے بتائی ہیں جو ابھی تم سے باتیں کر رہا تھا......... اگلے روز چاروں شکاری اپنے کیمپ سے غائب پائے گئے۔ کچھ عرصہ خاموشی رہی' پھر یہ افواہیں اڑنے لگیں کہ انہوں نے چنگیزیوں کے ڈیرے میں گھسنے کی کوشش کی اور خون خوار درندے کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔"

خان رحیمی کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی الجھا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ کہہ رہا تھا قانون کو آواز دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دوسری طرف سنا رہا تھا کہ چنگیزی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مشہور ہیں۔ تیسری طرف وہ کسی چھاپہ مار کارروائی کے امکان کو بھی رد کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ اس کوشش میں تربیت یافتہ کمانڈوز ہلاک ہو چکے ہیں......... کوٹھی کے کمروں میں آویزاں دیواری گھڑیوں کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ وقت کے قدم ٹک ٹک کی مخصوص چاپ سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بقول خان رحیمی' چنگیزی نے اپنے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے جو ڈیڈ لائن دی تھی اس کے ختم ہونے میں اب صرف 72 گھنٹے باقی تھے۔ 72 گھنٹے کے اندر اندر وہاب چنگیزی کو ملک سے باہر چلے جانا تھا۔ وہیں چلے جانا تھا جہاں وہ میرے بچے کو مارنے سے پہلے تھا۔ آزاد فضاؤں میں۔ عیش و عشرت کی دنیا میں' شرابوں میں' عورتوں میں اور دنیا کی رنگینیوں میں' اسے چلے جانا تھا......... اپنے ہاتھوں کو سلامت لے کر جنہوں نے میرے بچے کی انگلیاں کاٹی تھیں۔ ان آنکھوں کو سلامت لے کر جنہوں نے میرے فرحان کو مرتے دیکھا تھا اور ان

کانوں کو سلامت لے کر جنہوں نے اس کی آخری ہچکی سنی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا' یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر یہ ہو جاتا تو کس ماں کو یہ حق رہ جاتا تھا کہ وہ اپنی آغوش کو اپنے بچے کی پناہ گاہ کہہ سکے؟ جو اپنی بانہوں کو اس کی ڈھال اور اپنے آنچل کو اس کا سایہ کہہ سکے؟ "نہیں وہاب چنگیزی" میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے پکار کر کہا "تم میرے بچے کو مار کر یہاں سے نہیں جاسکتے۔ مجھ سے جیسے بھی ہو سکا' میں تجھ کو روکوں گی' خود مروں گی یا تمہیں مار دوں گی۔ اگر تیری عیاری نے تجھے قانون سے بالاتر کر دیا ہے اور شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی تیرا جرم عدم پتہ ہے' تو میں بھی تجھ تک پہنچنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈلوں گی۔"

میں خان رحیمی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میڈم نادرہ کو کار تلے کچلتے وقت جو دھند میری آنکھوں کے سامنے پھیلی تھی وہ پھر پھیلتی چلی جارہی تھی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک بدلی ہوئی عورت ہوں۔ شرم' خوف اور جھجک کے احساسات مجھ سے کوسوں دور چلے گئے ہیں۔ میں بڑی دلیری سے سوچ رہی تھی۔ اپنے مجرم کو عدالت کے کٹہرے تک لانے کے لئے میں نے بڑی ثابت قدمی سے جدوجہد کی تھی۔ ایک طویل انتظار کیا تھا اور شب و روز دعائیں کی تھیں۔ لیکن......... مراد بر نہیں آئی تھی۔ سب کچھ ثابت ہونے کے باوجود کچھ ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہاب چنگیزی آج بھی محفوظ و مامون تھا۔ وہ اپنا کھیل کامیابی سے کھیل کر اور بے شمار مالی فائدہ حاصل کرنے کے بعد اس ملک سے واپس جارہا تھا۔ اس کی یہ فاتحانہ واپسی مجھے کسی طور پر قبول نہیں تھی......... آخر میں اس فیصلے پر پہنچ گئی جو کئی دنوں سے دھیرے دھیرے میری سوچوں میں پرورش پا رہا تھا......... میں مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلی اور دینو کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ جلد ہی وہ مجھے مل گیا۔ کوٹھی کے عقبی باغ میں وہ خشک پتوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے اس کام سے چھٹی دلائی اور اپنے ساتھ لے کر کمرے میں آگئی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے دینو ایک بہروپیا تھا۔ نت نئے سوانگ رچانے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ کچھ عرصہ اس نے ایک ناٹک کمپنی میں بھی کام کیا تھا۔ یوسف کی

منگنی اور باز ملنے کی خوشی میں جب خان رحیمی نے کوٹھی میں سٹیج شو کا اہتمام کیا تھا تو اس میں دینو نے بھی ایک مزاحیہ روپ دھار کر داد حاصل کی تھی۔ اس وقت مجھے اس کی خداداد صلاحیت کا پتہ چلا تھا' وہ واقعی ایک کامیاب بہروپیا تھا......... کمرے میں جا کر میں نے دینو کو تفصیل سے سمجھایا کہ میں اس سے کیا چاہتی ہوں۔ پہلے تو وہ بے حد حیران ہوا اور اپنی گلابی اردو میں الٹے سیدھے سوال کرنے لگا' تاہم جب اسے یقین ہو گیا کہ میں پوری طرح سنجیدہ ہوں اور یہ سب کچھ خان رحیمی کی ہدایات پر کر رہی ہوں تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ غور و فکر کے بعد اس نے بتایا کہ اس کام کے لئے کچھ وقت چاہئے۔ چند چیزوں کی ضرورت ہے جو وہ ایک دو گھنٹے میں حاصل کر لے گا۔ میں نے اسے تین گھنٹے کی مہلت دے دی۔ ٹھیک تین گھنٹے بعد وہ مجھے لے کر کمرے میں گھس گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے مجھے ایک پھٹا پرانا لباس پہننے کو دیا۔ یہ لباس پہنتے ہی میں اپنی عمر سے کئی سال بڑی لگنے لگی۔ اس کے بعد دینو نے بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے میرے بال قینچی سے کاٹ دیئے۔ یہ کٹنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی نے درانتی سے اونچی نیچی فصل کاٹ دی ہو۔ بعد ازاں اس نے میرے چہرے پر ہاتھ کی صفائی دکھائی اور پندرہ بیس منٹ میں مجھے ایک بدصورت ادھیڑ عمر عورت کا روپ دے دیا۔ میں نے آئینے میں چہرہ دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ سوچنے لگی کہ اگر ایک ان پڑھ بہروپیا چہرے کو اتنا بدل سکتا ہے تو جدید دور کے میک اپ مین کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے دانت پیلے زرد تھے۔ آنکھوں میں مصنوعی گیڈ تھی اور چہرے کی جلد بری طرح مرجھائی ہوئی تھی۔ دینو بہروپ بھرنے کے لئے جو سامان لایا تھا اس میں ایک استرا بھی تھا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے یہ استرا لباس میں چھپا لیا۔ میری یہ حرکت دیکھ کر دینو جو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا کچھ اور ڈر گیا۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "بی بی جی' مینوں تو کوئی لمبا ہی چکر لگتا ہے۔ ایسے سین پٹ تو ڈراموں میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گڑ بڑ والا معاملہ ہے تو مینوں دس دیو۔ میں چھٹی کر جاؤں۔ یہ نہ ہو بعد میں پولیس مینوں بھی آگے لایا ہووے۔ میں تو ویسے ہی پولیس سے بڑا ڈرکدا ہوں۔"

میں نے پوچھا "تم کیوں یکدم' 'ہو پولیس سے؟"

وہ بولا "بس جی وہی زیوروں والا معاملہ ہے۔ خانخا گھر میں چھپا کے وقت ڈال ہوا

ہے میں نے اپنی جان کو۔ اب تو سوچا ہے کہ تھانے میں ہی جمع کرا دوں۔ اور کچھ نہیں تو پولیس والوں کے کم تو آئیں گے۔"

میں نے دینو کو سمجھا دیا کہ وہ میرے بہروپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور اس وقت تک اپنی زبان بند رکھے گا جب تک میں واپس نہیں آجاتی۔ (ویسے مجھے واپس آنے کی امید کم ہی تھی) میں بڑی بے قراری سے تاریکی پھیلنے کا انتظار کرنے لگی۔ میں کوٹھی سے اس طرح نکلنا چاہتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ خاص طور پر سلیم کی نظروں سے بچنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے میرے ارادوں کی بھنک بھی پڑے۔ میں جس خطرے میں کودنے جا رہی تھی اس سے سلیم کو کوسوں دور رکھنا چاہتی تھی۔ وہ پہلے ہی میری وجہ سے بہت دکھ جھیل چکا تھا۔ جونہی شب کی سیاہی پھیلی میں نے خان رحیمی کے لئے لکھا ہوا خط دینو کے حوالے کیا اور اسے سمجھایا کہ یہ خط اسے کس وقت اور کس جگہ رکھنا ہے۔ اس کے بعد میں نے خود کو ایک موٹی گرم چادر میں لپیٹا اور کوٹھی سے نکل آئی۔

خان رحیمی کی کوٹھی سے بڑی حویلی پہنچنے اور وہاں سے چنگیزیوں کے ڈیرے تک آنے میں مجھے ایک دن لگ گیا۔ اس سفر کا حال کافی طویل ہے لہٰذا میں اصل واقعات کی طرف آتی ہوں۔ جس دن میں وہاں پہنچی وہ جمعرات کا دن تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جمعرات کے روز سہ پہر کے وقت ڈیرے سے باہر بہت سے غریب غربا اکٹھے ہوتے ہیں یہاں کسی نامعلوم فقیر کا ایک چھوٹا سا مزار تھا۔ مزار بھی کیا تھا بس ایک پختہ ڈھیری سی تھی۔ یہاں قوالیاں ہوتی تھیں۔ چمٹے بجائے جاتے تھے۔ نعرہ زنی ہوتی تھی۔ بعض لوگ گھنگھرو پہن کر ناچنے بھی لگتے تھے۔ جن دنوں میں اس منحوس ڈیرے پر قید تھی میں نے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی یہ سب آوازیں سنی تھیں۔ میری اطلاعات کے مطابق ہر جمعرات کو وہاب چنگیزی یہاں آتا تھا اور غریبوں مسکینوں میں کپڑا اور کھانا وغیرہ تقسیم کرکے اپنی جاگیرداری کا غرور بڑھاتا تھا۔ وہاب چنگیزی سے پہلے یہ "جاگیردارانہ فرض" میرا شوہر واصف ادا کیا کرتا تھا۔ بڑی حویلی کے دستور کے مطابق جمعرات کے روز حویلی میں کپڑے کے بڑے بڑے تھان آتے تھے اور دیگیں پکائی جاتی تھیں۔ تھانوں اور دیگوں کی تعداد اتنی ہی ہوتی تھی جتنے گھر کے افراد' سب لوگ ایک ایک تھان اور ایک ایک دیگ پر ہاتھ رکھتے تھے۔

اس کا مطلب ہوتا تھا یہ خیرات ان کے نام پر تقسیم کی جائے گی۔

کچھ عرصہ پہلے میں خیرات دینے والوں میں تھی' آج خیرات لینے والوں کے ہجوم میں دم سادھے بیٹھی تھی۔ یہ ایک طویل قطار تھی۔ یہ مزار کی ڈھیری سے شروع ہوتی تھی اور اس کا دوسرا سرا مالٹوں کے باغ تک پہنچتا تھا۔ اس قطار میں علاقے بھر کے خستہ حال بھیک منگے شامل تھے۔ وہ سوکھے سوکھے منہ بنائے منتظر نگاہوں سے ڈیرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے وہاب چنگیزی کو نمودار ہونا تھا۔ دیگوں اور کپڑے کے تھانوں والے تین چھکڑے پہنچ چکے تھے اور ان کو دیکھ دیکھ کر بھوکوں ننگوں کو اپنی ضروریات اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ موٹی گرم چادر کے نیچے میرا ہاتھ تیز استرے کے دستے کو ٹٹول رہا تھا۔ میں آج اس زمین کو چنگیزی کے وجود سے پاک کر دینا چاہتی تھی۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی کہ میرے استرے کی دھار وہاب چنگیزی کی موٹی سرخ گردن تک پہنچنے سے پہلے مجھے موت نہ آئے۔ ایک دفعہ میں چنگیزی کا نرخرہ کاٹ دیتی اور اسے بے دم ہو کر زمین پر گرتے دیکھ لیتی اس کے بعد مجھے موت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اب سوچتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں کہ اس وقت مجھے موت کتنی بے وقعت چیز محسوس ہو رہی تھی۔ اگر کوئی خوف تھا تو وہ صرف اپنی ناکامی کا تھا۔ ناکامی کئی صورتوں میں آ سکتی تھی۔ کسی کو مجھ پر شبہ ہو جاتا' کوئی مجھے پہچان لیتا' یا مجھے چنگیزی پر جھپٹتے دیکھ کر دبوچ لیتا' یہ بھی ممکن تھا کہ میں چنگیزی کو بر وقت اور صحیح زخم نہ لگا پاتی' ان سارے اندیشوں اور ساری امیدوں کو سینے میں دبائے میں فیصلہ کن لمحے کی منتظر بیٹھی رہی۔ آخر باغ کی طرف سے شور سنائی دیا۔ ساری قطار اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور امید بھری نظروں سے ڈیرے کی طرف دیکھنے لگی۔ جاگیردار کے لٹھ بردار کارندوں نے بھیک منگوں کو مار مار کر قطار سیدھی کی اور سب کو نیچے بٹھا دیا۔ غلیظ کپڑوں کے اندر سے خالی برتن نکل کر چمکنے لگے۔ میں نے دور سے جاگیردار کا سرخ لباس دیکھا وہ خیرات بانٹتا ہوا دھیرے دھیرے ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے مسلح محافظ تھے۔

یہ لوگ کچھ اور نزدیک آئے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ استرے کے دستے پر خود بخود میری گرفت ڈھیلی ہوگئی اور میں بجھی ہوئی نظروں سے اپنے سامنے دیکھنے لگی۔ خیرات بانٹنے کے لئے وہاب چنگیزی کی جگہ میرا دیور شجاع آیا تھا۔ میں اسے صاف

پہچان سکتی تھی دست قدرت میرے اور وہاب کے درمیان آگیا تھا۔ میں گم صم بیٹھی رہی۔ میرے دیور نے میرے سر پر سوتی کپڑے کا ایک تہہ شدہ ٹکڑا رکھ دیا اور میری جھولی میں کچھ پلاؤ اور زردہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ میں اپنے بہروپ کا بھرم رکھنے کے لئے جھولی میں سے لقمہ لقمہ چاول نکال کر کھاتی رہی اور ان لوگوں کی بے بسی کا منظر دیکھتی رہی جو زیادہ چاول اور کپڑا حاصل کرنے کے لئے شجاع کے پاؤں چھو رہے تھے اور منتیں سماجتیں کر رہے تھے۔ تقریباً" ایک گھنٹے بعد یہ ہنگامہ ختم ہوا اور پیپل کے ایک درخت تلے لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ مجھے وہاں چنگیزیوں کا ملازم خاص رب نواز بھی کھڑا نظر آیا۔ میں اسے لمبے قد کی وجہ سے صاف پہچان گئی۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بھی دھیمی چال چلتی درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ پچھلے پہر کی نرم دھوپ شاخوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ رب نواز کی باتیں سن کر پتہ چلا کہ وہ مالٹوں کی چھانٹی کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو کام پر لگانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ اسے کام پر لگایا جائے۔ غالباً" معاوضے میں چند درجن گلے سڑے پھل ملنے کا مکان تھا۔ رب نواز نے امیدواروں کو دو قطاریں بنانے کا حکم دیا۔ چند لمحوں میں قطاریں بن گئیں۔ میں بھی غیرارادی طور پر ایک قطار میں کھڑی ہو گئی۔ رب نواز اور اس کے ساتھی مزدوری کے لئے امیدواروں کو چھانٹنے لگے۔ لگتا تھا پھل کے بدلے یہ مزدوری یہاں اکثر کی جاتی ہے۔ کیونکہ سب لوگ طریقہ کار سے واقف تھے۔ جونہی رب نواز کسی مرد یا عورت کو اشارہ کرتا وہ خوشی خوشی ایک درخت کے نیچے جا کھڑا ہوتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رب نواز اور اس کے ساتھی تنومند مردوں کو چھانٹ رہے ہیں یا نوجوان خوش شکل عورتوں کو۔ ظاہر ہے جاگیرداروں کے کارندوں کو اپنی آنکھیں سینکنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس بھرتی میں میرا انتخاب مشکل ہے۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ پھر رب نواز کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی ایک ساعت کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے نظرانداز کر دے گا مگر اچانک میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ میرے بدن پر سرتاپا سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ دیر کے لئے رب نواز کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ مجھے وہ منظر یاد آگیا جب شیخوپورہ کے نواح میں سرکنڈوں کے اندر عابد کی موت کے بعد میں گڑھے میں گر گئی تھی اور رب نواز نے ٹارچ کی روشنی میں میرا چہرہ دیکھا تھا۔ چہرہ

دیکھنے کے بعد وہ خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ آج ایک بار پھر ویسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ چند ساعتیں جو برسوں پر بھاری تھیں گزر گئیں اور میں نے رب نواز کی آواز سنی۔ وہ مجھے قطارے سے آگے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں قطار سے نکلی اور تیز قدموں سے چلتی درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے مزدوری کے لئے چن لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں آٹھ دس اور مرد و زن درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ باقیوں کو واپس جانے کی ہدایت کی گئی۔ رب نواز اور اس کے ساتھی ہمیں لے کر باغ کے اندر آگئے۔ کچھ ہی فاصلے پر اس زرد چاردیواری کی جھلک نظر آئی جس کے اندر فرحان نے دم توڑا تھا اور میں نے بے شمار ذلتیں جھیلی تھیں۔ اس چاردیواری کو دیکھتے ہی میرا تن بدن پھنکنے لگا میں نے کن اکھیوں سے رب نواز کی طرف دیکھا۔ وہ میرے وجود سے اب بالکل غافل ہو چکا تھا۔ اس کے کسی انداز سے ظاہر نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید میں غلطی پر ہوں' ہو سکتا ہے رب نوز پہلی دفعہ مجھے دیکھنے اور دوسری دفعہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا ہو۔ انہی سوچوں میں کھوئی میں مالٹوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کے سامنے آبیٹھی اس میں ہر طرح کے مالٹے تھے۔ چھوٹے بہت چھوٹے' بڑے بہت بڑے' خوش نما خوبصورت ٹیڑھے میڑھے اور گول مٹول' سڈول اور پلپلے' کچھ آدمی مالٹوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنا رہے تھے ہمیں ان مالٹوں کو کریٹوں اور بوریوں میں بھرنے کا کام کرنا تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں بھی کام میں لگ گئی۔ رب نواز دو تین بار میرے قریب سے گزرا لیکن اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میرے پاس ہی ایک عورت کام کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے بچے کو گود میں ڈالے دودھ بھی پلا رہی تھی۔ بچہ ماں کی مصروفیت سے بدمزہ ہو کر رو رہا تھا۔ عورت نے اسے ڈانٹتے ہوئے سرگوشی کی "چپ کر جا چھوٹو' نہیں تو جاگیردار کا شیر تمہیں کھا جائے گا" اس معمولی سی سرگوشی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ عورت بچے کو ڈرانے کے لئے روایتی شیر کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔ یہ سچ مچ کا شیر تھا جو سامنے والی زرد چار دیواری کے اندر کہیں بند تھا' اور اگر وہ اب تک ان مفلوک الحال مزدوروں سے دور تھا تو یہ جاگیردار کی مہربانی تھی۔ اپنی ایسی ہی "مہربانیوں" سے جاگیردار نے ان مفلوک الحال لوگوں کو احسانوں کے بوجھ تلے دبا رکھا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں کرتے تھے اور کہتے تھے کتنا اچھا ہے ہمارا جاگیردار' اس کے پاس ایک جیتا جاگتا شیر ہے پھر

بھی وہ اس شیر کو ہمارے اوپر نہیں چھوڑتا۔ شیر کا تصور ذہن میں آتے ہی میرے جسم میں تپش سی جاگنے لگی۔ جی چاہا زرد چاردیواری پھاند کر اندر جاؤں اور مرنے سے پہلے وہاں موجود ہر درندے کو جان سے مار ڈالوں۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہاب چنگیزی کا ایک کارندہ تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کیوں ری، مسلمان ہے؟"

میں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا "روٹیاں لگالے گی تندور میں؟"

"ہاں ہاں لگالوں گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کار کرنے کے بعد مجھ سے مل لینا۔ میں ادھر بیٹھا ہوں سامنے چھپر تلے۔"

میں اس امداد غیبی پر حیران ہونے لگی۔ خودبخود کوٹھی کے اندر جانے کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ پھر میرا دھیان رب نواز کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ بھی تو رب نواز کی مہربانی نہیں تھی۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اس بات پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا کہ رب نواز مجھے پہچان چکا ہے اور کسی خاص وجہ سے میرے لئے راستہ کھول رہا ہے۔ مجھے اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد اچانک کوٹھی کی پچھلی جانب سے ایک خوفناک دھاڑ سنائی دی کافی فاصلہ ہونے کے باوجود میں پہچان سکتی تھی۔ یہ چڑیا گھر کے شیر سے ملتی جلتی آواز تھی۔ یہ آواز سنتے ہی باغ میں کام کرنے والے مرد وزن سہم گئے۔ سکڑی سہمی عورتوں کو دیکھ کر جاگیردار کے کارندے مونچھوں کو تاؤ دینے اور مسکرانے لگے۔ جیسے وہ خود بھی شیر ہوں، اور انہیں ہر کمزور اور جاندار کو پھاڑ کھانے کا اختیار حاصل ہو۔

ہم شام تک کام میں مصروف رہے۔ اس دوران میں رہ رہ کر سوچتی رہی کہ ارسہ کو چھڑانے کی کوشش میں ہلاک ہونے والے وہ چاروں افراد اتنے سخت پہرے سے گزر کر ڈیرے کے اندر کیونکر پہنچ پائے۔ یقیناً انہوں نے بڑی جرات سے کام لیا تھا۔ ایک اور بات بھی الجھا رہی تھی اور وہ یہ کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہو پایا تھا۔ فرخندہ کے ساتھی اشفاق شاہ کی پہلی رپورٹ کے مطابق ہلاک شدگان کی تعداد تین تھی لیکن تصویروں میں چار ڈھانچے دکھائی دے رہے تھے.......... میں انہی سوچوں میں گم

تھی جب سارا کام ختم ہو گیا۔ میں اس شخص کے پاس پہنچی جس نے روٹیاں لگانے کے بارے میں کہا تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا پھر مجھے لے کر کوٹھی کے اندرونی حصے میں آ گیا۔ یہ سب در و دیوار میرے جانے پہچانے تھے۔ اس شخص نے کہا پہلے میں اچھی طرح منہ ہاتھ دھولوں پھر باورچی خانے کی طرف چلی جاؤں۔ سامنے ہی نلکا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے ہاتھ دھوئے۔ پھر اوڑھنی کا پلو بھگو کر چہرے سے گرد صاف کرنے لگی۔ میں منہ دھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اس صورت میں وہ ساری سیاہی اور سریش وغیرہ دھل جاتی جو دینو نے میرے چہرے اور ہاتھوں پر لگائی تھی۔ آنکھوں کی مصنوعی گیڈ وغیرہ صاف کرنے کے بعد میں تیار ہو گئی تو باورچی خانے کی طرف آ گئی۔ باورچی خانے میں پہلے سے دو ملازم مصروف تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ ایک بڑا سا تندور بھی لگا ہوا تھا۔ غالباً ملازموں کو میرے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا۔ جونہی میں پہنچی ایک کرخت عورت نے بڑی بڑی دو پراتیں میرے سامنے رکھ دیں اور مرد ملازم نے آٹے کا ایک بورا گھسیٹ کر میرے آگے کر دیا۔ میں رات گئے تک آٹا گوندھ کر وقفے وقفے سے روٹیاں لگاتی رہی۔ اس دوران رب نواز دو دفعہ مجھے دیکھنے آیا۔ اس کے کندھے سے ایک طاقتور رائفل جھول رہی تھی۔ اپنے چہرے سے اس نے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا میرے بارے کوئی شک رکھتا ہے.......... قریباً دس بجے میں کام سے فارغ ہوئی اور چند لقمے کھا کر برآمدے میں سونے کے لئے چلی گئی۔ سردی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا اور ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی تھی۔ برآمدے میں ہوا کی آمدورفت کو روکنے کے لئے بوسیدہ سی چقیں لگائی گئی تھیں۔ یہ چقیں ہوا کے زور پر دیوہیکل چمگادڑوں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھیں۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر وہی موٹی سی سخت گیر عورت سو رہی تھی جسے میں نے باورچی خانے میں کام کرتے دیکھا تھا۔ اس کے خراٹے اپنی مثال آپ تھے۔ انہیں "ڈبل خراٹے" ہی کہا جا سکتا ہے۔ نہ صرف وہ سانس چھوڑتے ہوئے آواز نکالتی تھی بلکہ سانس لیتے ہوئے بھی ایک پرہول گونج پیدا کرتی تھی.......... رات کے قریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے جب میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور لحاف ہٹا کر چارپائی سے اتر آئی۔ میں شام ہی کو اندازہ لگا چکی تھی کہ مغویہ لڑکی کہاں ہو گی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی، کیوں میں

خود بھی اس زندان کی قیدی رہ چکی تھی۔ لڑکی انہی کمروں میں تھی جہاں میں نے اپنی زندگی کے ہولناک ترین دن گزارے تھے۔ چپل پہنے بغیر میں دھیمے قدموں سے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔ تیزدھار استرا میرے لباس میں موجود تھا اور سینے میں عجیب طرح کی بے خوفی بھری ہوئی تھی۔ دو چھوٹی چھوٹی راہداریوں سے گزر کر میں ایک چھوٹے سے احاطے سے گزری۔ یہاں گھوں گھوں کی پر شور آواز سے وہ جنریٹر چل رہا تھا جو کوٹھی کو بجلی فراہم کرتا تھا۔ احاطہ پار کر کے میں ان کمروں کے سامنے آگئی جہاں میں نے قید کاٹی تھی اور اب میرے جیسی کوئی اور اذیت کے دور سے گزر رہی تھی۔ یہ کل دو کمرے تھے۔ میں نے دونوں کے دروازوں سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا جب کہ دوسرے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ ارسہ اسی کمرے میں ہو گی۔ مزید تسلی کے لئے میں گھوم کر گرل دار کھڑکی کے سامنے آئی۔ کھڑکی کی درزوں اور اس کے اوپر روشندان میں سے ہلکی ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ ایک اکیلی لڑکی تاریک کمرے میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ نصف شب کے وقت بھی کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ میں خود بھی ساری ساری رات بتی جلائے بیٹھی رہتی تھی اور رو رو کر فرحان کو پکارتی رہتی تھی۔ میں نے اپنی انگوٹھی کے ساتھ لوہے کی گرل کو دو تین دفعہ بجایا۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک تاریک گوشے میں ہو گئی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے اور جالی کی دوسری طرف کسی لڑکی کا ہیولا نظر آیا۔ میرے لئے یہی کافی تھا میں گھوم کر دروازے پر آئی اور کنڈی کھول کر اندر چلی گئی۔ کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا اور بلب کی روشنی میں ایک لڑکی نظر آ رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل و صورت سے بڑی معصوم لگتی تھی۔ اس کے چمکیلے بال بوائے کٹ تھے۔ اس نے ایک میلی سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پینٹ کو اب نیکر کہنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ وہ گھٹنوں سے نیچے نیچے سلامت نہیں رہی تھی۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ نواز حسنی صاحب کی چہیتی بیٹی ارسہ ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کی شفاف آنکھوں میں ہراس نظر آیا۔ شاید میرے حلئے سے وہ مجھے کوئی بری عورت سمجھی تھی۔ ڈر کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور نرم لہجے میں کہا "گھبراؤ نہیں' ارسی میں دشمن نہیں

دوست ہوں۔"

میرے لہجے اور اپنے نام سے اس کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ وہ کان کی لو کو کھینچتے ہوئے بولی "کون ہو تم.......... اور یہاں کیوں آئی ہو؟"

میں نے کہا "تم آرام سے بیٹھو' میں سب کچھ بتاتی ہوں۔"

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کرنے کے بعد اس کے پاس کرسی سنبھال لی۔ کبھی اس طرح میں اس مسہری پر بیٹھی تھی اور رحمت میرے لئے رہائی کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ یہ رہائی میرے لئے عمر بھر کی قید بن جائے گی.......... میں نے دھیرے دھیرے اور محتاط لہجے میں ارسی کو صورت حال سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے یہاں سے نکالنے کے لئے آئی ہوں' اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے یہ بھی کہا کہ پولیس کے آدمی بھی میرے ساتھ موجود ہیں اور وہ سادہ لباس میں کوٹھی کے اندر پہنچ چکے ہیں۔ ارسی بار بار اپنے ڈیڈی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ کیسے ہیں؟ وہ بیمار تو نہیں؟ اس کی بے قراری دیدنی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مجھے اور پولیس کو اس کوٹھی میں بھیجنے والے صرف اور صرف اس کے پاپا ہیں۔ وہ بار بار اپنے پاپا کا ذکر کر کے سسکنے لگتی تھی۔ ایک بار تو اس نے روتے ہوئے میرے ہاتھ تھام لئے اور التجا کرنے لگی کہ میں جلد سے جلد اسے اس کے پاپا کے پاس لے جاؤں۔ یہاں اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ مر جائے گی۔

میں نے کہا "ارسی! ذرا حوصلے سے کام لو۔ یہ سب کچھ اتنی جلد ممکن نہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی.........."

اسے چپ کرانے کے بعد میں نے اس سے یہاں کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے اسے ابھی تک کوئی تکلیف نہیں دی۔ صرف ایک بار اس نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی تو انکل نے اسے رات کو کھلے آسمان تلے سردی میں بٹھا دیا تھا۔ وہ ساری رات کپکپاتی رہی۔ صبح اسے شدید بخار ہو گیا۔ اس کی بیماری سے انکل پریشان ہو گئے اور انہوں نے ڈاکٹر کو بلا لیا۔

میں نے پوچھا "یہ انکل کون ہے؟"

جواب میں ارسی نے بتایا "وہی جو اس کوٹھی کے مالک ہیں۔"

میں نے وہاب چنگیزی کا حلیہ بتایا تو ارسی نے تصدیق کی کہ ہاں یہی وہ شخص ہے جسے وہ انکل کہتی ہے۔ اسے ارسی کا بھولپن ہی کہا جاسکتا تھا کہ جو درندہ اسے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا اور جس نے اس کے پاپا کو ایک ناقابل بیان آزمائش میں ڈال رکھا تھا' اسے وہ انکل کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی ایک کلائی پر خراشوں کے نشان دیکھے تو پوچھا یہ کیا ہے؟"

خراشوں کو دیکھ کر وہ اچانک رنجیدہ ہوگئی۔ چہرہ بجھ سا گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے۔ میرے دل میں انجانے خدشے جاگ اٹھے۔ میں نے پوچھا۔

"ارسی سچ بتاؤ۔ کیا کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی مجھے اس کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ بچوں اور بعض نوجوانوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی مصیبت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی مصیبت جس میں ہتک' توہین' شرم یا خوف کا پہلو نکلتا ہو۔ میں نے خیال کیا کہ ارسی بھی کچھ چھپا رہی ہے۔ میرے بار بار پوچھنے پر وہ باقاعدہ رونے لگی۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے مجھے جو کچھ سمجھایا اس سے پتہ چلا کہ یوں تو وہ یہاں خیریت سے ہے لیکن "انکل" کا لڑکا موقع دیکھ کر اسے تنگ کرنے آ جاتا ہے۔ میں حیرانی سے سوچنے لگی کہ یہ انکل کا لڑکا کون ہے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں شجاع کا خیال آیا۔ شاید وہ وہاب کے چھوٹے بھائی کو اس کا بیٹا سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنے دیور شجاع کا حلیہ بیان کیا تو ارسی نے اس حلیے کی بھی تصدیق کی۔ ارسی نے بتایا کہ آج انکل کوٹھی میں نہیں تھے۔ شاید وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ شام کے بعد ان کا بیٹا کمرے میں آگیا اور بے ہودہ باتیں کرتا رہا۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شجاع کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوما اور پہلی بار مجھے اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔ وہ اس باغ کا درخت تھا جس کی ہر شاخ کڑوا پھل دیتی تھی۔ زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔ جب میں دلہن کے روپ میں بڑی حویلی پہنچی تھی اور رسم کے مطابق شجاع میرے گھٹنے پر بیٹھ کر مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا۔ میں نے کتنی محبت سے اس کی روشن پیشانی چومی تھی۔ تب کیا معلوم تھا میں ایک ناگ زادے کو چوم رہی ہوں۔

میں کچھ دیر ارسی کے پاس بیٹھی اسے تسلی تشفی دیتی رہی۔ میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ اب مصیبت ٹلنے والی ہے۔ میں کل کسی وقت پھر تمہارے پاس آؤں گی اور ہو سکتا ہے ہم کل ہی یہاں سے نکل چلیں۔"

وہ بولی "نہیں.......... میں ابھی جانا چاہتی ہوں۔ آخر ان لوگوں نے کیوں قید کر رکھا ہے مجھے' میں نے یا میرے پاپا نے کسی کا کیا بگاڑا ہے.......... میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں' میں ایک پل یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں مرجاؤں گی۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی' نہیں خدا کے لئے' مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ اب مجھ سے یہ کمرہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں باہر نکل کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا اور کسی بچے کی طرح رونے لگی۔ مجھے اس پر بے پناہ ترس آیا۔ وہ ایسے سانس لے رہی تھی جیسے سچ مچ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے اپنے شب و روز یاد آگئے' جب میں اس کمرے سے نکلنے کے لئے اسی طرح تڑپا کرتی تھی۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور پیار سے کہا۔

"ارسی! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہی۔ خدا کی قسم نہیں جا رہی لیکن تھوڑا سا صبر اور کرو۔ ایک یا دو دن.........."

میری نصیحت بے اثر تھی۔ شاید اسے صبر کا یارا ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی "پلیز......... ایک بار......... مجھے پاپا کی صورت دکھادو۔ ایک بار مجھے ان کے پاس لے چلو وہ سب ٹھیک کرلیں گے۔"

میں اسے گلے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ پھر بمشکل اس سے اپنی اوڑھنی کا پلو چھڑایا اور اسے مسہری پر بٹھا کر اور تسلی تشفی دے کر باہر نکل آئی۔ راہداری تاریک تھی۔ ساتھ والے برآمدے سے کسی پہریدار کے قدموں کی مسلسل چاپ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ بند کرکے بہ آہستگی کنڈی چڑھا دی۔ کنڈی چڑھاتے وقت مجھے "دھپ" کی ہلکی سی آواز آئی۔ آواز سنتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کمرے کے اندر سے آئی ہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ ارسی کے گرنے کی آواز ہے۔ میں نے کنڈی دوبارہ کھولی اور دروازے کو آہستگی سے دھکیل کر اندر جھانکا۔ دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ ارسی مسہری

سے فرش پر گری ہوئی تھی۔ جلدی سے اندر گھس کر میں نے دروازہ بند کیا اور ارسی کی طرف لپکی صدمے کے شدت سے وہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے بار بار اس کے گال تھپتھپائے اور سرگوشی میں پکار کر کہا "ارسی آنکھیں کھولو۔ ارسی ہوش کرو" اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور چہرہ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں بے تاب ہو کر اٹھی اور پانی لینے کے لئے باہر کی طرف لپکی چند لمحوں کے لئے میں بالکل فراموش کر چکی تھی کہ میں کہاں اور کس حیثیت سے ہوں۔ نلکے پر جھک کر جب میں اوک میں پانی لے رہی تھی' ایک پہریدار نے مجھے دیکھ لیا۔ "کون؟" اس کی کرخت آواز اندھیرے میں گونجی۔ میں اس آواز کو نظرانداز کرتی ہوئی کمرے میں آئی اور ارسی کے چہرے پر چھینٹے دینے لگی۔

پہرے دار بھاگتا ہوا میرے پیچھے آیا تھا۔ اس نے رائفل کی نال سے مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟"

پھر اس کا دھیان بے ہوش ارسی کی طرف گیا "اسے کیا ہوا؟"

اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔ میری نظر ایک گلاس پر پڑی۔ اس میں پانی موجود تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر یہ پانی ارسہ کے ادھ کھلے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کا ایک گھونٹ اس کے اندر گیا تو اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ میں اسے جھنجوڑنے لگی "ہوش کرو لڑکی.......... آنکھیں کھولو۔"

اس دوران دو تین اور پہرے دار بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ارسی نے آنکھیں کھولیں تو میری جان میں جان آئی.......... فرخندہ اور عبدل کی موت کے بعد مجھے ہر طرف موت ہی ناچتی محسوس ہو رہی تھی۔ ارسی کو غیر حالت میں دیکھ کر نہ جانے کیا کیا منحوس خیال آنے لگے تھے۔ ارسی کی خوابیدہ نگاہ مجھ پر پڑی۔ اور جم کر رہ گئی۔ اس نے ایک بار پھر میری اوڑھنی کا پلو تھام لیا اور غنودگی کے عالم میں پکارنے لگی۔ "مجھے چھوڑ کر نہ جانا.......... پلیز مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔"

پہرے دار کڑی نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ اب ان میں میرا دیور شجاع بھی شامل ہو چکا تھا۔ میں نے اوڑھنی کو اپنے سر پر کچھ اور جھکا لیا۔ شجاع نے پہرے داروں سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

ایک پہرے دار نے ادب سے کہا "چھوٹے چودھری جی۔ اس نے رات روٹیاں لگائی تھیں۔ مختاراں نام ہے اس کا۔ کل مزدوروں کے ساتھ باغ میں آئی ہوئی تھی۔"

شجاع نے کڑک کر پوچھا "اس طرف کیوں آئی تھی مائی؟"

میں نے سر جھکائے جھکائے کہا "غلتی ہو گئی چودھری جی۔ پانی پینے اٹھی تھی۔ رونے کی آواج سن کر ادھر آ گئی۔"

شجاع گرجا "بکواس بند کر۔ رونے کی آواز پہرے دار کو کیوں نہیں آئی۔ سچ بتا کیوں آئی تھی ادھر؟"

رب نواز بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ بولا "میرا خیال ہے چوری شوری کی نیت بن گئی ہو گی اس کی.........."

ایک دوسرا پہریدار بولا "مجھے تو لگتا ہے.......... کوئی چکر ہے۔ یہ اندر گھس کر میم صاحب سے باتیں بھی کرتی رہی ہے۔"

شجاع نے آگے بڑھ کر میرے بال مٹھی میں جکڑنا چاہے مگر بال ہوتے تو جکڑے جاتے۔ اس نے ایک ٹھوکر میری کمر میں ماری اور چیخ کر بولا "کون ہے تو مائی' سچ سچ بتا ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا۔"

میرا سر اور بھی جھکتا جا رہا تھا۔ ہر لحظہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی پہچان لی جاؤں گی۔ دو تین مزید ٹھوکریں کھانے کے باوجود میں نے کچھ نہیں بتایا تو شجاع نے غضب ناک ہو کر ارسہ کے بال پکڑ لئے اور اس کے سر کو آگے پیچھے جھلاتا ہوا بولا "کیوں مکر کر رہی تھی۔ کون مر گیا تھا تیرا جو بے ہوش ہو گئی تھی' الو کی پٹھی۔ بتا مجھ کو' کون ہے یہ مائی۔ کیا کرنے آئی تھی تیرے پاس؟"

رب نواز نے کہا "چھوٹے چودھری! یہ سارا قصور اس میم صاحب کا ہے۔ نہ یہ روتی' نہ یہ مائی اس طرف آتی۔ میں نے خود اس کے رونے کی آواز سنی تھی۔"

شجاع نے دانت کچکچا کر ایک ٹھوکر ارسہ کو بھی ماردی۔ پھر پہرے دار پر برسنے لگا کہ وہ ارسہ کے رونے کی آواز کیوں نہ سن سکا۔ تب اس نے پہریداروں کو ہمارے بارے میں کوئی سخت ہدایت دی اور پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ اس نے

ہم دونوں کو سخت سردی میں کھلے آسمان تلے باندھنے کا حکم دیا تھا۔ پہریدار ہمیں دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے اور اس چھوٹے سے احاطے میں ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ باندھ دیا جہاں ایک طرف جنریٹر کی گھوں گھوں کان پھاڑ رہی تھی اور دوسری طرف کیاریاں تھیں جن میں بے پھول کے پودے لگے ہوئے تھے۔

رات بے انتہا سرد اور تاریک تھی۔ میرے جسم پر تو پھر بھی ایک موٹی اوڑھنی تھی، لیکن ارسہ کے جسم پر ایک ہلکی بشرٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس بشرٹ پر سامنے کی طرف "پاپا" کے بڑے بڑے الفاظ پرنٹ تھے۔ جس وقت ارسہ نے یہ بشرٹ خریدی ہوگی یا اس کے پاپا نے اسے لا کر دی ہوگی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ایک روز یہی بشرٹ پہن کر ایک جاگیردار کے حکم پر اسے سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات بسر کرنا ہوگی۔ اس وقت اس کا بدنصیب پاپا اس سے اتنی ہی دور ہوگا جتنا مشرق سے مغرب، سخت سردی میں طویل شب جیسے ایک مقام پر آکر رک گئی تھی۔ صبح کی منزل ہزارہا میل کے فاصلے پر محسوس ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد اندھیرے میں جب ہماری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں اور ہم نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کوئی اور بھی ہمارے ساتھ سردی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ یہ وہی پہریدار تھا۔ جسے شجاع نے اس بات پر جھاڑا تھا کہ وہ ارسہ کے رونے کی آواز کیوں نہیں سن سکا۔ اسے دیکھ کر ہم دونوں کو اپنی تکلیف کم محسوس ہونے لگی۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ رسی کے ذریعے اسے جنریٹر کے جنگلے کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے دانت بجنے کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔ آج سے تین چار سال پہلے انسانی بے بسی کے یہ مناظر میرے تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ یہ ظلم، یہ سزائیں اور یہ سارا ماحول بے حد افسانوی تھا۔ مگر اس جاگیر میں پہنچنے اور چنگیزیوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد اب کوئی انہونی میرے لئے انہونی نہیں رہی تھی۔

میں نے ارسہ کی طرف دیکھا وہ گردن گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ خاص طور پر کھلے آسمان کا منظر اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ حالانکہ یہاں اذیت ناک سردی تھی مگر یہ سردی ارسہ کو کمرے کی گھٹن کے مقابلے میں ہیچ محسوس ہو رہی تھی.........
یکایک ایک خوفناک دھاڑ سے درودیوار لرز گئے۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل

گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ دھاڑ میرے پیچھے چند فٹ کے فاصلے سے آئی ہے۔ لیکن میں نے ارسہ اور پہریدار کی جانب دیکھا تو وہ اطمینان سے کھڑے تھے۔ اس دوران دوسری دھاڑ گونجی۔ اس دفعہ میں نے ہوش بحال کر کے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ آواز دس پندرہ گز کی دوری سے ایک اونچی دیوار کی دوسری جانب سے آرہی ہے۔ غالباً ارسہ اور پہریدار اکثر یہ آواز سنتے تھے لہٰذا ان پر میری طرح شدید خوف کا حملہ نہیں ہوا.........
اس کے بعد دو تین منٹ تک مسلسل یہ دھاڑیں سنائی دیتی رہیں۔ پوری کوٹھی گونج رہی تھی۔ میں حیران تھی کہ یہاں کے مکین ہڑبڑا کر اٹھ کیوں نہیں بیٹھتے۔ کچھ دیر بعد درندہ خاموش ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی رات کے بے پناہ سناٹے کو درودیوار پر اپنی حکمرانی واپس مل گئی۔ ایک بار پھر وہی سکوت طاری ہوگیا جس میں کبھی گھنگھروؤں کی مدھم صدا کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ آواز یقیناً کوٹھی ہی کے کسی دور دراز حصے سے آ رہی تھی، جہاں شجاع اپنے بڑے بھائی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر تفریح طبع میں مصروف تھا۔ چنگیزیوں کی چھتوں تلے ایسی آوازوں کا آنا ایک بالکل عام سی بات تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اس رات کے اختتام پر میرے لئے کون سا روز محشر طلوع ہوگا۔ یقینی بات تھی کہ اب میں زیادہ دیر اپنا آپ چھپا نہیں سکوں گی۔ یہی غنیمت تھا کہ میں فوری طور پر شناخت ہونے سے بچ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ارسہ کے کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا اور یوں بھی شجاع اور اس کے کارندے پوری طرح ہوش میں نہیں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نے نشہ کر رکھا تھا۔ لیکن دن کے اجالے میں جب وہ لوگ غور سے میری طرف دیکھتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نہ پہچان سکتے اور خاص طور پر شجاع تو مزید دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔

دینو نے کامیابی سے مجھے ایک بڑھیا کا روپ دیا تھا لیکن یہ روپ زیادہ دیر میرا بھرم نہیں رکھ سکتا تھا، اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ رب نواز نے ایک ہی تیز نظر میں مجھے پہچان لیا تھا......... بہرحال کچھ بھی تھا امید کا دامن ابھی پوری طرح میرے ہاتھ سے چھوٹا نہیں تھا۔ کئی طرح کے خیالات آرہے تھے۔ شاید صبح بھی وہ لوگ مجھے نہ پہچان سکیں یا شاید صبح سے پہلے رب نواز کی طرف سے کوئی مدد مل جائے......... یا شاید........."
مگر ایک ایک کر کے سب امیدیں دم توڑ گئیں اور جو رہی سہی کسر تھی وہ اس

بارش نے پوری کر دی جس نے رات کے آخری پہر ایک گھنٹے تک ہمیں شرابور کیا۔ دینو نے میرے بالوں میں جتنی بھی سفیدی لگائی تھی اور میرے چہرے پر جتنی بھی سیاہی اور سریش ملی تھی سب بہہ گئی.......... نتیجہ یہ ہوا کہ علی الصبح جس پہلے شخص نے مجھے دیکھا وہی پہچان گیا کہ میں کوئی بہروپن ہوں۔ اور جب اس نے میرے چہرے پر غور کیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جاگیردارنی!" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی اور وہ الٹے قدموں واپس بھاگا۔

پلک جھپکنے میں یہ خبر ڈیرے کے طول و عرض میں پھیل گئی کہ پکڑی جانے والی عورت "چھوٹی جاگیردارنی" ہے۔ شجاع خود بھاگا بھاگا آیا اور آکر میری شکل دیکھی۔ وہ پانچ چھ گز کی دوری پر کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔ وہی نفرت جو اس خانوادے کے ہر فرد کی آنکھوں میں میرے لئے مخصوص تھی۔ دن چڑھے تک وہاب کے کارندے مجھے دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ میں ان کے لئے ایک تماشہ عبرت تھی۔ میری صورت دیکھ کر ان کی آنکھوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ میرے پاس آئینہ نہیں تھا مگر میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتی تھی کہ میری صورت اس وقت کیا منظر پیش کر رہی ہے۔ کٹے ہوئے بال' سریش' سیاہی اور سفیدی سب نے گڈمڈ ہو کر میرے چہرے پر عجیب نقشہ کھینچ رکھا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا سب سے بڑا دشمن وہاب چنگیزی مجھے ایسی بے بسی کی حالت میں دیکھے لیکن میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے اب کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت وہاب چنگیزی شہر سے واپس لوٹ آیا۔ میری خبر پا کر وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔

اس کی صورت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ جب اس شیطان کو میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ ایک کلین شیو یورپین ٹائپ شخص تھا جس نے اپنے فربہ جسم کو سرخ شرٹ اور جین میں کس رکھا تھا۔ مگر اب جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا وہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی بادشاہی مسجد میں عید کی نماز پڑھ کر آیا ہے یا کسی نعتیہ مقابلے میں شرکت کے بعد لوٹا ہے۔ سفید کھڑکھڑاتی شلوار قمیض' اس پر سیاہ اچکن' نہایت شریفانہ حجامت اور جناح کیپ۔ میں اسے بمشکل پہچان سکی۔ اس کے لبوں کی مخصوص مسکراہٹ میرا سینہ چھلنی

کر گئی۔ وہ چند لمحے تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر ہونٹوں سے چچ چچ کی آواز نکال کر میری حالت زار پر افسوس کرنے لگا۔ میرا دیور شجاع اور میری سسرال کے چند دوسرے افراد بھی دہاب کے عقب میں کھڑے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں میری لئے غضب کے شعلے تھے۔ اس قفس میں کوئی اپنا نہیں تھا' سب بیگانے تھے اور سب دشمن تھے۔ وہاب نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو باہر بھیج دیا۔ ایک لمبوترے نیم سرد کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ میں رسیوں کے ذریعے ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہاب نے ٹہلنے والے انداز میں میرے چاروں طرف گھوم کر میرا جائزہ لیا پھر سگار سلگا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد اس کے ہونٹوں سے گونجدار آواز نکلی۔

"بھئی! بڑی ہوشیار نکلی ہو تم۔ اتنا تو ہم ساری زندگی نہیں بھاگے جتنا ان چند مہینوں میں تمہارے پیچھے بھاگے ہیں۔ کہاں کہاں سیریں کرتی رہی ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مسکرانے لگا "خیر ہم کون ہوتے ہیں تمہاری مصروفیات کے بارے میں پوچھنے والے۔ چودھری شہاب جانے اور تم جانو۔ لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ کوئی شادی وادی بھی کی ہے اس سے یا.........." فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ خباثت سے ہنسنے لگا۔ سگار کے دو طویل کش لے کر بولا "چند ہفتے پہلے پتہ چلا تھا کہ تم اپنی کسی سہیلی کے ساتھ لاہور "ہوم لائیک" ہوٹل دیکھی گئی ہو۔ میں نے سوچا چلو تمہارے درشن کر آئیں۔ مدت ہوگئی ہے صورت دیکھے ہوئے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم نے ابھی تک غصہ نہیں تھوکا اور جونہی میری آمد کا پتہ چلا تم لاہور سے سرپٹ جھنگ کی طرف بھاگو گی.......... اس بھاگ دوڑ میں وہ بے چارہ فرخندہ کا منگیتر یوں ہی ضائع ہوگیا۔ خیر ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ بے وقوف لوگ مرتے ہی رہتے ہیں..........

"ارے ہاں یاد آیا.......... تمہارے اس دوسرے عاشق کا کیا بنا؟ وہ تو ایسا جیل سے بھاگا ہے کہ پھر خواب ہی ہوگیا۔ کیا نام تھا اس بھلے مانس کا.......... ہاں سلیم۔ کبھی اس کا بھی دیدار ہوا ہے یا نہیں؟"

میری آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے لیکن میرے منہ میں تھوک ضرور تھا' وہاب کے تمام سوالوں کے جواب میں میں نے یہ تھوک پوری نفرت سے اس کی طرف پھینک

دیا۔ اس نفرت کے کچھ چھینٹے اس کی جھولی اور کچھ منہ پر گرے۔ اس نے کمال اطمینان سے اچکن کی جیب سے سرخ رومال نکالا اور چہرے پر پھیر کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم میرے بھائی کی قاتل ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں اداکاروں کی طرح بھیس بدل کر کیوں آئی ہو۔ تمہارے دل میں میرے لئے بے پناہ ہمدردی ہے تم جانتی ہو کہ میں اپنے مرحوم بھائی کی یاد میں تڑپتا ہوں۔ لہٰذا مجھے بھی اس کے پاس پہنچانا چاہتی ہو.......... لیکن میری ایک مجبوری ہے۔ میں جسے ایک دفعہ معاف کر دیتا ہوں اسے پھر کوئی سزا نہیں دیتا.......... اور میں تجھے معاف کر چکا ہوں۔ یہ معافی ہمیشہ کے لئے ہے۔ اب تم بڑے سے بڑا جرم بھی کر لو میرے نزدیک بے گناہ ہو.........."

سگار کا دھواں چھت کی طرف چھوڑ کر وہ اٹھا اور کسی بالم نامی کارندے کو آوازیں دینے لگا۔ ذرا دیر بعد ایک لمبا تڑنگا رائفل بردار اندر آگیا۔ یہ شخص بالکل گنجا تھا اور آنکھیں کسی شکرے سے مشابہ تھیں۔ اس نے حسب دستور رکوع کے بل جھک کر وہاب چنگیزی کو تعظیم پیش کی۔ وہاب چنگیزی نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "یہ معافی شدہ عورت ہے اسے کچھ نہیں کہنا لیکن اگر یہ اپنی مرضی سے اپنے شناسا سلیم کا پتہ بتا دے تو اس کی مہربانی ہے.......... اسے کھانا وانا کھلا کر دوپہر سے پہلے پہلے اس کی منزل تک پہنچادو.........."

وہاب کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کہہ کچھ رہا ہے اور سمجھا کچھ اور رہا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اس شیطان کو اسی رمزیہ انداز میں باتیں کرتے سن چکی تھی۔ وہ کس "منزل" کی بات کر رہا تھا اس خوفناک ڈیرے سے تو کوئی راستہ کسی منزل کی طرف جاتا ہی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور مڑ کر اپنے کارندے سے بولا "ہاں.......... میں نے اس بدبخت شمشیر خان کو بھی معاف کر دیا ہے۔ اسے اب کچھ نہ کہنا" رائفل بردار زور زور سے سر ہلانے لگا۔ وہ وہاب سے بے حد مرعوب دکھائی دیتا تھا۔ مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا وہاب تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ وہ بہت مصروف اور جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص ٹرے میں میرے لئے ناشتہ لے کر آیا۔ بڑا بھرپور ناشتہ

تھا لیکن میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اسی دوران کھڑکی میں مجھے رب نواز کی جھلک نظر آئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ ہراساں اور مضطرب سا ہے۔ اب معلوم نہیں وہ واقعی پریشان تھا یا صرف مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ میں تنہا کمرے میں بیٹھی رہی۔ ناشتے کے لئے میرے ہاتھوں کی رسیاں کھولی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہیں دوبارہ باندھ دیا گیا۔ میرا دھیان رہ رہ کر ارسہ کی طرف جا رہا تھا۔ علی الصبح اسے مجھ سے دور کر دیا گیا تھا۔ اس بے چاری کی حالت بہت پتلی تھی۔ تاریک سرد رات اس پر قیامت بن کر گزری تھی۔ جب اسے درخت سے کھولا گیا تھا تو وہ لہرا کر زمین بوس ہو گئی تھی۔ دو ہٹی کٹی ملازمائیں اسے اٹھا کر اندر لے گئی تھیں..........

صبح سے دوپہر ہو گئی میں یونہی اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب بالم ایک دوسرے رائفل بردار کے ساتھ اندر داخل ہوا اور مجھے کرسی سے کھولنے کے بعد اٹھنے کا حکم دیا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر راہداری میں آگئے اور کوٹھی کے جنوبی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ دونوں بہت چوکنے ہیں اور ایک لحظے کے لئے بھی نگاہ مجھ پر سے نہیں ہٹا رہے۔ وہ کوٹھی کی عقبی سمت میں آگئے۔ میں اس ڈیوڑھی کے سامنے سے گزری جس پر پرانی لکڑی کا ایک پھاٹک لگا ہوا تھا اور جس کے درمیانی خلا سے گزر کر میں اور فرحان یہاں سے فرار ہوئے تھے۔ اب اس پھاٹک کی جگہ لوہے کا ایک مضبوط دروازہ نظر آرہا تھا۔ ڈیوڑھی سے چند گز آگے ایک برآمدے میں پہنچ کر مجھے عجیب سی بو آئی۔ یہ بو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یکایک میں پہچان گئی کہ یہ کس چیز کی بو ہے اور اس کے ساتھ ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے چڑیا گھر کی سیر اور شیروں کے پنجرے یاد آگئے۔ جن کے گرد میں بچپن سے اب تک کئی بار گھوم چکی تھی.......... میرا سر چکرانے لگا.......... اور پھر میری نگاہ ایک ہال نما کمرے پر پڑی۔ اس کمرے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اکھاڑ کر ان میں لوہے کی سلاخیں نصب کی گئی تھیں اور یہ کام حال ہی میں کیا گیا تھا کیونکہ سلاخوں کے اردگرد بے روغن پلستر نظر آ رہا تھا۔ بالم اور اس کا ساتھی اب مجھے بازوؤں سے تھام چکے تھے۔ وہ قریباً کھینچتے ہوئے مجھے اندر لائے۔ یہاں تین صوفے اور آٹھ دس کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیاں خالی تھیں۔ صوفوں پر چند افراد نظر آرہے تھے۔ ان میں سے دو تو وہاب کے کارندے تھے۔ باقی اجنبی

چہرے تھے۔ غالباً ان کا شمار وہاب کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہوگا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار نظر آئے تاہم اس کے ساتھ ہی ایک ہراس آمیز سنسنی بھی فضا میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر میری نگاہ اس درندے پر پڑی رات میں نے جس کی لرزہ خیز آوازیں سنی تھیں۔ وہ ایک قوی ہیکل جانور تھا۔ پورے جسم پر دھاریاں سی تھیں۔ وہ بے قراری سے پنجرے میں ٹہل رہا تھا.......... زندگی میں تیسری مرتبہ میں نے کوئی درندہ چڑیا گھر سے باہر دیکھا تھا۔ پہلی دفعہ میں نے ایک چیتا نما جانور دیکھا تھا۔ ہم سب گھر والے ایک تفریحی ٹور پر کرم ایجنسی کے علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک مقامی شخص نے وہ جانور ہلاک کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے گلدار کہتے ہیں اور یہ افغان علاقے کی طرف سے بھٹک کر ادھر آیا ہے۔ دوسری مرتبہ صرف چند ہفتے پہلے میں نے وہ خونخوار سور دیکھا تھا جسے خان رحیمی اور اس کے ساتھی گھڑ سواروں نے نیزوں سے ہلاک کیا تھا.......... اور آج میں اس پنجرہ بند درندے کو دیکھ رہی تھی.......... خدا کی پناہ.......... میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی کہ چڑیا گھر کے شیر کو دیکھنے اور اس شیر کو دیکھنے میں کیا فرق تھا۔ میرے جسم کا ہر مسام پسینہ اگل رہا تھا اور ذہن میں خوفناک اندیشوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ یکایک کہیں قریب ہی کوئی دروازہ دھماکے سے کھلا اور لرزہ خیز چیخ وپکار نے میرا دل دہلا دیا۔ یہ انسانی چیخ وپکار تھی۔ چند افراد کسی شخص کو گھسیٹتے ہوئے ہماری طرف لا رہے تھے۔ پھر میں نے چیخنے والے شخص کو دیکھا۔ رگوں میں خون جم کر رہ گیا.......... وہ شمشیر خان تھا۔ وہی پہریدار جسے رات ہمارے ساتھ ہی کھلے آسمان تلے باندھا گیا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا شخص کسی بچے کی طرح بلک رہا تھا اور مسلح محافظوں کی گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر وہی رات والا لنگوٹ تھا اور ہاتھ پاؤں اور ہونٹ سردی کی شدت سے نیلے ہو رہے تھے۔ (ممکن ہے اس نیلاہٹ کا ایک سبب خوف اور دہشت کی زیادتی بھی ہو) وہ حلق کی پوری قوت سے چلا رہا تھا۔

"جاگیردار جی! مجھے معاف کردو۔ آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ۔ اپنے ماں باپ کا واسطہ۔ خدا کے لئے' مجھے نہ مارو.......... میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ جاگیردار جی.......... جاگیردار جی" لیکن جاگیردار وہاں ہوتا تو سنتا۔ وہ تو غالباً کوٹھی ہی میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا.......... میں اپنی ماں کے آخری دیدار کے لئے سارا

دن روتی اور بلکتی رہی تھی مگر واصف چنگیزی حویلی میں ہوتے ہوئے بھی انجان بنا رہا تھا۔

یہ مردہ سماعتوں والے پتھر کے انسان تھے۔ مظلوموں کی چیخوں سے پتھر شق ہوتے ہوں تو ہوتے ہوں لیکن اس جاگیر کے حاکموں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ میرا دیور شجاع بھی اب تماشائیوں کی صف میں اپنی نشست سنبھال چکا ہے اور دلچسپی سے پہریدار کی جدوجہد کا منظر دیکھ رہا ہے۔ شجاع کو دیکھ کر مظلوم شخص کا رونا پیٹنا انتہا کو چھو گیا۔ وہ شجاع کے قدموں میں سر رکھ کر رحم کی بھیک مانگنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ مگر اسے دبوچنے والے ڈشکرے اسے یہ موقع دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ بے بس ہو کر وہ دور ہی سے "چھوٹے چودھری" کے نام کی دہائی دینے لگا۔ مگر چھوٹا چودھری سیاہ شیشوں کی عینک لگائے بے حرکت بیٹھا تھا۔ وہ "معافی شدہ" کو بھلا کیا معاف کرتا۔ چودھری وہاب کے زہریلے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ان الفاظ کی روشنی میں مجھے اپنا انجام بھی اب صاف نظر آرہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاب کے مسلح کارندے پہریدار شمشیر خان کو گھسیٹتے اور دھکیلتے ہوئے ایک آہنی جنگلے کے سامنے لے گئے۔ پھر بالم نے چابیاں نکال کر دروازہ کھولا اور پہریدار کو اندر دھکیل دیا۔ میں اسے زندگی سے موت کی طرف دھکیلے جانے کا منظر پتھرائی نظروں سے دیکھتی رہی۔ آخر دروازہ پرشور آواز سے بند ہو گیا۔ بدنصیب شخص آنکھیں بند کرکے جنگلے سے چمٹ گیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانے لگا۔ میں نے دیکھا دھاری دار شیر کی دھاری دار دم تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ اس کے بعد کچھ بھی دیکھنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔

کئی منٹ تک میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور میں اپنے کان بھی بند کرسکتی۔ وہ آوازیں میرے کانوں سے نہ ٹکراتیں جو ہمیشہ کے لئے میری راتوں کا ڈراؤنا خواب بن چکی ہیں۔ یہ مختلف آوازیں تھیں۔ چیخ وپکار کی جدوجہد کی' غراہٹوں کی' ہنسنے کی اور کراہنے کی۔ ان آوازوں میں بار بار ایک دوسری منحوس آواز شامل ہو جاتی تھی۔ یہ آواز وہاب کے کسی غیر ملکی دوست کی تھی۔ تماشائیوں کی صف میں بیٹھا ہوا یہ درندہ صورت انسان شراب کے نشے میں چور تھا اور جھوم جھوم کر انگریزی میں بھونک رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی تھائی باشندہ ہے اور جو شیر سامنے

پنجرے میں ایک مردہ انسان کو بھنبھوڑ رہا ہے اس کا سابقہ مالک یہی شخص ہے۔ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے تماشائی کو فخر سے بتا رہا تھا کہ یہ رائل بنگال ٹائیگر ہے۔ اسے وہ تھائی لینڈ کے دشوار گزار جنگل سے پکڑ کر لایا تھا۔ اگر خریدنے والا وہاب چنگیزی نہ ہوتا تو وہ اس "خوبصورت بلی" کے کم از کم بیس ہزار ڈالر کھرے کرتا۔

تھائی مالک تعریفیں کرتا جا رہا تھا اور "خوبصورت بلی" اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔

آخر یہ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے تھامنے والے آہنی ہاتھ مجھے آگے کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ میرے اندر سے کوئی دلدوز آواز میں پکار کر بولا "اب تیری باری ہے ثناء اپنے گوشت کو' اپنی ٹانگوں کو اور اپنے بازوؤں کو تیز نوکیلے دانتوں اور بے رحم پنجوں کے لئے تیار کرلو" میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری دھندلائی ہوئی نظر سامنے اٹھی اور آہنی سلاخوں سے گزر کر پنجرے کے اندر چلی گئی۔ اندر کا منظر ہولناک تھا۔ مگر مجھے بالکل نہیں لگا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور نہ ہی چیخی چلائی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا پنجرے میں دو ٹوٹے ہوئے بازو تھے۔ خون اور مٹی میں لتھڑا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا تھا.......... بہت بڑا اور ناقابل شناخت۔ ایک کپڑے کی دھجیاں تھیں۔ جسم کے کسی حصے کی تھوڑی سی کھال تھی۔ کچھ بھی تو غیر معمولی نہیں تھا یہاں۔ اس سے زیادہ کچھ تو ابھی میرے ساتھ ہونے والا تھا.......... آہنی ہاتھوں نے مجھے کھینچنا شروع کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے مزاحمت شروع کر دی۔ میں ہاتھوں کی گرفت میں مچلنے لگی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں بھی پہریدار کی طرح رونے اور منتیں سماجتیں نہ کرنے لگوں۔ میں نے اپنے ہونٹ بے انتہا مضبوطی سے بند کرلئے مگر اپنی ٹانگوں کو پھر بھی مزاحمت سے باز نہ رکھ سکی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں اس اذیت ناک موت سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے خوف کھاتے دیکھ کر بالم نے میرے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو مٹھی میں لے کر میرا چہرہ اٹھایا اور قدیم دور کے کسی جلاد کی طرح بولا "اگر اس سزا بچنا چاہتی ہے تو ایک ہی صورت ہے۔ اپنے اس عاشق کا پتہ بتا دے جو جیل سے بھاگا ہے.........."

مجھے اس جلاد کی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ وہ مجھ سے ایک ایسے انعام کا وعدہ کر رہا تھا جو اس کی دسترس میں نہیں تھا۔ وہ زبان کھولنے کے بدلے مجھ سے زندگی کا وعدہ کر رہا تھا

مگر میری موت کے پروانے پر وہاب چنگیزی نے صبح ہی دستخط کر دیئے تھے۔ وہاب کے یہ الفاظ "دستخط" سے کم نہیں تھے کہ "اس معاف کی ہوئی عورت کو دوپہر سے پہلے منزل تک پہنچا دینا" اب میں زبان کھولتی یا نہ کھولتی' روتی بلکتی یا چپ رہتی مجھے "منزل" پر تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے لئے کوئی رعایت نہیں تھی تو میں کسی کو کوئی رعایت کیوں دیتی۔ میں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند رکھے۔ میری آنکھوں کے سامنے رنگین دائرے سے بن رہے تھے' میرے کانوں میں بار بار بالم کی منحوس آواز گونج رہی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ بکوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بولو.......... بولو.......... بتاؤ.......... بتاؤ" الفاظ کے ہتھوڑے تواتر سے میری سماعت پر برسنے لگے۔ معلوم نہیں یہ صورت حال کتنی دیر برقرار رہی۔ شاید چند سیکنڈ.......... چند منٹ.......... یا شاید آدھ گھنٹہ۔ آخر میرے کانوں میں شجاع کی کرخت آواز گونجی۔ مجھے الفاظ کی سمجھ نہیں آئی لیکن لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ میری موت کے لئے "سفید رومال" لہرا رہا ہے۔ دو بے رحم ہاتھ آہنی دروازے کی طرف بڑھے اور قفل کھولنے لگے۔ ایک ساعت کے لیے سیاہ سفید دھاریوں والا زرد بے قرار جسم میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ درندے کی بو میں نے اپنے نتھنوں کے قریب محسوس کی۔ بے رحم ہاتھوں نے قفل کھول دیا اور کنڈی ہٹانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب آہنی ہاتھوں میں بل کھاتے ہوئے نہ جانے کس طرح میرا دایاں بازو آزاد ہوگیا۔ میرا ہاتھ اس تیز دھار استرے تک پہنچا جو پرسوں سے میرے لباس میں چھپا ہوا تھا۔ میری انگلیاں استرے کے دستے سے ٹکرائیں اور میں نے اسے مضبوطی سے تھام کر ایک جھٹکے سے باہر نکال لیا.......... پہلا وار میں نے لمبے تڑنگے بالم پر کیا۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں میں نے اس کی ایک تہائی گردن کاٹ کر رکھ دی۔ خون اچھل کر میرے کندھے پر گرا۔ دوسرا شخص میرے سامنے تھا۔ اس کا آگے کو بڑھا ہوا پیٹ مجھے استرے کا بہترین ہدف نظر آیا۔ حتی الامکان تیزی سے میں نے اپنے آلے کو افقی سمت میں حرکت دی۔ استرا صاف طور پر نرم گوشت میں دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے محافظوں کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھیں وہ مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ رہے تھے اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ ہوش نہیں.......... میں نے کم از کم تین افراد کو نشانہ بنایا اور خود کو چھڑا کر عقبی ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ جوتی اسی وقت میرے پاؤں سے نکل گئی تھی جب وہاب کے کارندوں نے مجھے پنجرے کی طرف

کھینچنا شروع کیا تھا۔ اب میں ننگے پاؤں تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا' میں کیوں بھاگ رہی ہوں اور کہاں جا رہی ہوں۔ دل میں صرف ایک ہی آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے اس شیطان کو ہلاک کر لوں جس کا نام وہاب ہے اور جس کی منحوس مسکراہٹ میرے سینے کا سب سے بڑا داغ ہے۔ لیکن وہ یہاں کہاں تھا۔ میں ڈیوڑھی کے بند پھاٹک تک پہنچی اور وہاں سے لوٹ کر سیڑھیوں کی طرف آئی۔ سیڑھیوں پر ایک شخص نے پہلو سے جھپٹ کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے بے دریغ استرا گھمایا وہ کندھے پر زخم کھا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک دوسرے ہراساں شخص کے بازو سے نکل کر میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میرے چھت پر پہنچنے سے پہلے ہی چند افراد ایک دوسری سیڑھی کے ذریعے اوپر پہنچ چکے تھے۔ جونہی میں نے چھت پر قدم رکھا ایک پگڑی والے شخص نے لاٹھی کا وار میری بائیں کلائی پر کیا۔ استرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پختہ صحن میں جا گرا۔ اس وقت رب نواز عقب سے آیا اور اس نے پھرتی سے مجھے دبوچ لیا۔ اگر وہ نہ بھی دبوچتا تو پانچ چھ اور افراد یہ کام کرنے کے لئے موجود تھے۔ بالم نے آگے بڑھ کر مجھ پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ وہ مجھے سیڑھیوں پر گھسیٹتے ہوئے پھر صحن میں لے آئے۔ ایک شخص نے اڑنگا لگا کر مجھے بے رحمی سے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا اور دوسرا کسی رسی یا ڈوری کے ذریعے میرے ہاتھ پشت پر باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے یہ لوگ مجھے مسلسل گالیاں بھی دے رہے تھے۔ اتنے میں ہال کمرے کے اندر سے شیر کی چیختی چنگاڑتی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جیسے میرے جسم میں دانت آزمانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ان حشر خیز گھڑیوں میں مجھے بچپن کی ایک بات یاد آ گئی۔ بچپن میں میں جب ابو جان اور بھائیوں کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے جاتی تھی تو شیر کو دیکھ کر دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ ڈر اس وقت اور بڑھ جایا کرتا تھا جب ابو بتایا کرتے تھے کہ ایک گندی لڑکی کو جو ماں باپ کا کہنا نہیں مانتی تھی شیر کے آگے ڈال دیا گیا تھا........ ابو کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن ان کی لاڈلی بیٹی کو بھی شیر کے آگے ڈال دیا جائے گا۔ حالانکہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہو گا' کسی جرم کی مرتکب نہیں ہوئی ہو گی..........

میرا چہرہ زمین پر تھا اور ہاتھ کھردری رسی سے الجھ رہے تھے۔ اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی میری نگاہ عقبی ڈیوڑھی کی طرف تھی۔ میں نے دیکھا ڈیوڑھی کا پھاٹک ایک دفعہ زور

سے ہلا اور اس کے اردگرد گرد و غبار سا پھیل گیا۔ صاف طور پر محسوس ہوا کہ پھاٹک کو باہر کی طرف سے زوردار ضرب لگائی گئی ہے۔ میرے اردگرد موجود افراد بھی چونک کر پھاٹک کی طرف دیکھنے لگے۔ تب ایک بار پھر تصادم کی زوردار آواز آئی اور میں نے بے پناہ حیرت سے دیکھا کہ لوہے کا موٹا ارل اکھڑ کر دور جا گرا اور پھاٹک کھل گیا۔ ایک بس جس پر سیالکوٹ تا جھنگ براستہ لاہور لکھا ہوا تھا دندناتی ہوئی اندر گھس آئی۔ ایک لحظے کے لئے میری نگاہ بس کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف اٹھی اور میں وہاں اختر زماں عرف چیف کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا وہ سلیم تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں انگاروں کی مانند روشن تھیں۔ میں نے رب نواز' بالم اور شجاع کو اپنی رائفلیں کندھوں سے اتارتے دیکھا پھر یکایک فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے بالکل سامنے تین گز کے فاصلے پر ایک شخص گولی کھا کر گرا اور چیخنے لگا۔ میں اس کے پاس سے گزری اور جھک کر بھاگتی ہوئی اندرونی کمروں کی طرف گئی۔ شیر ابھی تک بول رہا تھا اور اس کی آواز فائرنگ کی آواز میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ میں سیدھی اس کمرے کے سامنے آئی جہاں رات ارسہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب کمرے کے دروازے پر ایک بڑا قفل نظر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا شاید ارسہ اب یہاں موجود نہیں مگر دوسرے ہی لمحے اپنے خیال کو رد کر دیا۔

کھڑکی کے پاس پہنچ کر میں نے زور سے آواز دی "ارسہ" وہ بھاگ کر آئی اور پٹ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ فائرنگ اور چیخ وپکار کی آوازوں نے اس کی آنکھوں میں خوف بھر رکھا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کروں۔ کھڑکی میں آہنی گرل تھی اور دروازے پر مضبوط تالہ۔ ہر ہر لمحہ قیمتی تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا اگلے ایک دو منٹ میں یہاں کیا ہو جائے۔ اچانک کسی نے برآمدے کے ایک تاریک گوشے سے میری طرف ایک ریوالور اچھال دیا۔ یہ ریوالور فرش پر گھسٹتا ہوا میرے پاؤں سے کچھ دور رک گیا۔ میں نے بری طرح چونک کر تاریک گوشے کی طرف دیکھا۔ ایک سیاہ سایہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ دو یا تین سیکنڈ تک میں تذبذب میں ریوالور کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ریوالور اٹھایا اور تالے کی طرف آ گئی۔ فلموں میں بہت دفعہ اداکاروں کو ریوالور وغیرہ سے تالے توڑتے دیکھا تھا مگر خود یہ کام کرنا پڑا تو اندازہ ہوا کہ کتنا مشکل ہے۔ میں نے ایک فٹ کی

دوری سے نشانہ لے کر چار راؤنڈ فائر کیئے۔ تب کہیں دو گولیاں تالے کو لگیں اور اس نے دروازے کی جان چھوڑی۔ میں دروازہ کھول کر اندر گئی۔ ارسہ خوف اور دہشت کی فراوانی میں اوندھے منہ بستر پر گری ہوئی تھی اور سر تکیئے کے نیچے گھسیڑ رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے دردناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں نے بازو کھینچ کھینچ کر اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھی.......... بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور ایک لمبا تڑنگا جسم دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا.......... وہ شجاع تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی اور اس کا سینہ سانس کے زیروبم سے پھول پچک رہا تھا۔

"ہٹ جاؤ شجاع" میں نے پھنکار کر کہا۔ میرا لہجا اتنا فیصلہ کن تھا کہ میں خود حیران رہ گئی۔ شجاع نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور کوئی تندوتیز جملہ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ اس کے کھلے ہونٹوں کی آواز سننے سے پہلے ہی میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے "مستقبل کے اس وہاب" کو روند کر آگے بڑھ جانا تھا۔ ابھی اس کے ہونٹوں سے صرف "تم" کا لفظ نکلا تھا کہ اوڑھنی کے نیچے سے میں نے پورے زور کے ساتھ لبلبی دبائی اور 32 بور ریوالور کی دو گولیاں یکے بعد دیگرے شجاع کے سر اور چہرے میں پیوست ہوگئیں۔ اس کی چیخ خوفناک دھماکوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ فرش پر گرا۔ میں ارسہ کے ساتھ اسے پھلانگتی ہوئی برآمدے میں پہنچی اور دیواروں کے ساتھ ساتھ صحن کی طرف بڑھنے لگی۔ صحن میں میں نے جو سب سے پہلا منظر دیکھا وہ دست بدست لڑائی کا تھا۔ سلیم' وہاب کے تین کارندوں سے دست وگریباں تھا۔ اس کی خوفناک ٹکر کھا کر میں نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو رائفل سمیت اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ تب میری نگاہ اختر زماں پر پڑی۔ اختر زماں کے علاوہ اس کے دس پندرہ ساتھی بھی بس میں یہاں پہنچے تھے' وہ سب وہاب کے کارندوں سے بھڑے ہوئے تھے۔ کچھ بس کے اندر ہی مورچہ زن ہو کر فائرنگ کر رہے تھے۔ چھوٹے فائر کے علاوہ سیون ایم ایم کی تڑ تڑ بھی بار بار سنائی دے رہی تھی۔ وہاب کے کارندے دائیں جانب سے گولیاں چلا رہے تھے۔ میں نے ارسہ کو بائیں جانب لیا اور ستونوں کی آڑ لیتی ہوئی بس کی طرف بھاگی۔ کچھ معلوم نہیں ہم دونوں گولیوں کی بارش میں کس طرح بس تک پہنچ پائیں۔ جونہی ہم بس میں داخل ہوئیں اختر زماں کا دست راست کبوترا خان نظر آیا۔ اس نے دھکا دے کر ہمیں

فرش پر گرا دیا۔ بس کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ سیٹوں اور فرش پر گولیوں کے خول اور شیشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر ہم اس طرح اوندھے منہ بس کے فرش سے چپکی رہیں۔ بس کا انجن سٹارٹ تھا۔ اور گھر گھر کی آواز پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ بس حرکت میں آئی۔ ایک شارٹ ٹرن لیا اور تیزی سے عقبی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ کوٹھی کی چھت اور برآمدوں سے مسلسل فائر ہو رہا تھا۔ بس کوٹھی سے نکلی اونچے نیچے راستوں پر فٹ فٹ بھر اچھلتی نیم پختہ سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ کچھ آگے جا کر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اختر زماں کی جگہ سلیم تھا۔ اس کی قمیض پر پشت کی جانب خون کے دھبے تھے۔ میں اور ارسہ اٹھ بیٹھیں۔ اختر زماں کے تمام ساتھی بھی اب نشستیں سنبھال چکے تھے۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے غنڈے اور جنگجو قسم کے لوگ تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ اختر زماں خود بھی تو مانا ہوا گینگسٹر تھا.......... لیکن وہ کہاں تھا؟ میں نے بس میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ یکایک ارسہ چیخ اٹھی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ اختر زمان ایک اگلی نشست پر لہولہان پڑا تھا۔ ہم بھاگ کر اس تک پہنچیں۔ ایک گولی اس کی گردن کو چیرتی ہوئی گزر گئی تھی اور دوسری بائیں پسلیوں کے نیچے کہیں گھسی ہوئی تھی۔ اسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ ارسہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے اپنا خون آلود ہاتھ ارسہ کی طرف بڑھایا۔ ارسہ اس ہاتھ کو رخسار کے ساتھ لگا کر بیٹھ گئی اور سسکنے لگی۔

"بھائی جان! یہ کیا ہوگیا.......... بھائی جان.......... بھائی جان!"

پھر وہ سلیم کی طرف منہ کر کے چیخنے لگی "جلدی کرو ہسپتال کی طرف موڑو میرا بھائی زخمی ہے۔ جلدی کرو۔"

میں نے آگے بڑھ کر اختر زمان کا خون آلود سر زانو پر رکھ لیا۔ سر اونچا ہونے سے اسے سانس لینے میں کچھ آسانی ہوگئی۔ پھر بھی ہر سانس کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے کراہ نکل جاتی تھی۔ غالباً گولی کہیں پھیپھڑے میں اٹکی ہوئی تھی۔ بس کو لگنے والے شدید جھٹکے اس کی تکلیف میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔ وقت کی ضرورت یہ تھی کہ بس فوراً روک دی جائے لیکن ایسا کرنا سب کی موت کو دعوت دینا تھا۔ کم از کم دو لینڈ

راور جیپیں آندھی کی رفتار سے بس کے پیچھے اڑی آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ گرد آلود راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں بھاگنے لگتیں تو ان میں بیٹھے ہوئے مسلح سوار بھی صاف نظر آجاتے۔ وہ گاہے گاہے بس پر فائر بھی کر رہے تھے۔ ان کی فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس کے ٹائروں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ میں نے ایک طائرانہ نظر بس میں ڈالی۔ جگہ جگہ نشستوں کے نیچے مسافروں کا سامان' صندوق' ٹوکریاں' گٹھڑیاں جوتے وغیرہ پڑے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کارروائی کے لئے اخترزمان وغیرہ نے یہ بس کہیں سے چھینی تھی۔

دفعتاً" ایک دھماکے کے ساتھ بس اپنے بائیں پہلو پر لڑکھڑانے لگی۔ سب کا دل اچھل کر رہ گیا۔ تعاقب کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ ٹائر برسٹ ہونے کے بعد سلیم نے بس کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچے راستے سے اتر کر کیکر اور شیشم کے درختوں میں جا گھسی اور چند ناتواں درختوں کو توڑنے کے بعد رک گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیپیں سر پر پہنچ گئیں۔ بس رکنے کے بعد ان کی تعداد کا صحیح اندازہ ہوا۔ جیپوں سمیت وہ چار گاڑیاں تھیں۔ ان کے عقب میں قریباً" دو فرلانگ کی دوری پر جاگیردار کے رنگ دار پگڑیوں والے گھڑسوار بھی سرپٹ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ اس جاگیر سے ارسہ کو لے کر اور چھوٹے جاگیردار کو مار کر نکل جانا آدم خور شیر کی کچھار سے زندہ لوٹنے کے مترادف تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وقت نے ہمارے خلاف فیصلہ دیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ ابھی چند منٹ تک اس بس میں ہمارے چھلنی جسموں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ میں نے سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ لڑنے مرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا ہے۔ کبوتر خان کے حکم پر اخترزمان کے آٹھ ساتھیوں نے بس کی کھڑکیوں میں مورچے سنبھال لئے......... مگر پھر اس سے پہلے کی میدان جنگ گرم ہوتا' ایک انوکھا واقعہ ہو گیا۔ ایسے ہی واقعات کے لئے کرشمہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم پر فائر کھولنے کی بجائے جاگیردار کی رنگ برنگ گاڑیوں نے رخ بدلے اور واپس روانہ ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی رنگ دار پگڑیوں کی وہ طویل قطار جو کھیتوں کے راستے تیزی سے قریب آ رہی تھی رک گئی۔ پھر اس گھڑسوار قطار کا رخ بھی ہماری بجائے ڈیرے کی طرف ہو گیا......... یہی وہ وقت تھا جب میری نگاہ دور نیم پختہ راستے پر پڑی۔ یہ راستہ کچے راستے کے ساتھ زاویہ قائمہ بنا رہا تھا۔ مجھے اس راستے پر

کئی سرخ اور نیلی گاڑیاں نظر آئیں۔ ان میں ایک ٹرک بھی تھا۔ یہ سب پولیس کی گاڑیاں تھیں......... یقینی بات تھی کہ وہاب کے خونخوار کتے پولیس کی جھلک دیکھ کر ہی واپس لوٹے ہیں۔ اس علاقے میں اتنی زیادہ نفری میں پولیس کی آمد کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ بڑی حویلی کی طرف آ رہی ہے۔ میں نے آگے جا کر سلیم کو ان گاڑیوں کی طرف متوجہ کیا۔ پولیس کی آمد کا سن کر ارسہ اور اخترزمان کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ اخترزمان کے باقی ساتھی بھی مطمئن بیٹھے تھے۔ غالباً" ان میں سے کوئی بھی ہماری طرح مفرور مجرم نہیں تھا' سلیم اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بس سے اترنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھے۔

ارسہ اپنی بڑی بڑی حیرت بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں قریب سے گزرنے لگی تو وہ کھڑی ہو گئی۔ گھبرا کر بولی "کہاں جا رہی ہیں آپ۔ اب تو پولیس پہنچ گئی ہے۔ میرے پاپا بھی ساتھ ہوں گے۔ وہ خود ہی سب کچھ سنبھال لیں گے۔"

میں نے ارسہ کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹایا اور کہا "ہمارا جانا ضروری ہے۔ تم بے فکر رہو' ہم اپنی حفاظت خود کر لیں گے۔"

زخمی اخترزمان نے بہن کا ہاتھ کھینچا' جیسے اسے سمجھا رہا ہو کہ وہ ہمارا راستہ نہ روکے۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ شاید وہ میرا اور سلیم کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے اس کی بہن کی بازیابی کے لئے جان کو خطرے میں ڈالا۔ اشکبار آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں والا یہ اخترزمان اس اخترزمان سے کتنا مختلف تھا جس نے بند جیپ میں صغراں کی عزت تار تار کرنے کی دھمکیاں دی تھیں اور یوسف کو جلتے سگریٹوں سے داغا تھا۔ آج اپنی بہن کی عزت کی خاطر اس کے زخموں سے خون بہا تھا تو اس کے چہرے کی منحوس سرخی ایک دلگداز زردی میں ڈھل گئی تھی۔ میں نے سوچا شاید آج کا دن اخترزمان عرف چیف کی موت کا دن ہے......... مگر آج کا دن اس کے اندر کے انسان کی "زندگی" کا دن بھی تھا۔ میں نے اس کے دم بدم زرد پڑتے چہرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ ارسہ کا کندھا تھپتھپایا اور سلیم کے ساتھ تیزی سے نیچے اتر گئی۔

پولیس کی دھواں اڑاتی گاڑیاں اب ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلہ پر تھیں' میں

اور سلیم جنتر کی جھاڑیوں میں گھسے اور حتی الامکان رفتار سے مخالف سمت میں بڑھنے لگے۔
میرے ہاتھ پاؤں ابھی تک لرز رہے تھے اور شہادت کی وہ انگلی ابھی تک سنسنا رہی تھی' جس سے ریوالور کا گھوڑا دبا کر میں نے پہلے کمرے کا تالہ توڑا تھا اور پھر شجاع کو شوٹ کیا تھا۔ شجاع کے لڑکھڑا کر گرنے کا منظر ابھی تک میری آنکھوں میں رقصاں تھا......... اور وہ سارے خون اگلتے جسم رقصاں تھے جو میں نے کوٹھی کے احاطے میں بس کے اردگرد دیکھے تھے۔ یہ خون کی ہولی تھی۔ جب انصاف کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور بااثر لوگ خود کو قانون سے بالاتر سمجھنے لگیں تو پھر ایسے خونی واقعات کا راستہ کون روک سکتا ہے؟ کوئی نہیں روک سکتا......... اور نہ روز ازل سے کوئی روک سکا ہے۔

ہم حد نگاہ تک پھیلی ہوئی جنتر کی جھاڑیوں میں بھاگنے لگے۔ میرے پاؤں ننگے تھے۔ تلوؤں میں کنکر اور کانٹے چبھ رہے تھے لیکن ان کا درد نہ ہونے کے برابر تھا۔ گمان ہو رہا تھا جیسے رائل بنگال ٹائیگر ابھی تک ہمارے تعاقب میں ہے۔ وہ ابھی کسی جھاڑی کی اوٹ سے نکلے گا۔ اپنے آٹھ فٹ لمبے جسم کو کھول کر بھرپور جست لگائے گا اور ہمیں اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ ڈالے گا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا جس سے میں نے شجاع کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مجھے اس کی موجودگی کا قطعاً" احساس نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کون تھا جس نے بروقت میری ضرورت کو محسوس کرکے میری مدد کی' دھیان سیدھا رب نواز کی طرف گیا۔ اگر واقعی کسی نے میری مدد کی تھی تو وہ رب نواز کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

دفعتاً" سلیم بھاگتے بھاگتے اوندھے منہ گرا۔ میں نے اس کے کندھوں کی طرف دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ ایک عجیب وضع کا جسم اس کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔
پہلے تو میں اسے سفید رنگ کا کتا سمجھی مگر غور سے دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہوگئے وہ ایک جنگلی بلا تھا۔ وہ ہمارے راستے میں کہیں درخت پر بیٹھا تھا۔ اوپر سے چھلانگ لگا کر سیدھا سلیم کے کندھوں پر آیا تھا۔ میں نے ایک یا دو سیکنڈ کیلئے سلیم اور جنگلی بلے کو گتھم گتھا دیکھا پھر بلے نے سلیم کو چھوڑا اور تیر کی طرح گھنے درختوں میں غائب ہوگیا۔ اس علاقے میں اس طرح کے جسیم بلے عام پائے جاتے تھے۔ جنگلی جانور کے بھاگ جانے کے

بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے ریوالور میں گولی موجود نہیں تھی ورنہ ممکن تھا میں بدحواسی میں فائر ہی کر دیتی۔ یہ فائر سلیم اور حملہ آور جانور میں سے کسی کو لگ سکتا تھا۔
میں دوڑ کر سلیم کے پاس پہنچی۔ وہ نیم سرخ مٹی میں بری طرح لتھڑا پڑا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے جھاڑے اس کے ہاتھوں اور گردن پر معمولی خراشیں آئی تھیں ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بھاگنے لگے۔ کبھی تھک جاتے تو تیز تیز چلنے لگتے ڈیڑھ دو فرلانگ آگے جانے کے بعد میری اوڑھنی گھنی جھاڑیوں میں اٹک کر رہ گئی۔
اب میں ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی۔ سلیم نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے کندھے سے ایک بارہ بور رائفل بمعہ گولیوں والی پٹی کے جھول رہی تھی۔ ہم جلد ازجلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ ہمیں اس وقت پولیس ہی سے نہیں وہاب کے کارندوں سے بھی خطرہ تھا۔ چھوٹے چوہدری شجاع کی موت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں چنگیزی زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ خاص طور پر میری تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی اور ان کی کوشش ہوگی کہ میں جاگیر کی حدود پھلانگنے سے پہلے پہلے ان کے ہتھے چڑھ جاؤں۔
ایک جگہ میں اور سلیم ہانپ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ یہ سہ پہر دو بجے کا وقت تھا۔ کل رات کی بارش کے بعد تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پھول پتے دھلے ہوئے اور نکھرے نکھرے تھے۔ مگر اس نکھار اور اس سہانے موسم پر توجہ دینے کی فرصت کسے تھی۔ یہ سب کچھ تو امن کی باتیں ہوتی ہیں اور ہم میدان جنگ میں تھے۔ ہمارے چاروں طرف خوف کے سائے تھے اور موت کے ساتھ ہماری آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ درختوں میں بیٹھنے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ دھیان سے سلیم کی طرف دیکھا۔ لباس وہی تھا جو میں نے پانچ چھ روز پہلے خان رحیمی کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔ کف اور کالر گندے تھے۔ قمیض کے کئی بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ چہرے سے ابھی تک بیمار اور ناراض ناراض لگتا تھا۔ اچانک میری نظر سلیم کی پشت پر گئی۔ خون کے دھبے اب اور پھیل گئے تھے۔ اس کی قمیض میں گولی کا نشان دیکھ کر میں بھونچکی رہ گئی۔ جلدی سے اس کی قمیض پھاڑ کر پشت ننگی کی۔ دائیں کندھے سے تھوڑا نیچے ایک گولی تقریباً دو انچ گوشت میں دھنسی ہوئی تھی۔ زخم دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگایا کہ کوشش کر کے گولی ابھی نکال لی جا سکتی ہے۔

میں نے ایک دفعہ بڑے بھائی جان کو گھر میں ایک بالکل ایسا ہی آپریشن کرتے دیکھا تھا۔ ایک واقف کار تھا جو اسپتال جانا نہیں چاہتا تھا۔ بھائی نے گھر ہی میں معمولی اوزاروں کے ساتھ اس کی پشت سے گولی نکال لی تھی۔ میں نے سلیم سے کہا کہ اسے فوری طور پر گولی نکلوا لینی چاہئے۔ ابھی زخم تازہ ہے زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ اس نے کہا "نہیں رہنے دو، میں تکلیف محسوس نہیں کر رہا۔" میں نے کہا "تکلیف کچھ دیر ٹھہر کر شروع ہو گی۔ بہتر ہے کہ پہلے ہی اس مصیبت سے نجات حاصل کر لو۔"

میرے سمجھانے بجھانے پر وہ مان گیا۔ خوش قسمتی سے میں نے وہ استرا دوبارہ اٹھا لیا تھا جو لڑائی کے دوران میرے ہاتھ سے نکل کر چھت سے صحن میں گر گیا تھا۔ اب یہ استرا میرے پاس تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے کانپتے ہاتھوں سے استرا اٹھایا اور سلیم کی پشت پر گہرا زخم لگا کر گولی نکال لی۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ سلیم نے بے حد برداشت کا مظاہرہ کیا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اور چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ زمین پر گرنے لگے۔ گولی نکالنے کے بعد میں نے چکنی مٹی رکھ کر خون بند کیا اور اپنی قمیض کا دامن پھاڑ کر پٹی باندھ دی۔ گولی نکلنے کے بعد سلیم نے بے حد سکون محسوس کیا۔ اب وہ زیادہ بہتر طریقے سے صورت حال کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ اس نے پر سوچ لہجے میں کہا۔

"ثناء ہمیں جلد از جلد لاہور پہنچنا چاہئے۔ مجھ ڈر ہے کہ نواز حسنی صاحب کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔"

میں نے پوچھا "غلط قدم سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ بولا "حسنی صاحب کو کچھ معلوم نہیں کہ ارسہ آزاد ہو چکی ہے۔ انہیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میں اور اختر زماں یہاں آئے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی بے خبری میں ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ارسہ کو اب بھی یرغمال سمجھیں گے۔ اور وہ سب کچھ کر گزریں گے جو چنگیزی ان سے چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب......... تم کہنا چاہتے ہو کہ وہ پرندے.........؟"

"ہاں......... پروگرام کے مطابق آج حسنی صاحب نے وہ پرندے ملک سے باہر بھجوا دیئے ہیں۔ اور کل یا پرسوں کسی وقت وہاب چنگیزی بھی جعلی پاسپورٹ پر ملک سے نکل جائے گا۔ اب سے چھ سات گھنٹے بعد دس بجے والی فلائٹ سے لکڑی کے دو بکس

لاہور سے ایک خلیجی ریاست کے لئے بک کئے جائیں گے۔ ظاہری طور پر ان بکسوں میں خوردنی اشیاء ہوں گی مگر اصل سامان کچھ اور ہوگا۔ میرا خیال ہے تم سمجھ رہی ہو۔ ان بکسوں میں وہ کروڑوں روپے مالیت کے پرندے ہیں جو ایک زبردست پلاننگ کے تحت ملک سے اسمگلنگ کئے جا رہے ہیں۔ یہ اسمگلنگ کی دنیا کا ایک بہت بڑا واقعہ ہوگا۔"

میں نے کہا "میں کچھ سمجھ نہیں پائی لکڑی کے باکسز کے ذریعے پرندے کس طرح اسمگل ہو سکتے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ ترقی یافتہ دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انڈر سیکرٹری نواز حسنی صاحب مجرموں کے ہاتھ میں ہیں ان کے ذریعے وہ سب کچھ کرا سکتے ہیں........."

میں نے پوچھا "کیا پرندوں کو بے ہوش کیا جائے گا؟"

"ہاں......... تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ وہی تکنیک استعمال کی جا رہی ہے جو اس سے پہلے پرندوں کی ایک کھیپ خان رحیمی کی کوٹھی پہنچانے میں استعمال کی گئی تھی۔ تمہیں وہ غیر ملکی ڈاکٹر یاد ہوگا جو تم نے مرغی خانے میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی فیلڈ کا ماہر ترین شخص ہے۔ پرندوں کو پہلے خاص طریقے سے بے ہوش کیا جائے گا۔ بعد ازاں انہیں بکسوں میں رکھ کر ائر پورٹ پہنچایا جائے گا۔ جہاں نواز حسنی صاحب کسٹم اور سیکورٹی چیک اپ کے تمام مراحل کامیابی سے طے کرائیں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ خود بھی اسی فلائٹ کے ذریعے سفر کریں گے اور پرندوں کو بحفاظت منزل مقصود تک پہنچا کر لوٹیں گے........."

اگر سلیم کی معلومات درست تھیں تو صورت حال واقعی تشویشناک تھی نواز حسنی صاحب کو جلد از جلد ارسہ کی رہائی سے باخبر کرنا ضروری تھا......... جہاں تک میرا اپنا تعلق تھا میں بالکل مختلف انداز میں سوچ رہی تھی۔ نواز حسنی، ارسہ اختر زماں اور ان کے مسائل سے مجھے کچھ زیادہ سروکار نہیں تھا۔ میرا اپنا ایک مسئلہ تھا......... اور آج میں اس مسئلے کو حل کر لینا چاہتی تھی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آدمی ایک خون کر لے تو اس کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ تو شاید شجاع کو مارنے اور کئی دوسروں کو زخمی کرنے کے بعد میرے سر پر بھی خون سوار ہو چکا تھا۔ میرے دل میں ایک ہی خواہش تھی جو لاوے کی طرح اچھل رہی تھی اور شعلے کی طرح بھڑک رہی تھی۔ اور یہ خواہش تھی ملعون

شیطان کو قتل کرنے کی۔ میں جانتی تھی شجاع کو مارنے کے بعد اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ کسی بھی وقت کسی چنگیزی کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی میرا کام تمام کر دے گی۔ اس گولی کے اپنے نشانے تک پہنچنے سے پہلے میں اپنے ہدف تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ میں کوئی بڑی طاقتور یا مار دھاڑ کرنے والی پھولن دیوی ٹائپ عورت نہیں تھی۔ میں ایک کمزور اور ناتواں عورت تھی۔ غالباً ڈرپوک بھی تھی کیونکہ چند سال پہلے تک کسی کو لگا ہوا معمولی زخم بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن آج میرے بازوؤں اور میرے سینے میں ایک عجیب طرح کا حوصلہ سمایا ہوا تھا.......... میرے "معصوم" کے منہ سے آنے والی کچے دودھ کی خوشبو میرے ہر ہر مسام میں رچی ہوئی تھی۔ اس کے بھولے بسرے لمس کی کسک نے میرے انگ انگ میں بجلی دوڑا دی تھی۔ میرے اندر کی زخمی ماں بپھری ہوئی تھی اور اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا.......... سلیم کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فوری طور پر نواز حسنی کے پاس پہنچنا چاہتا ہے.......... لیکن میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں بڑی حویلی کے اردگرد کھیتوں میں کہیں موجود رہوں اور کسی طرح وہاب چنگیزی تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ ممکن تھا میری قسمت یاوری کرتی اور میں کسی طرح اپنے استرے کی دھار کے ساتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتی۔ یقیناً یہ ایک خطرناک کوشش تھی۔ لہٰذا اس خطرناک کوشش میں میں کسی کا ساتھ نہیں چاہتی تھی اور سلیم کا تو کسی صورت میں نہیں۔

میں نے سلیم سے کہا "اگر وہ نواز حسینی کی طرف جانا ضروری سمجھتا ہے تو چلا جائے۔ میں خان رحیمی کی طرف چلی جاتی ہوں کیونکہ اس وقت وہی ٹھکانہ میرے لئے مناسب ہے۔" سلیم گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت جلد وہ میرے اندر کی کشمکش تاڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر فکر مندی نظر آنے لگی۔ بولا "نہیں ثناء، ہم دونوں اکٹھے جائیں گے۔ نواز حسنی کو خبر کرنے کے بعد ہم خان رحیمی کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میرے بار بار انکار کرنے کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کے اڑیل پن میں کبھی کبھی ایک بچے کی ضد جھلکنے لگتی تھی۔ ایسے وقت اسے کسی بات سے روکنا ناممکن ہو جاتا تھا.......... جب وہ کسی طرح مجھے تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو میں نے خود کو حالات

کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ہم نے گھنی جھاڑیوں اور اونچے کھیتوں میں مشرق کی طرف سفر جاری رکھا۔ شام سے ذرا پہلے ہم نے خشک نالہ پار کیا اور گوروں کے ایک قبرستان سے گزر کر بستی چاہ مولا کے نواح میں پہنچ گئے۔ اب ہم چنگیزیوں کی جاگیر سے باہر آچکے تھے۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ چنگیزی اس پورے علاقے پر زبردست گرفت رکھتے تھے۔ سلیم کو کسی سواری کی تلاش تھی کوئی جیپ 'ٹریکٹر ٹرالی' گھوڑا' کچھ بھی مل جاتا۔ راستے میں ایک جگہ ٹریکٹر ٹرالی نظر آئی بھی تھی۔ تاہم اس پر آٹھ دس ہٹے مزدور سوار تھے۔ اور ان میں سے دو تین افراد مسلح بھی تھے۔ مسلح افراد کو دیکھ کر سلیم کو بجا طور پر شک گزرا تھا کہ یہ لوگ بھی چنگیزیوں کے کارندے ہیں۔ وہ مجھے لے کر ایک کماد میں گھس گیا تھا اور ہم اس وقت باہر نکلے تھے جب ٹرالی کافی آگے جا چکی تھی۔

شام کے قریباً چھ بجے جب ہم بستی چاہ مولا سے ایک کوس آگے نکل آئے تھے اچانک ہماری مراد بر آئی۔ راستے سے کچھ ہٹ کر ایک سفید ٹویوٹا کار کھڑی نظر آئی اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا لیکن اردگرد کوئی سایہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم دبے پاؤں ایک کھیت میں گھسے اور احتیاط سے کار کی طرف بڑھنے لگے۔ سلیم اپنی رائفل ہاتھ میں لے چکا تھا۔ کار کھیت کی منڈھیر کے ساتھ کھڑی تھی۔ پندرہ بیس گز فاصلہ طے کر کے ہم کار کے عقب میں پہنچ گئے۔ اندر نسوانی ہنسی کی مدہم آواز سنائی دی۔ پھر کوئی لڑکی بولی۔

"یہ بونٹ کیوں اٹھا دیا تم نے؟"

کسی لڑکے کی آواز آئی "بھئی کوئی آ بھی گیا تو یہی سمجھے گا کہ گاڑی ٹھیک کر رہے ہیں۔"

لڑکی ہنسی "بونٹ باہر اٹھا رکھا ہے اور گاڑی اندر ٹھیک کر رہے ہو۔"

لڑکا بولا "بیس سے چوبیس سال کے درمیان ایسا ہی ہوتا ہے۔ خرابی کہیں بھی ہو گاڑی اندر بیٹھ کر ہی ٹھیک ہوتی ہے۔"

لڑکی غرائی "تم مجھے کیوں بیس سے چوبیس سال کے درمیان گھسیٹ رہے ہو۔"

"اوہ ساری" لڑکے نے معذرت کی "میں بھول گیا۔ تمہارے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے" دونوں دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے۔ سلیم نے تیزی سے باہر نکل کر

ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا اور ایک نوجوان لڑکے کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ لڑکا درمیانے قد کاٹھ کا تھا۔ اس نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ سلیم کی قمیض پر خون کے دھبے اور ہاتھ میں بندوق دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ یہی حال اس کی ساتھی لڑکی کا ہوا۔ ہماری آمد نے ان کی ان ڈور پکنک کا ستیاناس کر دیا (لڑکا اور لڑکی کسی ایڈوانس زمیندار گھرانے سے لگتے تھے) سلیم نے لڑکے سے کار کی چابی مانگی۔ اس نے حیل و حجت کی تو سلیم نے بندوق کا کندا زور سے اس کی گردن پر دے مارا۔ وہ بے چارا لڑکھڑا کر گاڑی کی ڈگی پر گرا۔ یہ صورت حال دیکھ کر لڑکی رونے لگی اور لڑکے سے درخواست کرنے لگی کہ وہ چابی دے دے۔ لڑکے نے بھی اسی میں عافیت جانی۔ لڑکی کے گلے میں ایک لمبا سا مفلر تھا جو دوپٹے کی طرح اس کے دونوں گھٹنوں پر جھول رہا تھا۔ سلیم نے رائفل مجھے تھمائی اور اس مفلر سے لڑکے اور لڑکی کے ہاتھ پشت پر کس کر باندھ دیئے۔ ہاتھ باندھنے میں اس نے زبردست مہارت دکھائی۔ ان دونوں کی پشتیں جڑی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ کھولے بغیر کہیں آجا نہیں سکتے تھے۔ بونٹ گرا کر ہم دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔ میں نے سلیم سے پوچھا کہ کہیں وہ ٹھٹھر کر مر ہی نہ جائیں۔ اس نے کہا "نہیں۔ ایک آدھ گھنٹے تک یہ ہاتھ کھول لیں گے یا ڈھیلے کرکے نکال لیں گے۔"

انجن اسٹارٹ کرکے سلیم نے گاڑی آگے بڑھائی۔ ڈیک پر نغمہ گونج رہا تھا "دو ستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات.........."

بڑی سڑک پر پہنچتے ہی سلیم نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ وہ بے حد تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہر لحظہ لگتا تھا کہ کسی بس ٹرک سے ٹکرا کر ہم پاش پاش ہو جائیں گے اتنی تیز ڈرائیونگ کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو لاہور پہنچنے کی جلدی' اور دوسری وہ ناراضگی جو ان دنوں ہر وقت سلیم کے موڈ پر حاوی رہتی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں جیسے آگ برسانے لگتی تھیں۔ میں بھی اس آگ کو چھیڑ کر خواہ مخواہ جھلسنا نہیں چاہتی تھی۔ اس آگ کو چھیڑ کر مجھے کئی تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ سلیم کو خود سے ایک فاصلے پر رکھنے کی کوشش میں میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس پر میں ساری عمر پچھاتی رہوں اور وہ بھی شکوہ کناں رہے۔ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی۔ گاڑی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی ساڑھے تین گھنٹے کا سفر دو گھنٹے میں

طے کرکے لاہور پہنچ گئی۔ لاہور پہنچتے ہی سلیم نے اس کارخانے کا رخ کیا جو نواز حسنی کے ماتحت رئیس احمد کی ملکیت تھا اور جہاں وہ قالین بافی کراتا تھا۔ یہ کارخانہ ملتان روڈ اور بند روڈ کے درمیانی علاقے میں کہیں واقع تھا (ان دنوں بند روڈ کے ساتھ ساتھ ابھی آبادی زیادہ نہیں ہوئی تھی) کھلے کھیتوں میں کہیں کہیں کارخانہ داروں نے عمارتیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ گاڑی کارخانے کے عین سامنے جارکی۔ لٹھ بردار پنجابی چوکیدار نے سلیم کو اندر جانے سے روکا۔ سلیم اسے دھکیل کر اندر گھس جانا چاہتا تھا' جب رئیس احمد خود ہی باہر آگیا۔ وہ حسب معمول پینٹ بشرٹ میں تھا اور اس کی چمکیلی عیار آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ رشوت خوری اور خوشامد جیسے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ سلیم سے اس کی ملاقات خان رحیمی کی کوٹھی میں ہو چکی تھی۔ سلیم کو دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھ آیا۔

"السلام علیکم' بابری پہلوان' سناؤ' کہاں سے آرہے ہو۔ وہ.......... نواز حسنی تو بہت پریشان تھے تمہارے اور اختر زماں کے بارے میں۔ کہتے تھے پتہ نہیں کہاں گم ہو گئے ہیں۔"

سلیم نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا "رئیس صاحب' نواز صاحب کہاں ہیں؟" اس سوال پر رئیس کی آنکھوں میں اچانک بے رخی نظر آنے لگی۔ اس نے محتاط لہجے میں پوچھا "تمہیں نہیں معلوم" سلیم نے نفی میں جواب دیا۔ رئیس بولا "مجھے بھی نہیں معلوم!"

سلیم نے غرا کر کہا "دیکھو رئیس صاحب! آپ کو پتہ نہیں آپ مجھے اندھیرے میں رکھ کر نواز صاحب کا کتنا بڑا نقصان کریں گے۔ وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ فوری طور پر مجھے نواز صاحب سے ملا دیں۔"

رئیس نے کہا "لیکن وہ تو یہاں نہیں ہیں۔" تم خود اندر جا کر دیکھ لو۔ سلیم نے فوری طور پر اس پیشکش کا فائدہ اٹھایا اور دندناتا ہوا اندر گھس گیا۔ تین چار منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اس نے بڑی ملائمت کے ساتھ رئیس سے کہا۔

"رئیس صاحب' آپ سو فیصد کتے کی اولاد ہیں۔ آپ کی ٹھکائی مجھ پر ادھار رہی۔ انشاء اللہ۔"

رئیس احمد بھونچکا ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیم غڑاپ سے گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے ریس دبائی۔ پہیوں نے طویل احتجاجی چیخ ماری اور چکنی سڑک پر لہراتے چلے گئے۔ رات کے قریباً نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر بہت کم ٹریفک تھا۔ سلیم گاڑی کو اڑاتا چلا گیا۔

میں نے پوچھا "اب کہاں؟"

"ائرپورٹ" اس نے مختصر جواب دیا۔

"یعنی وہ لوگ پرندے لے گئے ہیں۔"

"ہاں......... دعا کرو ابھی وہ راستے میں ہوں۔ اس بدبخت رئیس نے خواہ مخواہ پانچ چھ منٹ ضائع کر دیئے" ہم نے قریباً پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مزنگ چونگی کا مصروف چوک کراس کیا اور شاہراہ قائداعظم کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم شاہراہ سے دو فرلانگ دور ہی تھے کہ میری نظر نواز حسنی کی کریم کلر گاڑی پر پڑ گئی۔ میں نے چیخ کر سلیم کو اس طرف متوجہ کیا۔ گاڑی دیکھتے ہی سلیم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے رفتار مزید بڑھائی اور شاہراہ قائداعظم پر مڑتے مڑتے گاڑی کو جا لیا۔ میں نے تیز نظروں سے دیکھا نواز حسنی گاڑی میں موجود نہیں ہے۔ کچھ اجنبی چہرے نظر آ رہے تھے۔ جس میں ایک شخص کسٹم آفیسر کی وردی میں تھا۔ گاڑی کے آگے کسی سرکاری محکمے کا اوپن ٹرک جا رہا تھا۔ ٹرک میں کچھ دوسرے سامان کے ساتھ لکڑی کے تین بڑے بڑے بکس بھی لدے ہوئے تھے۔ تینوں بکس بالکل ایک جیسے تھے۔ سلیم کی معلومات کے مطابق ان میں سے ایک بکس میں واقعی کچھ مہنگی قسم کی خوردنی اشیاء تھیں۔ جبکہ باقی دو بکسوں میں پرندے تھے۔ اس پرانے ماڈل کے دھواں دھار ٹرک کو دیکھ کر کون اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ ٹرک کروڑوں روپے کا پیکج لے کر جا رہا ہے۔ ٹرک کو اوورٹیک کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ٹرک کے آگے بھی ایک ایسی جیپ جا رہی ہے جس کا تعلق نواز حسنی کی کوٹھی سے ہے۔ میں نے اچھی طرح جھانکا اس جیپ میں بھی کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ سلیم کار کو جیپ سے آگے لے گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ جیپ بھی نواز حسنی کی کوٹھی سے آئی ہے......... سلیم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ دس پندرہ گز جیپ سے آگے چلنے کے بعد سلیم نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر جیپ کو رکنے کا اشارہ کیا۔ مگر جیپ کی رفتار میں کوئی کمی

نہیں آئی۔ جب دو تین بار اشارہ دینے کے باوجود جیپ نہیں رکی تو سلیم نے اس کے آگے آگے چل کر کار کی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ عجب صورت حال تھی۔ ہم مفرور ملزم تھے لیکن اس وقت ہماری جگہ سرکاری لوگ بھاگ رہے تھے اور ہم انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیپ والوں کو جب یقین ہو گیا کہ ہم انہیں روکنا چاہتے ہیں تو انہوں نے اپنی رفتار کم کی اور گاڑی کو سڑک کی سائیڈ پر لگا دیا۔ ان کے رکنے کا اثر پیچھے آنے والے ٹرک اور کار پر بالکل نہیں پڑا۔ یہ دونوں گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ جیپ میں چار افراد سوار تھے۔ ان میں سے ایک کوئی چوکیدار نما شخص تھا۔ اس کے کندھے سے بندوق جھول رہی تھی۔ سلیم کار سے اتر کر جیپ کے پاس پہنچا۔ جیپ میں سے بھی ایک صحت مند آدمی اتر کر سڑک پر آ چکا تھا۔ سلیم اور وہ کچھ دیر سڑک پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر جیپ کے اندر چلے گئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ سلیم نے جیپ کے اندر جا کر اچھا نہیں کیا۔ یہ اجنبی لوگ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اور پھر یہی کچھ ہوا۔ ایک شخص جس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی تیز قدموں سے میری طرف آیا اور کھڑکی میں جھک کر بولا۔

"بی بی! آپ کو مجسٹریٹ صاحب جیپ میں بلا رہے ہیں۔"

بولنے والے کے لہجے سے مجھے خطرے کی بو آئی۔ میں نے کہا "کون مجسٹریٹ؟ جس نے مجھ سے کچھ کہنا ہے یہیں کہے" ابھی بات میرے منہ ہی میں تھی کہ ایک دوسرا شخص پھرتی سے دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہولسٹر پر تھا۔ تیور بتا رہے تھے کہ اگر میں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو وہ پستول نکال کر میری کنپٹی سے لگا دے گا۔ اس نے گرج دار لہجے میں کہا۔

"خاموش بیٹھی رہو بی بی' چوں چاں کی تو اچھا نہیں ہو گا" تب وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا "تم گاڑی چلاؤ بشیر۔ ڈیفنس والی کوٹھی پر چلو۔"

بشیر نامی شخص نے فوری تعمیل کی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے دیکھا وہ جیپ بھی پیچھے آ رہی ہے جس میں سلیم داخل ہوا تھا۔ میں نے راستے میں بار بار پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھائیس تیس سال

کاایک بارعب شخص تھا۔ اس وقت وہ بہت غصے میں تھا اور آنکھیں جیسے شعلے اگل رہی تھیں۔

قریباً دس منٹ بعد دونوں گاڑیاں ایک وسیع و عریض نیم تاریک کوٹھی میں داخل ہوئیں میں نے گھوم کر دیکھا تو سلیم بھی جیپ سے اتر رہا تھا۔ چوکیدار نما شخص کی بندوق اب اس کے ہاتھ میں نظر آرہی تھی۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ سلیم کو زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ ہم آگے پیچھے چلتے ایک جہازی سائز کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ سلیم نے زوردار لہجے میں لحیم شحیم شخص کو مخاطب کیا اور بولا۔

"دیکھیں آپ ہم پر شک کر کے زبردست نقصان اٹھائیں گے.......... آپ اس ٹرک کو روکنے کی کوشش کریں۔"

لحیم شحیم شخص نے گرج کر کہا "وہ ٹرک رک چکا ہے اور تم اپنی چونچ بند رکھو میں فی الحال تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔"

سلیم خاموش ہو گیا تو وہ شخص ہاتھ پشت پر باندھ کر بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دو تین منٹ کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس شخص نے لپک کر ٹیلیفون اٹھایا۔

"ہیلو.......... کون؟" بہروز خاں.......... ٹرک کہاں روکا ہے.......... چلو ٹھیک ہے؟" .... نہیں نہیں.......... تم میں سے کوئی یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ گڑبڑ ہو گئی ہے.......... یہ سارا پروگرام فی الحال کینسل سمجھو.......... ہاں ہاں ڈاکٹر سنبھال کر سب کچھ.......... تم فون نمبر لکھواؤ.......... میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ اوکے.......... گڈ بائی۔"

ریسیور نیچے رکھ کر اس نے مجھے اور سلیم کو گھورا۔ تب چوکیدار سے کہنے لگا کہ وہ گیٹ پر رہے اور اردگرد کڑی نگاہ رکھے۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے ہمارے کچھ ساتھی بھی ہوں جو یہاں تک پہنچ جائیں۔

سلیم نے کہا "آپ حد سے زیادہ شکی مزاج شخص ہیں۔ آپ کو اب تک ہم پر اعتماد کر لینا چاہئے تھا۔"

لحیم شحیم شخص نے ازحد خشک لہجے میں کہا "میں تمہیں کہہ چکا ہوں اپنی بکواس بند

رکھو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب پتہ چل جاتا ہے۔"

چند لمحے بعد ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ لحیم شحیم شخص نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہنے کے بعد بولا "جی سر' میں چوہدری طارق بول رہا ہوں" اس کے بعد جو گفتگو ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ لائن پر دوسری طرف نواز حسنی صاحب خود ہیں۔ وہ ائرپورٹ کے اندر کہیں موجود تھے اور چوہدری طارق کے نہ پہنچنے پر پریشان ہو رہے تھے۔ چوہدری طارق نے مودب لہجے میں کہا۔

"جی سر' رئیس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ پہلے کارخانے سے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر راستے میں ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ سر.......... ہاں سر' بات تو ایسی ہی ہے۔ ایک بندے نے ہمارا راستہ روکا ہے جی.......... بابری نام بتا رہا ہے.......... ساتھ میں ایک عورت بھی ہے.........."

اس کے ساتھ ہی چوہدری طارق کے تاثرات بدل گئے۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر وہ بولا "جی ہاں.......... میرے پاس ہی ہیں.......... میں.......... میں بلاتا ہوں ان کو" اس نے ریسیور کان سے ہٹایا اور سلیم سے کہا کہ وہ بات کرے۔ سلیم نے آگے بڑھ کر ریسیور تھاما اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "جناب.......... میرے پاس آپ کے لئے ایک ضروری اطلاع ہے جو شاید فون پر دینا مناسب نہ ہو۔ آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں.......... نہیں سر.......... میں سوچ سمجھ کر بات کرتا ہوں.......... آپ فوراً یہاں آجائیں" اس کے بعد سلیم نے ریسیور چوہدری طارق کو تھما دیا۔ اس نے چند باتیں کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب چوہدری طارق کے چہرے پر کرختگی کی جگہ ملائمت نے لے لی تھی۔ وہ معذرت کے لہجے میں بولا۔

"معاف کرنا بھائی۔ تم جانتے ہی ہو یہ کتنا نازک معاملہ ہے۔ اگر اس وقت میرا سگا باپ بھی ہوتا تو میں اس پر اعتبار نہ کرتا۔" پھر اس نے سلیم کے خراب حلیے پر نظر ڈالی اور کہا کہ اگر وہ نہا کر کپڑے بدلنا چاہتا ہے تو انتظام ہو سکتا ہے۔ سلیم نے سر کے اشارے سے انکار کر دیا۔ اس دوران ایک مسلح شخص اندر آیا اور سلیم کی بھری ہوئی رائفل اس کے پاس کرسی پر رکھ دی۔ غالباً یہ رائفل جیپ کے اندر اس سے لے لی گئی تھی۔ سلیم نے بتایا کہ ہم چوری کی کار میں یہاں پہنچے ہیں اور بہتر ہے کہ یہ کار کسی سنسان سڑک پر

کھڑی کر دی جائے۔ طارق چوہدری نے اس مشورے پر فوری عمل کرتے ہوئے ایک شخص کو کار کی چابی دے کر بھیج دیا۔ سلیم خاموشی سے فرش کو گھور رہا تھا۔ میں بھی اپنی بوسکی کی چادر میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ شاید میں بتانا بھول گئی کہ کھیتوں میں ہم جس لڑکے لڑکی کو باندھ آئے تھے ان سے ہم نے کار کے علاوہ یہ چادر بھی لی تھی۔ یہ چادر لڑکی کی تھی اس نے لاپرواہی سے کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ مجھے اس وقت ایک دھلی دھلائی اچھی چادر کی شدید ضرورت تھی۔ لہٰذا بہ امر مجبوری یہ چادر میں نے اس سے لے لی تھی۔ راستے میں اس چادر کے گھونگھٹ نے مجھے بہت سے دشمنوں سے محفوظ رکھا تھا.......... ہمیں نواز حسنی صاحب کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے وہ اس کوٹھی میں کسی عقبی راستے سے آئے تھے۔ کیونکہ نہ تو ہمیں گاڑی کی آواز سنائی دی اور نہ ان کے قدموں کی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں پوری افسرانہ شان کے ساتھ وارد ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے ان کی اندرونی بے چینی کا شدید اظہار ہوتا تھا۔ چوہدری طارق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ ہمیں ایک ملحقہ کمرے میں لے گئے۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ قریباً چیخ پڑے۔

"کیا خبر ہے تمہارے پاس؟"

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا' جناب' آپ بازی جیت چکے ہیں۔ چوہدری وہاب کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ" نواز حسنی نے روہانسی آواز میں کہا۔

میں نے سلیم کی مدد کرتے ہوئے کہا "سر! میرا خیال ہے آپ کو ابھی تک ارسہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی.......... ارسہ رہا ہو چکی ہے اور اس وقت مقامی پولیس کی تحویل میں ہے.........."

نواز حسنی صاحب سرتاپا لرز گئے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں حیرت کی فراوانی سے انہیں دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔ انہوں نے لرزاں لہجے میں پوچھا "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

سلیم نے کہا "جناب! ہم دونوں ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے چنگیزیوں کے ڈیرے پر بلہ بول کر ارسہ بی بی کو رہا کرایا ہے۔"

نواز حسنی بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے کہ اب ارسی کہاں ہے۔ سلیم نے کہا "جناب! آپ کے صاحب زادے اختر زماں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ چنگیزیوں کے ڈیرے میں گھسنے سے پہلے انہوں نے مقامی پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ جب ہم ارسہ بی بی کو چھڑا کر ڈیرے سے نکلے اور چنگیزیوں کی گاڑیوں نے ہمارا پیچھا شروع کیا تو ایس پی جھنگ بھی پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر چنگیزی موقع سے پیچھے ہٹ گئے.........."

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور نواز حسنی صاحب کی اجازت سے ان کا ایک خاص ملازم اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اندرونی ہیجان سے تمتما رہا تھا۔ نواز حسنی کے کان پر جھک کر اس نے کچھ کھسر پھسر کی اور مودب کھڑا ہو گیا۔ نواز حسنی نے اسے باہر بھیجنے کے بعد کہا "میری رہائش پر جھنگ سے کال آئی ہے۔ انتظامیہ کا ایک اعلیٰ افسربات کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو" نواز حسنی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے ہمیں بھی چلنے کو کہا۔ کوٹھی کی عقبی سمت وہ ڈاٹسن کھڑی تھی جس میں وہ یہاں پہنچے تھے۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر کے لائے تھے۔ ہمیں بٹھا کر وہ تیز رفتاری سے اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ بنگلے میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنے میٹنگ روم کا رخ کیا جہاں ان کا نجی ٹیلیفون پڑا رہتا تھا.......... قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ ٹیلی فون کال سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ ان کے چہرے پر خوشی اور غمی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ارسہ پولیس کی تحویل میں سلامتی سے ہے۔ جبکہ اختر زماں جھنگ اسپتال کے آئی سی یو میں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ چوہدری شجاع موقعے پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ جبکہ ان چار زخمیوں میں سے بھی ایک شخص چل بسا ہے جو میرے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ چھوٹے چوہدری شجاع کی موت حویلی میں کہرام برپا کر چکی تھی اور چنگیزیوں کے ہرکارے ہر طرف ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ نواز حسنی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ چوہدری وہاب ابھی تک موقع پر نہیں پہنچا۔ اس کے کارندوں نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ پرانی دشمنی کی بنا پر بدمعاشوں کے ایک گروہ نے ان کے ڈیرے پر مسلح یلغار کی ہے۔ اور اس یلغار میں وہ عورت بھی شامل تھی جس نے کچھ عرصہ پہلے بڑی حویلی میں دلہن کے روپ میں قدم رکھا تھا اور بعد ازاں اپنے شوہر واصف چنگیزی کو قتل کر کے

فرار ہو گئی تھی۔ میں بغور نواز حسنی صاحب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ان کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ شک نہیں جاگا کہ بڑی حویلی کی سابق جاگیردارنی میں ہی ہوں۔ میرے اجڑے بجڑے بال' میلا کچیلا چہرہ اور خستہ لباس دیکھ کر کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی۔

نواز حسنی صاحب نے ہم سے کہا "تم دونوں کے لئے اب یہ ٹھکانہ مناسب نہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے تمہیں اب خان رحیمی کے پاس بھی نہیں لوٹنا چاہئے۔ کیونکہ اب وہ بھی اس کہانی میں اپنا کردار بدلنے والا ہے۔ میں نے نواں کوٹ سمن آباد کے علاقے میں تمہارے لئے ایک رہائشی کوارٹر کا بندوبست کر دیا ہے۔ رئیس احمد ابھی گاڑی لے کر آئے گا اور تمہیں خاموشی سے وہاں شفٹ کر دے گا۔ میں اب اختر کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ تم سے رابطہ میں تمہارے کوارٹر میں ہی کروں گا.........." یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے باہر نکلے مگر دروازے تک پہنچتے پہنچتے رک گئے۔ مڑ کر بولے "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ بلکہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ تمہیں زیادہ دن منہ چھپانے کی زحمت نہیں ہوگی۔ چنگیزیوں کے برے دن شروع ہو گئے ہیں۔ میں انہیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ تاعمر یاد رکھیں گے۔"

نواز حسنی صاحب کو گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ رئیس احمد ہمیں ایک سوزوکی کار پر لینے پہنچ گیا۔ ہم فی الحال نواز حسنی صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لہٰذا کار میں جا بیٹھے۔ رئیس احمد کچھ شرمندہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اسے دہری شرمندگی تھی ایک تو میری وجہ سے کہ چند ہفتے پہلے اس نے مجھے کسی زر خرید لونڈی کی طرح نواز حسنی صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دوسرے وہ سلیم سے بھی شرمندہ تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جب ہم کو اس کی مدد درکار تھی اس نے ہمیں آئیں بائیں شائیں کر کے ٹالنے کی کوشش کی تھی.......... وہ خاموشی سے ہمیں نواں کوٹ کے ایک مختصر مکان میں لے آیا۔ دو کمروں اور ایک کچن والا یہ کوارٹر گنجان آبادی میں گھرا ہوا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں نیم کا پودا تھا اور گلاب کی کیاریاں تھیں.......... روز مرہ استعمال کا کچھ سامان کوارٹر میں پہلے سے موجود تھا۔ کچھ سامان رئیس احمد گاڑی میں ہی رکھ کر لایا تھا۔ یہ زیادہ تر کچن کا سامان تھا۔ رئیس نے سلیم کے ساتھ مل کر یہ سامان کچن میں

رکھا۔ پھر کھسیانے انداز میں خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا۔

وہ رات ہم نے کوارٹر میں گزاری۔ علی الصبح کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سلیم نے دروازہ کھولا۔ ایک شخص لفافہ تھما کر واپس چلا گیا۔ اس لفافے میں ایک رقعہ تھا۔ یہ رقعہ نواز حسنی صاحب کی طرف سے تھا۔ اس رقعے میں درج ہدایات کے مطابق سلیم کا نام غلام عباس اور میرا نسرین تھا۔ ہم گجرات سے شفٹ ہو کر یہاں آئے تھے۔ سلیم یعنی غلام عباس مصور تھا اور گھر ہی میں بیٹھ کر رسالوں اور ڈائجسٹوں کے لئے اسکیچ وغیرہ بناتا تھا۔ نواز حسنی صاحب نے ہم دونوں کو ہدایت کی تھی کہ پڑوسیوں سے زیادہ گھلنے ملنے اور گھر سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔ ان ہدایات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ ہمیں اس کوارٹر میں فرضی میاں بیوی کے طور پر رہنا ہوگا۔ میرے لئے یہ سب کچھ بہت الجھن کا باعث تھا لیکن حالات کے تقاضے کو بھی نظرانداز کرنا مشکل تھا۔

ہم نے اس کوارٹر میں خاموشی کے ساتھ ایک ہفتہ گزار دیا۔ اس ہفتے میں کوارٹر کی چار دیواری سے باہر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ رئیس احمد اور ایک دوسرے شخص رمضان کی زبانی ہمیں وقتاً فوقتاً ان تبدیلیوں کی خبریں ملتی رہیں۔ سب سے پہلے یہ اطلاع ملی کہ نواز حسنی صاحب نے وہ کروڑوں روپے کے پرندے محکمہ وائلڈ لائف کے حوالے کر دیے ہیں جو پچھلے ایک برس میں مختلف علاقوں سے اکٹھے کئے گئے تھے اور جنہیں چنگیزی ملک سے باہر اسمگل کرانا چاہتے تھے۔ اس اطلاع کی تصدیق اخباری خبر سے بھی ہوئی۔ یہ خبر بڑے اہتمام سے چھاپی گئی تھی۔ خبر پڑھنے کے بعد مجھے اور سلیم کو اندازہ ہوا کہ نواز حسنی کا بیان دراصل نواز حسنی اور خان رحیمی کے باہمی صلاح مشورے کا نتیجہ ہے۔ خان رحیمی اسرار کا لبادہ اتار کر منظر عام پر آگیا تھا اور اس نے بھی چنگیزیوں کے خلاف خم ٹھونک کر بیان دیا تھا۔ درحقیقت ان دونوں نے بڑی دانشمندی سے صورت حال پر قابو پا لیا تھا۔ نواز حسنی کا بیان یہ تھا کہ وہ صرف مجرموں کو پھانسنے کی خاطر پرندے اسمگل کرنے کا ڈرامہ کر رہے تھے۔ اس ڈرامے میں خان رحیمی بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ پولیس میں بھی مجرموں کے مخبر موجود تھے اس لئے وہ دونوں پوری رازداری سے کام کر رہے تھے اور مجرموں کو مکمل طور پر بے نقاب کرنا چاہتے تھے............ خان رحیمی کی حد تک تو یہ سب باتیں صحیح تھیں لیکن ہم جانتے تھے کہ نواز حسنی کے کیا ارادے تھے؟ ان کی حب الوطنی اور راست بازی میں شک نہیں تھا۔ لیکن بیٹی کی محبت انہیں اس حد تک لاچار کر چکی تھی کہ وہ جرم کا ہر طوق گلے میں ڈالنے پر تیار ہو گئے تھے۔ ان کی حالت قابل ترس ہی نہیں ناقابل فراموش بھی تھی۔............ ہمیں دوسری اطلاع یہ ملی کہ

نواز حسنی صاحب نے وہاب چنگیزی کے خلاف قتل' اغوا' اسمگلنگ اور دیگر سنگین جرائم میں کیس درج کرائے ہیں۔ جس کے بعد پولیس کی بھاری جمعیت نے بڑی حویلی میں کارروائی کر کے وہاب کے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام لوگوں کے خلاف بھی کارروائی ہو رہی ہے جنہوں نے بغیر لائسنس کے پرندے پکڑے ہیں اور ان کی غیر قانونی خرید و فروخت کی ہے۔ اس سلسلے میں کئی بڑے بڑے گروہوں پر بھی ہاتھ ڈالا جا رہا ہے............ ہمیں زیادہ دلچسپی وہاب چنگیزی کی گرفتاری سے تھی۔ مگر اس کے بارے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ایک روز رمضان کی زبانی پتہ چلا کہ اس نے جنوبی پنجاب کے کسی بڑے سیاستدان کے پاس پناہ لے رکھی ہے اور پولیس بھی وہاں ریڈ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔

دس پندرہ روز ان خبروں کا بہت زور رہا............ پھر ایکا ایکی سب کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ یوں لگا جیسے بیٹی کو واپس پانے کے بعد نواز حسنی صاحب کی سرگرمی بھی ماند پڑ گئی ہے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آئی یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو نواز حسنی صاحب ہمیں وہاب چنگیزی کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مژدہ سنا کر گئے تھے اور عہد کر کے گئے تھے کہ اب وہ شخص خلق خدا پر ظلم ڈھانے اور زمین پر دندنانے کے لئے آزاد نہیں رہے گا۔ اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ وہاب چنگیزی کی گردن پر دباؤ بڑھانے کی بجائے اس کی برائے نام بندشیں بھی ڈھیلی کی جا رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ درون خانہ کوئی "کایا پلٹ" تبدیلی آ چکی ہے۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی' موسم سرما جیسے جاتے جاتے پھر پلٹ آیا تھا' ٹھنڈی ہوا جسم میں کپکپی طاری کر رہی تھی۔ گھر کی صفائی کرنے کے بعد میں نے نہا کر کپڑے پہنے اور باورچی خانے میں آ گئی۔ سردی میں باورچی خانہ گوشہ عافیت محسوس ہوتا ہے۔ دوپہر کو رمضان سبزی دے گیا تھا۔ وہ میں نے دھو کاٹ کر ہنڈیا میں ڈالی اور چولہے میں آگ جلا کر بیٹھ گئی۔ سلیم دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ نواز صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ اشد ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتا تھا۔ چولہے کے سامنے بیٹھے بیٹھے میری آنکھوں میں ایک بار پھر بڑی حویلی کے خونی مناظر گھومنے لگے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اپنے انہی ناتواں ہاتھوں سے میں نے صرف ایک ہفتہ قبل دو خون

کئے ہیں اور تین افراد کو زخمی کیا ہے۔ وہاب کے کارندے کی کٹی ہوئی گردن اور شجاع کے رخسار پر ابھرنے والا گولی کا نیلگوں نشان بار بار میری آنکھوں کے سامنے آنے لگا۔ غصے کی زیادتی میں کتنا صحیح نشانہ لیا تھا میں نے حالانکہ اس سے صرف چند لمحے پہلے تالہ توڑنے کی کوشش میں مجھ سے چار گولیاں ضائع ہوئی تھیں۔ آہ.......... کاتب تقدیر نے میرے ان ہاتھوں کو کیسے کیسے کام سونپ دیئے تھے۔ یہ روٹیاں پکانے' سلائی کڑھائی کرنے اور قلم تھامنے والے ہاتھ آج قتل کر رہے تھے۔ میری آنکھیں شدت غم سے جلنے لگیں۔ زندگی میں میں نے صرف ایک غلطی کی تھی اور وہی چھوٹی سی غلطی مجھے حادثوں کے دوش پر اڑا کر کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ اگر اس منحوس سہ پہر کو میں فرخندہ کے ساتھ رکشے پر بیٹھ کر سلیم سے ملنے روانہ نہ ہوتی اور نتیجے میں میڈم نادرہ کی کینہ پرور نگاہ سے محفوظ رہتی تو آج زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ کتنی مختلف اور خوبصورت۔ شاید ایسا ہی یا اس سے تھوڑا سا بڑا ایک گھر ہوتا جس میں میں واقعی کسی کی بیوی ہوتی کوئی واقعی میرا شریک حیات ہوتا اور اس ابر آلود شام میں اور اس باورچی خانے میں واقعی میں زندہ ہوتی..........

اچانک ایک دستک نے میرے خیال کا تانا بانا توڑ دیا۔ میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں پہنچی "کون؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ دوسری طرف سے رئیس احمد کی آواز آئی "مس شاہدہ' کوئی بابری صاحب سے ملنے آیا ہے۔"

"کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں ہوں جی' ڈر دے کیوں پئے ہو۔ بوہا تے کھولو۔" آواز اور لہجے نے مجھے سمجھا دیا کہ دوسری طرف دینو ہے۔ میں نے حیرت کے دھچکے سے سنبھل کر دروازہ کھولا۔ دینو کے سر پر ٹوپی تھی اور اس نے کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ اندر آ گیا تو رئیس احمد بولا "مجھے چوبرجی ایک کام ہے۔ ایک گھنٹے تک آتا ہوں۔ اتنی دیر میں آپ بات کر لیں۔ سر نے کہا ہے کہ دینو کو ساتھ ہی واپس لانا ہے۔" میں جانتی تھی کہ رئیس احمد کو کام وام کوئی نہیں صرف بہانہ بنا رہا ہے۔ دراصل وہ مجھ سے اور سلیم سے بہت کنی کتراتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ آمنا سامنا نہ ہی ہو تو اچھا ہے.......... وہ چلا گیا تو میں دینو کو لے کر اندر آ گئی۔ دستک کی آواز سے سلیم بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ دینو کو دیکھ کر میری طرح وہ

بھی حیران ہوا۔ میرے پوچھنے پر دینو نے بتایا کہ وہ خان رحیمی کی کوٹھی سے آ رہا ہے۔ اس اطلاع نے مجھے اور سلیم کو پریشان کر دیا۔ میں نے کہا۔

"کہیں کسی کو پیچھے تو نہیں لگا لائے!؟"

وہ اطمینان سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ بولا "نہ جی اتنا کملا نہیں ہوں میں اور نہ ہی خان صاحب اتنے بھولے بادشاہ ہیں۔ خان صاحب کو پتہ ہے کہ چنگیزیوں کے بندے ہماری تاڑ میں ہیں۔ انہوں نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ میں بڑے حساب کتاب سے آیا ہوں۔ آدھی رات کو نکلا تھا کوٹھی سے۔ پہلے اپنے پنڈ چلا گیا۔ ایک رات اور ادھے رہ کر شیخوپورے آیا۔ آج سارا دن شیخوپورے میں گزار کر اور چنگی طرح تسلی کرنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔"

سلیم نے پوچھا "لیکن یہ سارے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی' کیا مصیبت پڑ گئی تھی تمہیں؟"

دینو بولا "مصیبت مجھے نہیں جی' شاہ دین ٹوانہ صاحب کو پڑی ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خانہ رحیمی صاحب کو بھی پڑ گئی ہے.......... وہ عیش عشرت بی بی کہیں غائب ہو گئی ہے جی۔ شاہ دین صاحب اس کے وچھوڑے میں ادھے پاگل ہو گئے ہیں اور ہمیں پورا پاگل کر دیا ہے۔"

"کہاں غائب ہو گئی ہے وہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ جواب میں دینو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتایا کہ پچھلے منگل کی صبح جب اس کے پاؤں کی مالش کرنے والا حکیم اس کے کمرے میں گیا تو وہ موجود نہیں تھی۔ اس کا مختلف سامان بھی بکھرا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بڑی افراتفری میں گئی ہے۔ عشرت کے ساتھ ساتھ کوٹھی کی وہ ملازمہ کلثوم عرف خانم بھی غائب تھی جو پچھلے دنوں ملازم رکھی گئی تھی۔ (یہی وہ عورت تھی جسے میں نے باتھ روم کی کھڑکی سے عشرت کو دھمکیاں دیتے سنا تھا) اتفاقاً جس روز عشرت غائب ہوئی اس روز دوپہر کے وقت شاہ دین ٹوانہ اسے واپس لینے پہنچ گیا۔ اس کی گمشدگی کا جان کر وہ از حد پریشان ہوا۔ تب سے عشرت کی تلاش مسلسل جاری ہے لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا' دینو نے بتایا کہ وہ بھی عشرت کے سلسلے میں ہی یہاں آیا ہے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر خان رحیمی نے خیال کیا کہ کہیں وہ لاہور ہمارے

پاس ہی نہ جا پہنچی ہو.........

عشرت کی گمشدگی نے مجھے فکر مند کر دیا۔ میں عشرت کے بارے خان رحیمی' سلیم اور شاہ دین ٹوانہ سے کہیں زیادہ جانتی تھی اور میرا اس سے تعلق بھی قریبی تھا۔ وہ میری بڑی بھابی کی سگی بہن تھی اور کچھ بدقماش لوگوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ماضی پر تاریکی کا دبیز پردہ تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ دونوں بہنیں کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے حقیقی والدین کون ہیں......... عشرت کے بارے اطلاع سن کر پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ ہو نہ ہو وہ پھر اسی گناہوں کے بازار کی زینت بن گئی ہے جس سے وہ آئی تھی۔ اور اسے وہاں لے جانے والے کلثوم عرف خانم اور سالار وغیرہ ہی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ وہ دوبارہ اس دلدل میں جانے سے کس قدر خوف کھاتی تھی اور کیسے رو رو کر دعائیں کرتی تھی کہ اسے اس دلدل سے باہر ہی موت آجائے۔ سلیم کے ساتھ اسے عجب طرح کی وابستگی پیدا ہو چکی تھی اور اس کے قرب و جوار میں رہنا بھی وہ اپنے لئے انعام سمجھتی تھی۔

ڈیو کو کھانا وانا کھلا کر ہم اس سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ رئیس احمد اسے واپس لے جانے پہنچ گیا۔ حسب معمول اس نے باہر ہی سے دستک دے کر ڈیو کو بلانا شروع کر دیا۔ سلیم کئی دنوں سے رئیس کی پردہ نشینی پر جھلایا ہوا تھا۔ غصے سے بولا "اندر آجاؤ' یہاں تمہیں کوئی منہ میں نہیں ڈال لے گا۔" رئیس احمد پھر بھی نہیں آیا تو سلیم گیا اور اسے کھینچ کر اندر لے آیا۔ ہمارے درمیان کرسی پر پٹختے ہوئے بولا "جتنا شرمانا ہے یہاں بیٹھ کر شرما لو۔ ویسے حیرت ہے تمہاری شرم پر......... جب آنا چاہئے تب آتی نہیں اور جب ضرورت نہیں ہوتی تب سر پر سوار رہتی ہے۔ اور میرے خیال میں تو تمہیں شرمانے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ تم نے ایسا کون سا شرمناک کام کیا ہے۔ سفارشی ٹٹو اور رشوت خور تو اور بھی بے شمار ہیں۔ اپنے کسی راست باز افسر کے ہاتھوں ان کی چھترول بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو زیادہ دل سے نہیں لگانا چاہئے۔ پنجابی کی مثال ہے "دو چپیاں وسرگیاں" یعنی دو چانٹے پڑ گئے اور بھول گئے۔ عزت کا کیا ہے یہ تو آنی جانی شے ہے۔ بس کارخانہ سلامت رہنا چاہئے۔ ان لوگوں کو بھلا کیا معلوم کہ ایک کلرک بیچارے کو قالینوں کا کارخانہ لگانے میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ شاباش ہے تمہاری زندگی پر۔"

رئیس احمد بری طرح خجل ہو رہا تھا۔ سلیم کی تیز تیکھی باتوں نے اس کا رنگ پیلا کر دیا تھا۔ ہکلا کر بولا "یار بابری پہلوان' دراصل......... میں نے........."

"پھر وہی شرمندگی" سلیم نے زہر خند سے اس کی بات کاٹی "رئیس صاحب مجھے تو آپ کی شرم سے شرم آرہی ہے۔ آخر ایسا کیا برا کر لیا ہے آپ نے۔ اگر شاہدہ کو بنا سنوار کر آپ نے حسنی صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو اس میں کون سی قیامت آگئی۔ یہ کوئی آپ کی بہن تھوڑی تھی۔ اور وقت پڑنے پر تو آپ جیسے لوگ بہنوں کو بھی......... خیر چھوڑیں۔ یہ تو معمولی باتیں تھیں۔ مجھے صرف ایک بات پر دکھ ہے کہ آپ نے اس رات ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ اگر آپ نے ہٹ دھرمی چھوڑ کر ہمیں بتا دیا ہوتا کہ حسنی صاحب ائر پورٹ روانہ ہو چکے ہیں تو کئی مشکلات کم ہو سکتی تھیں۔ یقین کریں مجھے بڑا غصہ آیا تھا۔ جی چاہا تھا کھوپڑا شریف کھول دوں آپ کا........."

سلیم دیر تک رئیس کو ایسے ہی "باتوں کے جوتے" رسید کرتا رہا۔ رئیس کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ خجالت سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ وہ ابھی غصے میں آکر پھٹ پڑے گا کبھی لگتا کہ یونہی شرماتا چلا جائے گا۔ ڈیو رئیس کی اس حالت سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چہرہ تو مسکین بنا رکھا تھا لیکن دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ کوٹھی میں قیام کے دوران رئیس احمد نے دستی نلکا چلوا چلوا کر اس کی جو درگت بنائی تھی اس کے بدلے آج اس کا دل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں رئیس احمد روہانسا ہو گیا۔ لجاجت سے کہنے لگا۔

"بابری پہلوان' بس اب جانے بھی دو۔ حسنی صاحب پہلے ہی مجھ سے بہت خفا ہیں۔ میں آپ سے سفارش کرانا چاہتا تھا لیکن آپ تو میرا رہا سہا حوصلہ بھی توڑ رہے ہیں۔ اگر ان باتوں میں سے آپ نے کوئی ایک بات بھی ان کے سامنے کہہ دی تو یقین رکھیں وہ مجھے معطل کرا دیں گے۔"

سلیم نے کہا "معطل ہونے سے تمہیں کیا فرق پڑ جائے گا۔ بلکہ ایک طرح سے تمہارے حق میں بہتر ہی ہو گا۔"

رئیس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "بہن کچھ تم ہی سمجھاؤ اسے' میں بال بچے دار آدمی ہوں۔"

میں نے سلیم سے کہا کہ وہ اب اس موضوع کو چھوڑ دے۔ کافی کہہ سن لیا ہے۔ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اس دوران باورچی خانے سے سالن جلنے کی ہلکی سی بو آئی میں سالن دیکھنے کے بعد واپس آئی تو رئیس اور دینو جانے کے لئے تیار تھے۔

دینو کے جانے کے بعد میں دیر تک برآمدے میں ٹہلتی رہی اور عشرت کے بارے سوچتی رہی۔ اسے کیا واقعہ پیش آسکتا تھا.........؟ بادل اب کافی گہرے ہو گئے تھے۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بوندیں پڑنے لگتی تھیں۔ سلیم ساتھ والے کمرے میں ریڈیو لگائے بیٹھا تھا۔ اسی طرح ریڈیو سنتے سنتے وہ سو جاتا تھا۔ رات کسی وقت میری آنکھ کھلتی تھی تو کھڑکھڑ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ روزانہ مجھے اس کے کمرے میں جا کر ریڈیو بند کرنا پڑتا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا کہ اگر وہ سو گیا ہے تو ابھی ریڈیو آف کر دوں تاکہ رات کو سردی میں لحاف سے نہ نکلنا پڑے لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ سوچ کے ٹیڑھے میڑھے رستوں پر بھاگتے بھاگتے نہ جانے کس وقت نیند نے بیداری کی انگلی پکڑی اور اسے ان دیکھی وادیوں میں لے گئی......... دوبارہ میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک کے سبب کھلی۔ دستک ایک بار پھر ہوئی تو میں نے لیٹے لیٹے پوچھا کون؟ جواب میں سلیم کی آواز سنائی دی۔ "ثناء! میں ہوں دروازہ کھولو" میں نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹہ سر پر لیا اور بستر سے اتر آئی۔ کمرے میں بلب بدستور روشن تھا۔ یہ بلب ساری رات روشن رہتا تھا۔ میں اندر سے کنڈی چڑھانا بھی نہیں بھولتی تھی۔ مجھے سلیم پر تو اعتماد تھا لیکن ان حالات پر اعتماد نہیں تھا جن سے وہ اور میں گزر رہے تھے۔ وہ شب ایک تلخ یاد کا خار بن کر میرے حلق میں چبھی ہوئی تھی جب سلیم نشے میں دھت میرے کمرے میں چلا آیا تھا اور جب میں نے اسے عشرت کی طرف جانے سے روکا تھا۔ تو وہ دیوانے شخص کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا تھا......... یہی وجہ تھی کہ سلیم کی آواز سن کر بھی میں نے فوراً دروازہ نہیں کھولا۔

"کیا بات ہے سلیم........." میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ آواز سے اندازا ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک سویا نہیں تھا۔

"سلیم! صبح کر لینا" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ اس وقت کیا ہے۔ میں کھا جاؤں گا تمہیں؟" وہ بگڑ کر بولا۔ میں نے غور کیا لیکن اس کے لب و لہجے میں نشے کی جھلک نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں آئی کہ دروازہ کھول دوں۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے ارادہ بدل دیا۔ میری خاموشی طویل ہوئی تو اس نے ذرا شدت سے دروازے پر دستک دی اور بھڑک کر بولا "کیا ہوا ہے۔ جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟" میرا ہاتھ دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھا مگر میں نے مضبوط ارادے سے اسے پھر روک لیا۔

"ثناء!" اس نے پھنکار کر کہا "دروازہ کھولو" میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں' اور دوں بھی یا نہیں۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے بدلے بدلے سے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ثناء! میں تجھے کہتا ہوں دروازہ کھول......... ورنہ......... توڑ دوں گا میں" اس کا لہجہ مجھے خطرے کا احساس دلانے لگا۔ میں جانتی تھی کہ اس کا پارہ چڑھا ہے تو اب چڑھتا ہی جائے گا۔ میں دیوار سے سر ٹکا کر اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے زور زور سے دروازے پر مکے برسائے اور پھنکار کر بولا "ثناء! دروازہ کھول۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھول۔ میں کہہ رہا ہوں کھول دروازہ........." اس کی آواز دم بدم بلند ہوتی جا رہی تھی اور اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پڑوسیوں میں سے کوئی سن سکتا ہے۔ دروازے کی کنڈی کوئی ایسی مضبوط نہیں تھی اور سلیم کے سامنے تو اس کی کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ وہ با آسانی اسے توڑ کر اندر آسکتا تھا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں سے کنڈی کھلوانا چاہتا ہے۔ میں سخت کشمکش میں تھی۔ اس دوران وہ بے پناہ غصے سے دیواروں پر مکے برسانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ابھی کسی دیوار میں سوراخ ہو جائے گا۔ وہ مجھے صلواتیں سنا رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔ آخر چیخ کر بولا۔

"مرتی رہ یہیں۔ سڑتی رہ یہیں۔ روتی رہ اپنے پیدا کرنے والوں کو......... میں جا رہا ہوں......... اگر باقی زندگی میں کبھی تجھے اپنی صورت دکھاؤں تو اپنے باپ کا نہیں۔ ذلیل عورت......... کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو......... کون سے موتی لگے ہوئے ہیں تجھے۔ میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر......... کمینی' بدخصلت' دغاباز........."

اس نے مجھ پر گفتنی و ناگفتنی صلواتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر مجھے مختلف آہٹوں

سے اندازہ ہوا کہ وہ تند بگولے کی طرح اپنے کمرے میں چکرا رہا ہے اور اپنا مختصر سامان اکٹھا کر رہا ہے.......... آخر اس کے بھاری اور مشتعل قدموں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ مجھے اس اجنبی چار دیواری میں تنہا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ خطرات کے نرغے میں اور مصائب کی یلغار میں اور اسے اس بے حسی تک پہنچانے والی میں ہی تھی۔ میں ہی تو تھی جس نے اس کے پندھار کو بار بار توڑا تھا اور اس کی عزت نفس کو ان گنت چرکے لگائے تھے۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "ثناء اسے روک لو۔ اس آخری سہارے کو خود سے جدا نہ کرو۔ ان لمحوں کو گرفت میں لے لو جو تمہیں ساری زندگی کا پچھتاوا دے سکتے ہیں۔ اتنی کٹھور اتنی سنگدل نہ بنو" "میرے کانپتے ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھے۔ کنڈی گرا کر میں نے دروازہ کھولا سلیم تیز قدموں سے بیرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے پکارنا چاہا لیکن آواز حلق میں کہیں اٹک کر رہ گئی۔ صدیاں گزر گئیں.......... لیکن مشرقی عورت کی یہ آواز.......... سینے سے ہونٹوں تک کا فاصلہ طے نہیں کر سکی اور شاید کبھی نہ کر سکے۔ میں کمرے کی دہلیز پر گنگ کھڑی رہی اور وہ بیرونی دروازے کی دہلیز پار کر کے تاریک گلی میں گم ہو گیا۔ فرحان کی موت کے بعد میری آنکھیں بنجر ہو چکی تھیں۔ اگر میری آنکھوں میں آنسو ہوتے تو شاید میں اس رات اتنا روتی کہ اس ویران چار دیواری کو اشکوں سے دھو ڈالتی۔ میرا سینہ پھٹنے لگا اور آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔ نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج ایک بار پھر فرحان کی جدائی جیسا صدمہ مجھ پر گزرا ہے۔ میں رات بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہی۔ اور تاریک مکان کے اندر چکراتی رہی اگر خدا پر میرا ایمان نہ ہوتا تو شاید وہ رات میری خودکشی کی رات ہوتی۔ رات آخری پہر میں نے جلتی ہوئی آنکھوں پر دیر تک ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور نڈھال سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ ذرا آنکھ لگی تو ڈراؤنے خوابوں نے میرا ہانکا شروع کر دیا۔ درندوں اور عفریتوں سے بھرے ہوئے ایک کالے جنگل میں میں تنہا تھی۔ تیز نوکیلے پنجے' خونی جبڑے اور روشن آنکھیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ میں کسی غمخوار کو ڈھونڈ رہی تھی.......... پکار رہی تھی۔ وہ کون تھا؟ شاید میرے ابو تھے جنہوں نے مجھے نہر سے نکال کر سینے سے چمٹا لیا تھا۔ یا فرحان تھا جس کی چمکیلی آنکھیں مجھ سے محفوظ مستقبل کا وعدہ کرتی تھیں۔ یا سلیم تھا جو میری خاطر پوری دنیا سے ٹکرا

جانے کا عزم رکھتا تھا۔ میں اس شخص کو پکارتی رہی اور اس جنگل کے خطرناک دلدلی راستوں پر بھٹکتی رہی۔ ہولناک آوازوں نے میرا تعاقب جاری رکھا۔ نوکیلے پنجے میرے جسم پر سرسراتے رہے۔ آخر میں نے ایک صدیوں پرانے درخت کی شاخ سے ایک لاش جھولتے دیکھی۔ لاش کا چہرا دوسری جانب تھا مگر اس کا لباس دیکھ کر میرا دل رونے لگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لاش میرے کسی قریبی عزیز کی ہے۔ کوئی بہت قریبی عزیز۔ میں نے چیخیں ماریں اور خود کو یقین دلایا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ لاش کا چہرہ دیکھنے سے پہلے مجھے بیدار ہو جانا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چہرہ دیکھ کر میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔ میرے دل نے کہا۔ یہ تاریک جنگل دراصل نیند ہے۔ میں اس جنگل سے نکل جاؤں۔ میں بیدار ہونے کی کوشش کرنے لگی مگر کالے جنگل کی بلاؤں اور عفریتوں نے مجھے دبوچ لیا۔ میں خود کو چھڑانے کے لئے مچلنے لگی' تڑپنے لگی.......... ایکا ایکی ایک آہ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ سخت سردی میں جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میں پھٹی ہوئی نظروں سے چھت کو گھورنے لگی اور سوچنے لگی کہ خواب میں نظر آنے والی لاش کس کی تھی؟ دل ہولنے لگا تو میں نے خود کو تسلی دی' خوابوں کی تعبیر ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔ دیکھا کچھ اور جاتا ہے اور پایا کچھ اور جاتا ہے.......... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب تقدیر خراب ہو تو صرف اچھے خوابوں کی تعبیریں الٹتی ہیں.......... اور میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ علی الصبح ہاکر نے تازہ اخبار چار دیواری کے اوپر نیم پختہ صحن میں پھینکا آواز سن کر میں اخبار پکڑنے گئی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی کی ایک اور منحوس خبر سے آگاہ ہونے جا رہی ہوں۔

اخبار لے کر میں اندر آ گئی۔ پہلے ہیڈ لائن پر نظر دوڑائی پھر دوسری خبریں دیکھنے لگی۔ نچلے حصے میں ایک تین کالمی سرخی پر نگاہ پڑی اور جم کر رہ گئی۔ سرخی کے نیچے ایک تصویر تھی اس تصویر کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ زمین آسمان گھوم رہے ہیں اور میں زمین سے اکھڑ کر کربناک فضاؤں میں بلند ہوتی جا رہی ہوں۔ یہ تصویر میرے چھوٹے بھائی تنویر اور بھابی صبیحہ کی تھی۔ یہ ان کی شادی کی تصویر تھی جس میں بھابی کرسی پر بیٹھی تھی اور بھائی ہاتھ پشت پر باندھے ان کے پاس کھڑے تھے۔ خبر کی سرخی تھی قتل کی وحشیانہ واردات دو بچوں سمیت پورے خاندان کو ذبح کر ڈالا۔ نیچے لکھا تھا "گزشتہ شب جواں

سال الیکٹریکل انجینئر تنویر محمود کو ان کے اہل خانہ سمیت سوتے میں قتل کر دیا گیا۔ قتل کی یہ بہیمانہ واردات آج رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ نامعلوم قاتل دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ تنویر محمود کے بیڈ روم تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے ایک ملازم کے سر پر بندوق سے ضربیں لگائیں اور اسے بے ہوش کر دیا۔ بعد ازاں وہ ایک جالی کاٹ کر کمرے میں گھس گئے.........."

یہاں تک پڑھتے پڑھتے اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھوں کے سامنے رنگین دائرے سے ناچے اور مجھے لگا کہ میں سر تھام کر کرسی سے گر رہی ہوں..........

دوبارہ حواس بحال ہوئے تو کوئی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔ ایک دوسرے ہمدرد نے میرے سر کو عقب سے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ ہمارے پڑوسی تھے۔ میاں بیوی نے مجھے برآمدے میں گرے دیکھ لیا تھا۔ اور دیوار سے سیڑھی لگا کر پاس آ گئے تھے۔ پڑوسن نے مجھے ہوش میں آتے دیکھا تو ہکلا کر بولی۔

"نسرین.......... نسرین.......... کیا ہوا تھا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟"

اس کا اشارہ سلیم کی طرف تھا۔ میری نگاہیں قریب گرے ہوئے اخبار پر پڑیں۔ پلک جھپکتے میں سب کچھ یاد آ گیا۔ اپنے چہیتے بھائی کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوما اور میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ پڑوسن خوفزدہ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میری دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں ایک بار پھر اخبار پر مرکوز ہو گئیں۔ جہاں تک میں نے پڑھا تھا وہاں سے آگے پڑھنے لگی۔

لکھا تھا کہ قاتلوں نے پہلے میاں بیوی کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد دونوں بچوں کو بھی ذبح کر دیا۔ تنویر محمود مسز تنویر محمود اور بچی ثمعین موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ جبکہ چار سالہ ٹیپو کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ قاتل جب فرار ہو رہے تھے۔ ساتھ والی کوٹھی کے مسلح چوکیدار نے انہیں دیکھ لیا۔ بڑی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے انہیں للکارا مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چوکیدار کا کہنا ہے مجرموں میں سے دو افراد نے چہرے کو رنگ دار پگڑی سے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ سب کے سب دیہاتی نظر آتے تھے۔ چوکیدار کے اس بیان کے بعد بعض لوگ اس گھناؤنی واردات کی کڑیاں جرنلسٹ فرخندہ اور اس کے منگیتر کے قتل سے ملا رہے ہیں۔ یاد رہے کہ اس واردات میں بھی دیہاتی لباس والے افراد نے حصہ لیا تھا۔"

خبر مکمل کرنے کے بعد میری وحشت زدہ نگاہیں ایک بار پھر بھائی اور بھابی کی مسکراتی تصویر پر جم گئیں۔ کیا یہ دونوں چہرے اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ "یہ جھوٹ ہے.......... یہ جھوٹ ہے" میں نے ہیجانی کیفیت میں چلاتے ہوئے اخبار کے پرزے کر ڈالے اور ایک بار پھر نڈھال ہو کر گر گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ بس دھندلے دھندلے مناظر لوح ذہن پر محفوظ ہیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں میرے گرد جمع تھیں' وہ مجھ سے حقیقت حال پوچھنا چاہتی تھیں۔ میں صرف ایک ہی جواب دے رہی تھی۔ "چنگیزیوں نے میرے بھائی کو مار دیا ہے۔ میرے بھائی کے سارے گھر کو قتل کر دیا ہے۔ کوئی مجھے میرے گھر تک پہنچا دو۔ کوئی مجھے میرے بھائی تک پہنچا دو۔"

کسی عورت نے ایک چادر میرے ننگے سر پر ڈال دی اور کسی دوسری نے مجھے جوتا پہنا دیا۔ پھر ایک شخص نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھا۔ میں نے اسے موہنی روڈ کا ایڈریس دیا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص مجھے رکشے میں موہنی روڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں خشک آنکھوں سے رو رہی تھی اور اپنا سر بار بار گھٹنوں پر مارتی تھی۔ شہر کی بھری پری سڑکوں سے گزرتا ہوا رکشہ موہنی روڈ پہنچا اور میرے گھر کے سامنے جا رکا۔ گھر کے دروازے پر اور گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ پریشان چہرے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کئی افراد انہیں کھینچتے ہوئے دروازے سے باہر لا رہے تھے۔ وہ بار بار گھوم کر اندر کی طرف جانا چاہتے تھے اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر کے اندر سے آہ و بکا کی فلک شگاف آوازیں آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کب میں رکشے سے اتر کر گھر کے صحن میں پہنچ گئی۔ آہ.......... میری آنکھوں کی قسمت میں یہ منظر بھی دیکھنا لکھا تھا۔ سامنے ایک قطار میں بھائی' بھابی' ٹیپو اور ثمعین کے جسم رکھے تھے۔ چار بے گناہ زندگیاں جنہیں ایک "چھوٹے چوہدری" کے بدلے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ چاروں لاشیں ابھی ابھی اسپتال سے لائی گئی تھیں۔ تین سالہ ثمعین بھابی کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ جب کہ چار سالہ ٹیپو علیحدہ چارپائی پر تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ زندگی میں سوتے تھے آج بھی سوئے ہوئے تھے۔ مطمئن و پر سکون نیند لیکن آج اس نیند سے جگانے کے لئے کوئی صبح طلوع ہونے والی نہیں تھی۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ سفید پٹیاں ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر سروں پر باندھ دی گئی تھیں۔

بھائی اور ٹیپو کے نتھنوں میں روئی رکھی گئی تھی.......... اردگرد کا ہر منظر میری نگاہوں میں دھندلایا ہوا تھا۔ آہ و بکا کی آوازیں کہیں دور بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں بھائی کی لاش سے لپٹ گئی۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ پتہ نہیں۔ میں کتنی دیر روتی رہی' اور کیا کیا کہتی رہی۔ پھر میں بھابی کو جھنجھوڑنے لگی "اٹھ جا میری بھابی! ایک نظر میری طرف دیکھ لے ایک بار میرے ہاتھوں کو چھولے "لیکن بھابی کی ناراضگی ابدی ناراضگی میں بدل چکی تھی۔ میں نے دیکھا بھابی کی گردن پر خون آلود پٹیاں تھیں۔ وہ نازک گردن گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ پھر میں ثمعین کے رخساروں پر بوسے دینے لگی۔ میرا جی چاہا اس ننھی سی گڑیا کو اپنی سینے سے لگا کر اتنی زور سے بھینچوں کہ وہ میرے جسم میں سما جائے' پھر کوئی ہاتھ اسے کفن پہنا سکے اور نہ منوں مٹی کے نیچے دبا سکے۔

"ثمعین.......... ثمعین میری جان آنکھیں کھول۔ دیکھ تیری پھوپھو کتنی دور سے آئی ہے.......... کب سے تیری آواز کو ترس رہی ہے۔ ایک بار اپنی آواز سنا دے۔ صرف ایک بار۔"

وہ لمحے جگر پاش تھے.......... ان چار خونچکاں میتوں کے لئے میرے پاس رونا تھا۔ ہچکیاں تھیں لیکن آنسو نہیں تھے۔ ہر ہچکی کے ساتھ نفرت کا ایک گولا سا میرے حلق میں جا اٹکتا تھا۔ یہ نفرت اس قاتل کے لئے تھی جس نے اپنے بھائی کے بدلے میں میرے بھائی کے پورے گھرانے کو خاک و خون میں لوٹا دیا تھا۔ جب میں ٹیپو کے چھوٹے چھوٹے سرد ہاتھ چوم رہی تھی۔ ایک عورت نے گھسیٹ کر مجھے پیچھے ہٹا دیا' میں نے گھوم کر دیکھا یہ میری بڑی بھابی کی کوئی رشتے دار تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔ یہ نفرت بھری آنکھیں دیکھ کر میں ہوش میں آ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ اگر چند منٹ بھی یہاں رہی تو یہ لوگ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میں نے اس صحت مند عورت سے اپنا بازو چھڑایا اور عورتوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں گھر سے باہر تھی۔ باہر نکلنے کے لئے میں نے ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ استعمال کیا تھا۔ میرے معصوم بچپن کی بہت سی کہانیاں اس چور دروازے سے وابستہ تھیں۔ یہ چور دروازہ ہم بہن بھائیوں کا دوست تھا۔ کبھی ہمیں امی کی ڈانٹ سے بچاتا تھا' کبھی ابو کی

مار سے اور کبھی تفریح کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ ساون کی جھڑیوں میں جب ماں اور دادی کی نگاہیں ہم پر نگران ہوتی تھیں تو اسی دروازے سے نکل کر ہم گلیوں بازاروں میں "کالیاں اٹاں کالے روڑ" پکارا کرتے تھے۔ آج اس اجنبی گھر میں یہ "دوست دروازہ" ایک بار پھر دوستی کا حق نبھا رہا تھا۔ مجھے پولیس کی دسترس سے بچا کر یہاں سے نکال رہا تھا.......... میں بھاگ رہی تھی لیکن پولیس سے نہیں ان پابندیوں سے جو مجھے میرے دشمن سے دور کر سکتی تھیں اور میں اس دشمن سے دور ہونا نہیں چاہتی تھی۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں تھا نہ جانے کس گھڑی اور کس گلی میں زندگی کی شام ہونے والی تھی۔ "سانس سورج" ڈوبنے سے پہلے میں دنیا کی مغرور ترین گردن کو چودھری وہاب کے تن سے جدا کر دینا چاہتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے لوہے کا ایک حقیر ذرہ مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے میں چودھری وہاب کی طرف کھنچتی چلی جا رہی ہوں۔ وہ کہاں ہو گا؟ کس جگہ ہو گا' کتنے محافظوں میں ہو گا' مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ میرے آبائی گھر کے صحن میں چار لاشیں پڑی ہیں' میرے لباس میں ایک انتہائی تیز دھار آلہ ہے اور مجھے راوی کے پل سے جھنگ جانے والی بس پکڑنی ہے۔

مین روڈ پر پہنچ کر میں نے ایک خالی رکشے کو ہاتھ دیا اور پل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میرے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی نہیں اور کرایہ دینا پڑا تو کیا کروں گی۔ پل پر پہنچ کر رکشا رکا۔ میں نے رکشے والے سے کہا "بھائی میرے پاس پیسے نہیں' یہ میری کلائی کی گھڑی رکھ لو اور کچھ پیسے دے دو مجھے جھنگ جانا ہے" رکشے والے نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرا سینہ ابھی تک ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کوئی آفت کی ماری ہوں۔ کرایہ چھوڑ کر وہ آگے چل دیا۔ میں کلائی کی گھڑی ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ جب ایک تیز رفتار کار میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں دو آدمی سوار تھے۔ ایک نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا "بی بی! ہمیں چودھری شہاب نے بھیجا ہے پولیس تمہارے پیچھے آ رہی ہے جلدی سے بیٹھ جاؤ۔" میں نے غور سے بولنے والے کا چہرہ دیکھا۔ وہ چودھری شہاب کے ساتھیوں میں تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری داڑھی اس کی سب سے بڑی نشانی تھی۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہی پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شاہدرہ کی طرف روانہ ہو

گئی۔ (اس بات کا پتہ مجھے کئی دن بعد چلا کہ داڑھی والا چودھری شہاب سے ناطہ توڑ کر وہاب چنگیزی کے ہرکاروں میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اپنی زندگی کی بدترین غلطی کی تھی) ابھی ہم جی ٹی روڈ پر چند فرلانگ آگے گئے تھے کہ گاڑی میں کسی کیمیکل کی تیز بو محسوس ہوئی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ گاڑی میں ایک چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو پوری طرح سمجھ پاتی نشست کے پیچھے سے دو ہاتھ برآمد ہوئے اور انہوں نے ایک بدبودار رومال سے میرا منہ ڈھانپ دیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو رات تھی۔ آنکھ کھل کر بھی پوری طرح کھلی نہیں تھی۔ کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ محرابی کھڑکیوں پر رنگ دار پردے لہرا رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور چھت پر میلا سا فانوس۔ میں ایک آرام دہ مسہری پر لیٹی تھی۔ میرے سرہانے لکڑی کی تپائی پر ایک ٹرے میں پھل رکھا تھا۔ اچانک مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے گردن پھیر کر دیکھا۔ کچھ دور صوفے پر ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ وہ صورت سے ہندوستانی فلموں کا سیٹھ یا ٹھاکر دکھائی دیتا تھا۔ سامنے میز پر امپورٹڈ سگریٹ کی ڈبیا رکھی تھی اور اس نے منہ میں پان دبایا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا۔ پھر اس کا ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا اور کمرے میں نیم تیرگی چھا گئی۔ سیٹھ لڑکھڑاتا ہوا میری طرف بڑھا بعد ازاں جو کچھ ہوا اس کی توقع سیٹھ نما شخص نے ہرگز نہیں کی ہوگی۔ میں نے کسی دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود بھرپور مزاحمت کی۔ کمرے کی کئی اشیاء اٹھا کر میں نے اس کے سر پر توڑ دیں۔ وہ گھبرایا اور ہانپتا ہوا چیختا چلاتا باہر نکل گیا۔ اس کی روانگی کے چند لمحے بعد ایک موٹی بھدی منحوس صورت عورت اندر آئی۔ اس کے ساتھ ایک ٹھگنے قد کا مرد بھی تھا۔ ان دونوں نے مجھے بے دریغ لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میں نیم بے ہوش تو پہلے ہی تھی مکمل بے ہوش ہو کر گر گئی۔

نجانے کتنے گھنٹوں یا کتنے پہروں بعد دوبارہ آنکھ کھلی۔ میری پیشانی اور دائیں رخسار پر پٹیاں تھیں۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں اسی مسہری پر اسی کمرے میں لیٹی تھی لیکن اب دن کا وقت تھا۔ جالی دار کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں اب یہ بات ذہن پر زور ڈالے بغیر بھی سمجھ

سکتی تھی کہ اس وقت کیسے لوگوں کی دسترس میں ہوں۔ ایسی چار دیواری میں ہونا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ہاں.......... گناہ کی چار دیواری میں ہونا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ایسے حادثوں کے بعد شریف عورتیں مرجاتی ہیں۔ مگر میں زندہ تھی اور میرے پاس جواز بھی تھا۔ کسی کی کٹی ہوئی انگلیاں اور ٹوٹتی ہوئی سانسیں جواز تھیں۔ کسی امی جان کہنے والے کا خاموش دہن جواز تھا.......... کون مجھے مار سکتا تھا اور کون مرنے پر مجبور کر سکتا تھا.......... موٹی بھدی عورت جس کا نام باجو تھا اور مرد جسے وہ طفیلا کہتی تھی سات آٹھ روز میری چوٹوں کا علاج کرتے رہے۔ طیش میں انہوں نے مجھے بری طرح پیٹ ڈالا تھا لیکن اب فکرمند تھے کہ میرے چہرے پر کوئی نشان نہ پڑے۔ مرہم پٹی میں وہ ایک مہنگی آئن منٹ لگا رہے تھے جو زخم کا داغ نہیں رہنے دیتی۔ دو ہفتے میں میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اس دوران میں اپنے اور اس چار دیواری کے بارے رات دن سوچتی رہی۔ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ نما گھر میں بند تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فلیٹ کسی بلڈنگ کی چوتھی یا پانچویں منزل پر واقع تھا۔ فلیٹ کے کھڑکیاں دروازے لوہے کے تھے اور ایک نہ ایک مسلح شخص چوبیس گھنٹے دروازے پر موجود رہتا تھا۔ باجو اور طفیلا بھی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ چکمہ دے کر یا جدوجہد کر کے یہاں سے نکل جانا ممکن نہیں تھا' مجھے کھانے کے ساتھ کوئی ایسی دوا دی جا رہی تھی کہ جاگنے کے بعد بھی ہر وقت نشہ سا چھایا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے نشے کے اس جال کو توڑنے کی بہت کوشش کی۔ غسل خانے میں جا کر دیر تک سر پر سرد پانی ڈالا۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے ایک کھڑکی کھول کر جالی سے منہ لگایا اور اور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اس چیخ و پکار کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ باجو اور طفیلا نے ہتھوڑی کی ضربوں سے کھڑکیوں کی چٹخنیاں اس طرح ٹیڑھی کر دیں کہ میں کوشش کے باوجود انہیں نہ کھول سکوں۔

دو روز بعد کا واقعہ ہے میں نشہ آور دوا کی غنودگی میں پڑی ہوئی تھی۔ باجو اور طفیلا اندر آئے۔ آج طفیلے کے کندھے سے بھی ایک پستول جھول رہا تھا۔ شاید یہ مجھے ڈرانے کے لئے تھا۔ انہوں نے مجھے نرم ملائم لہجے میں سمجھانا شروع کیا کہ جہاں میں آ چکی ہوں وہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ لٰہذا میرے لئے بہتر ہے کہ خود کو حالات کے مطابق ڈھال لوں۔ مختصر یہ کہ اپنی غلیظ زبانوں سے وہ مجھے گناہ کی ترغیب دینے لگے اور سمجھانے

لگے کہ ان کے کہنے پر چل کر نہ صرف میں زندہ رہوں گی بلکہ آرام کے دن بھی گزاروں گی۔ دوسری صورت میں نہ صرف میری ہڈی پسلی بلکہ زندگی کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ مجھے ایک طویل لیکچر پلانے کے بعد وہ دونوں چلے گئے اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے ایک شرمیلے سے نوجوان لڑکے کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ نہ جانے میرے اندر اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ میں اپنے ڈولتے ہوئے جسم کو سنبھال کر تیزی سے اٹھی اور لڑکے پر جھپٹ پڑی۔ میرے ایک ہی دھکے سے وہ الٹ کر صوفے پر جاگرا۔ اس کی پیشانی کسی چیز سے ٹکرائی اور خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے اسے تھپڑوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ اس بلائے ناگہانی کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کی بوشرٹ پھٹ گئی اور کوٹ میں لگا ہوا گلاب کا پھول پتی پتی ہوکر بکھر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ چیخنے چلانے لگتا' دروازہ دھماکے سے کھلا اور باجو اور طفیلا اور ایک دوسرا شخص اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے تھرتھر کانپتے لڑکے کو بمشکل میرے ہاتھوں سے چھڑایا اور سہارا دے کر باہر لے گئے۔ باجو اور طفیلا ایک بار پھر مجھ پر پل پڑے۔ باجو نے میری گردن دبوچ کر مجھے قالین پر گرا دیا اور طفیلا میرا بازو مروڑ مروڑ کر مجھے گالیاں دینے لگا۔ میرا خیال تھا کہ آج تو وہ میرا قصہ تمام ہی کر دیں گے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چند تھپڑ مارنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے۔ طفیلا پھنکار کر باجو سے بولا۔

"تم بھی کسی کی بات نہیں مانتی ہو۔ تجھے کہہ رہا تھا کہ پہلے اس کا دماغ اچھی طرح ٹھیک کرلے۔"

باجو نے ہانپتے ہوئے کہا "اور کیسے ٹھیک کروں دماغ' تین گولیاں کھلائی ہیں کچھ اثر ہی نہیں ہوتا اس پر۔"

دونوں ایک دوسرے پر برستے ہوئے باہر چلے گئے۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھ گئی تو میں قالین سے اٹھی اور دروازے سے کان لگا کر باہر کی باتیں سننے لگی۔ وہ لوگ میری ہٹ دھرمی سے جھنجلائے ہوئے تھے اور مجھے سیدھا کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ اس لڑکے کی بزدلی پر بھی انہیں حیرت تھی جو ابھی مجھ سے پٹ کر گیا تھا۔ میں ڈگمگاتی ہوئی دوبارہ مسہری پر ڈھیر ہوگئی۔ آج واقعی مدہوشی روزانہ سے زیادہ تھی۔ مجھے خدشہ محسوس

ہوا کہ اگر پھر کوئی بھیڑیا میرے زندہ جسم سے گوشت کھانے آیا تو شاید میں معقول مزاحمت بھی نہ کر سکوں۔ مجھے وہ کتاب یاد آئی جو میں نے کالج کی لائبریری میں لے کر پڑھی تھی اور جس میں قحط بنگال کا حال تفصیل سے درج تھا۔ مصنف نے ایک جگہ لکھا تھا "دور دراز بستیوں میں قحط کی اتنی شدت ہے کہ لوگ اپنے جھونپڑوں سے باہر پڑے پڑے دم توڑ جاتے ہیں۔ آوارہ کتے اور گیدڑ آتے ہیں اور مردہ نیم مردہ لوگوں کے جسموں سے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو دیکھا جو جھونپڑے سے باہر بے حرکت پڑا راشن کا انتظار کر رہا تھا اور گیدڑ اس کی پنڈلی سے گوشت کھا رہے تھے۔" آج میں بھی خود کو اسی قحط زدہ بنگالی کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ میں اب تک خود پر جھپٹنے والے کتوں کو پیچھے ہٹاتی رہی تھی لیکن اب مجھ میں یہ سکت بھی ختم ہو رہی تھی۔ میں اپنی بھوک سے بہت کم کھانا کھا کر باقی غسل خانے میں بہا دیتی تھی پھر بھی خواب آور دوا کسی بلا کی طرح میرے حواس کو اپنے مضبوط پنجوں میں دبوچے رہتی تھی۔ غنودگی کی شدید لہر کو محسوس کر کے میں اٹھی اور اپنا سر غسل خانے کی ٹونٹی کے نیچے رکھ دیا۔ آنکھوں میں چھائی ہوئی دھند کچھ کم ہوئی تو واپس آئی اور سردی کے باوجود پنکھا چلا کر بیٹھ گئی۔ میرے دل کی گہرائی سے دعا نکل رہی تھی "اے مالک! تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ دل کی گہرائیاں تجھ پر آشکار ہیں۔ مجھے توفیق دے کہ میں اپنی آخری سانس تک مزاحمت جاری رکھ سکوں.........." اکڑوں بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر مجھے جھپکی سی آگئی۔ آنکھ کھلی تو دروازے کی دوسری طرف سے تیز تیز باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے پاس جا کر سنا طفیلا کہہ رہا تھا۔

"ذرا دھیان سے استاد......... ہاتھ پاؤں بچا کے"

جواب میں ایک بھاری بھرکم کرخت اور کھردری آواز سنائی دی "اوئے کوئی چاقو چھری تو نہیں ہے اس کے پاس؟"

"نہیں استاد" طفیلے نے کہا۔

"تو پھر مرا کیوں جا رہا ہے......... بڑے پاپڑ بیلے ہیں تیرے استاد سائیں نے' ذرا کھول تو دروازہ۔"

میں ڈگمگاتی ہوئی جا کر پھر بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ تالہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد

پٹ وا ہوئے اور کوئی وزنی قدموں سے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر کے وہ میری طرف آیا۔

"اوہ چھوری" کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ سخت حیرت کے عالم میں میں نے جلدی سے گردن موڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے بخشو سولنگی کھڑا تھا.......... وہی شخص جس کے بارے میں مجھے سلیم نے بتایا تھا کہ وہ مفرور ڈاکو ہے اور جنوبی علاقے سے پرندوں کی کھیپ لے کر آیا ہے۔ بخشو سولنگی کو میں نے سب سے پہلے خان رحیمی کی کوٹھی میں فنکشن کی رات کو دیکھا تھا۔ بعد ازاں مرغی خانے میں اس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی اور پھر سور کے شکار کے دوران عشرت کے معاملے پر اس سے سخت جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ عشرت کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے ریوالور نکال لیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس وقت سولنگی کو سامنے دیکھا تو میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ سولنگی کے لئے بھی میری موجودگی حیرت ناک تھی۔ وہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے انگلی میری طرف اٹھائی اور حیران لہجے میں بولا۔

"تم.......... تم یہاں؟"

میں مدہوش آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنی مونچھوں کو مروڑتا رہا پھر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر سندھی ٹوپی تھی۔ اس کے جسم پر بے پناہ بال تھے اور ایسی بو آ رہی تھی جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی گوشت خور جانور ہو۔ میں نے ہراساں نظروں سے اس کا کرخت چہرہ دیکھا۔ قدرت نے ہم دونوں کو کس جگہ اکٹھا کیا تھا۔ ایک وہ دن تھا جب میں نے بڑی دلیری سے اس پر ریوالور تان لیا تھا اور اسے مونچھ نیچی کر کے پیچھے ہٹنا پڑا تھا اور ایک آج کی رات تھی جب میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا اس کا رویہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر سگریٹ سلگایا اور مٹھی میں دبا کر کش لینے لگا۔ "یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں بیگم سائیں؟" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ مجھ پر تو نیند طوفانی لہروں کی طرف یلغار کر رہی تھی۔ بار بار میرے سر کو جھٹکا لگتا اور مجھے پتہ چلتا کہ میں گرتے گرتے بچی ہوں۔ میری حالت دیکھ کر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اٹھ کر باہر گیا اور چند لمحے بعد واپس آ گیا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا

وہ چائے کا کہنے گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد طفیلا ایک ٹرے میں چائے کے برتن سجائے اندر داخل ہوا۔ طفیل برتن رکھ کر چلا گیا تو سولنگی نے ایک کپ میں چائے انڈیلی اور بغیر دودھ چینی ملائے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ خوب رنگ نکلی ہوئی کڑک چائے تھی۔ سولنگی کے کہنے پر میں گھونٹ گھونٹ پوری پیالی پی گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا خمار ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سولنگی نے اصرار کر کے مجھے نصف پیالی اور پلا دی۔ اس کی یہ ترکیب کارگر رہی۔ میرے حواس پر سے نیند کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر جب میں کمرے میں واپس آئی تو خود کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ یہ جان کر مجھے اطمینان ہو رہا تھا کہ سولنگی کا رویہ مجھ سے ہمدردانہ ہے۔ وہ میری بپتا سننے کے لئے بے چین نظر آتا تھا لیکن اس سے پہلے میں جاننا چاہتی تھی کہ اس کمرے سے باہر صورت حال کیا ہے اور سولنگی کس حیثیت سے اور کیونکر یہاں پہنچا ہے۔ سب سے زیادہ تجسس مجھے نواز حسنی اور خان رحیمی کے بارے میں تھا۔ وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟ میرے اس سوال کے جواب میں کہ سولنگی یہاں کیسے پہنچا ہے' سولنگی نے صاف سیدھے لہجے میں بتایا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔

میرے ذہن میں خطرے کی ان گنت گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا "اس وقت میں کہاں ہوں؟"

سولنگی نے میری آنکھوں کا خوف پڑھ کر سر جھکا لیا۔ دھیمی آواز میں بولا "بیگم سائیں! تم ٹھیک سمجھ رہی ہو.......... تم اس وقت بازار حسن کی ایک عمارت میں ہو۔"

آسمان جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے سر پر گرنے لگا۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے.......... آہ' یہ دن دیکھنا بھی میری قسمت میں لکھا تھا۔ سفاک درندوں نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہاب چنگیزی مجھے اپنے رائل بنگال ٹائیگر کا لقمہ بنا دیتا۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرتا؟ وہ تو اس وقت کی سزا تھی جب میں نے ابھی چھوٹے چودھری کو گولی کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اب چنگیزیوں کے نزدیک "انصاف" کے تقاضے کچھ اور تھے۔ غالباً وہ مجھے ذلیل و رسوا کر کے اور گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر مارنا چاہتے تھے۔ میرا دل رونے لگا اور جسم ایک بار پھر ہچکیوں کی زد میں آ گیا۔ گھٹنوں میں سر دے کر میں دیر تک ہچکیاں لیتی رہی۔ بار بار مجھے گمان ہوا کہ میری

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح یہ ایک گمان ہی تھا۔ کافی دیر بعد جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سولنگی سے پوچھا کہ نواز حسنی اور خان رحیمی اب کیا کر رہے ہیں؟ میرے اس سوال پر سولنگی خاموش سا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی صاف پڑھی جاتی تھی۔ سگریٹ کا کش لے کر دھیمے لہجے میں بولا "ابھی تک تو کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ نہ ہی خان صاحب نے مجھے کچھ بتایا ہے۔"

میں نے بھڑک کر کہا "کیوں نہیں ہوئی کوئی نئی بات' اب کسی کو اور کیا ثبوت چاہئے وہاب کے کرتوتوں کا' اب اور کیا رکاوٹ رہ گئی ہے اسے پھانسی دینے میں' اسے کیوں نہیں گرفتار کرتے' کیوں سرعام چوراہے پر نہیں لٹکاتے؟"

سولنگی نے میرے جذباتی پن کو نظرانداز کر کے کہا "بیگم سائیں! میں توڑ پھوڑ مار دھاڑ کرنے والا بندہ ہوں۔ مجھے نہیں پتہ یہ پڑھے لکھے سیاسی لوگ کیا داؤ پیچ لڑاتے ہیں۔ مجھے تو جتنا معلوم ہے آپ کو بتا دیا ہے۔ نہ وہاب چنگیزی گرفتار ہوا ہے اور نہ اسے لٹکایا گیا ہے۔"

"مگر کیوں........ کیوں........ اب کیا مجبوری ہے؟"

سولنگی مسکرایا "مجبوری تو ہم جیسے لوگوں کی ہوتی ہے' بڑے لوگوں کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ وہاں تو سودے بازی ہوتی ہے۔ جو پیسے دے سکتا ہے وہ ہر سودا اٹھا سکتا ہے........ بیگم سائیں! تمہارا خیال ہے کہ وہاب الیکشن ہار گیا ہے۔ اس کے جرموں کا ثبوت بھی مل گیا ہے' اس لئے اسے پکڑ لینا چاہئے' یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ الیکشن ہار کر بھی وہاب نے بازی جیت لی ہے۔ حلقے کے ووٹروں نے اسے تو ہرا دیا لیکن اس کے اثر و رسوخ کو نہیں ہرا سکے۔"

میں نے کہا "میں اس کے اثر و رسوخ کی نہیں اس کے جرم کی بات کر رہی ہوں۔"

سولنگی نے جواب دیا "اثر و رسوخ اور جرم کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ وہاب ہار گیا تھا لیکن اس کے کئی ہم خیال اور خیر خواہ جیتے تھے۔ ان میں سے ایک پیر عباس خاں بھی ہے۔ پیر عباس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تم اور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پیر عباس کی وجہ سے ہی انڈر سیکرٹری نواز حسنی پر دباؤ پڑا ہے اور وہ اپنا جوش و خروش

سمیٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا ہے۔ خان رحیمی کی ساری سرگرمی نواز حسنی کے ساتھ تھی۔ جب شاخ ہی نہ رہی تو گھونسلہ کیا رہتا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پچھلے ہفتے وہاب چنگیزی بڑی حویلی واپس آ گیا ہے اسے کسی طرح کا فکر فاقہ ہی نہیں۔ اس کے کارندے گواہوں کو قابو کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب گواہ ہی کٹہروں تک نہیں پہنچیں گے تو کیسوں میں کیا جان رہے گی۔ اللہ نے چاہا تو قربانی کے ایک دو بکروں پر دفعہ ۳۰۲ لگوا دی جائے گی یا چند ڈشکروں کے لئے آٹھ دس سال تک جیل میں راشن پانی کا انتظام کر دیا جائے گا" میری آنکھوں کے سامنے بھائی تنویر بھابی صبیحہ اور بچوں کی لاشیں گھومنے لگیں۔ فرخندہ اور عابد کے مردہ چہرے تصور میں آئے۔ مجھے لگا میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی یا میں چیختی ہوئی دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گی۔ ایک طرف ظلم کی انتہا تھی' دوسری طرف لاچاری کی انتہا........ میرے جسم کا رواں رواں نادیدہ آتش میں پھنک رہا تھا۔ میں دیر تک اندر ہی اندر آنسو بہاتی رہی۔ سولنگی سلگتے سگریٹ سے بجھے بجھے کش لے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سولنگی! یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں!"

وہ بولا "یہی سوچ رہا ہوں بیگم! سچ پوچھتی ہو تو اس وقت ہر طرف چنگیزیوں کا زور ہے۔ خان رحیمی اور نواز حسنی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ خان رحیمی بوڑھی جان ہے۔ وہ تمہاری حالت کا سن کر پریشان تو ضرور ہو گا لیکن کر کچھ نہیں سکے گا اور اگر کرنے کی کوشش کرے گا تو بھی کامیابی کی امید کم ہے۔ چنگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے' وہ پورے ضلع میں بھوکے کتوں کی طرح اس کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ خان رحیمی کی کوٹھی پر پولیس کی گارد نہ ہو تو شاید وہ ابھی اس پر ٹوٹ پڑیں۔ ایسے میں میں نہیں سمجھتا کہ مجھے خان رحیمی کو تمہارے بارے اطلاع دینی چاہئے........ ہاں میں نواز حسنی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ مدد کر سکے۔"

میں سولنگی کی باتیں سن سن کر حیران ہو رہی تھی۔ چند دنوں میں یہ کیسا انقلاب آیا تھا۔ چنگیزی کی بجائے نواز حسنی اور خان رحیمی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیسا داؤ مارا تھا اس ابلیسی گھرانے کے چنگیزیوں نے۔"

میں نے سولنگی سے کہا "کیا تم اپنے طور پر کوشش نہیں کر سکتے!"

اس نے اپنے بالوں بھرے سینے کو انگلیوں سے سہلایا اور بولا "کر سکتا ہوں اور ضرور کروں گا مگر اس میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔ مجھے یہاں کا ماحول اور کمرے کا اندر باہر دیکھنا ہو گا۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں۔ یہ فلیٹ پانچویں منزل پر ہے اور اس فلیٹ کے علاوہ یہاں کم از کم دس فلیٹ اور ہیں۔ ان سب فلیٹوں میں نچلے درجے کی ہی بازاری عورتیں رہتی ہیں۔ ان کے ایجنٹ اور نگران ہیں جو ہر آنے جانے والے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت تو تمہارے اس فلیٹ کے مسلح چوکیدار ہیں۔ لگتا ہے وہاب چنگیزی نے تمہاری حفاظت کا خاص انتظام کرا رکھا ہے۔ میں دو تین دفعہ پہلے بھی اس فلیٹ کے سامنے سے گزرا ہوں۔ مجھے ہمیشہ وہاں ایک یا دو مسلح افراد منڈلاتے نظر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تو تم کہنا چاہتے ہو کہ میں خود کو اس کمرے میں باجو اور طفیلے کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔"

"ہرگز نہیں۔" سولنگی نے جلدی سے کہا "میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ اگر میں اور تم یہاں سے زندہ سلامت نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا "اور اس دوران میں ان لعنتی دیواروں میں ذلت کا عذاب جھیلتی رہوں گی!"

"اس کا بھی ایک حل ہے" سولنگی نے کہا۔

"کیسا حل؟"

وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر بولا "......... خیر تم اس بات کو چھوڑو میں خود بات کر لیتا ہوں ان لوگوں سے' آج کے بعد اس کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں آئے گا۔"

کچھ دیر بعد مجھ پر پھر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ آج معدے میں دوا کچھ زیادہ ہی داخل ہو گئی تھی۔ میں بستر پر بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلی گئی......... آنکھ کھلی تو نگاہ سیدھی بخشو سولنگی پر پڑی۔ وہ بدستور کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کے سامنے ایش ٹرے میں راکھ اور سگریٹ کے ٹکڑوں کا انبار لگا تھا۔ کھڑکیوں میں نمودار ہونے والے اجالے سے اندازہ ہوتا تھا کہ صبح ہو رہی ہے۔ بخشو سولنگی نے مجھ سے تسلی

تشفی کی چند باتیں کی اور شام کو پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

وہ سارا دن میں نے حسب معمول نیند اور بیداری کے جھونکوں کے درمیان گزارا۔ ایک دو بار باجو اور طفیلے کے چہرے بھی نظر آئے۔ وہ کافی حد تک مطمئن نظر آتے تھے۔ شاید بخشو سولنگی نے کئی دنوں تک کے لئے ان کے خرچے پانی کا انتظام کر دیا تھا۔ کھڑکیوں پر شام اتری تو میں ایک کرسی پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ایک کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ پچھلے کئی دنوں سے یہ ایک شیشہ ہی باہر کی دنیا سے میرا واحد بصری رابطہ تھا۔ اس شیشے میں سے مجھے عمارت کے ایک پیلے شیڈ کا تین چار مربع فٹ ٹکڑا نظر آتا تھا' قریباً اتنا ہی آسمان اور ایک بجلی کے کھمبے کا بالائی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ بجلی کے کھمبے یا پیلے شیڈ کے اوپر کبھی کوئی پرندہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے اپنے لئے اضافی تفریح تصور کرتی تھی۔ میرے لئے اہم ترین دلچسپی نیلے آسمان کا وہ ٹکڑا تھا جو میں روزن قفس سے دیکھتی تھی۔ اس ٹکڑے پر مجھے سرمئی شام کا عکس نظر آتا تو دیر تک پتھر کی طرح ساکت کھڑی رہتی۔ آج بھی میں اسی شغل میں مصروف تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور بخشو سولنگی اندر آ گیا۔ اس نے بڑے بازاری قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ڈبی دار شلوار قمیض' پاؤں میں سرخی مائل جوتے اور گلے میں گلاب کے ہار۔ اس نے اندر آ کر دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر لوہے کی ایک پتری نکالی۔ میں نے غور کیا تو یہ لوہا کاٹنے کا بلیڈ تھا۔ بلیڈ کے علاوہ اس نے جیب سے ایک پیچ کس بھی نکال لیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

وہ بولا "بیگم جی رات جب تم سو رہی تھیں میں نے اچھی طرح اس فلیٹ کا سروے کیا تھا۔ میں نے نتیجہ نکالا ہے کہ اس سامنے والی تیسری کھڑکی کے سوا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کھڑکی کے نیچے ایک پیلے رنگ کا شیڈ ہے اس پر اتر کر پانچ چھ گز چل کر ایک دوسری چھت پر چھلانگ لگائی جا سکتی ہے۔ یہ چھت ایک ہوٹل کی ہے جس کی اوپری دو منزلیں خالی پڑی ہیں۔ ہمیں وہاں سے نکلنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا "مگر اس کھڑکی سے کیسے نکلیں گے؟"

وہ بولا "اسی لئے تو یہ سامان لایا ہوں۔ اس بلیڈ سے گرل کاٹیں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین راتیں لگ جائیں گی۔ اس کے بعد کوئی مشکل نہیں رہے گی۔"

.... طفیلے نے کھڑکی کی چٹخنیاں ٹیڑھی کر دی تھیں۔ مگر سولنگی نے انہیں سیدھا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے پیچ کس سے چٹخنی کے بالائی پیچ کھول کر کھڑکی کھولی جو دوسری طرف جاتی تھی۔ جالی کاٹنے کے لئے سولنگی کے پاس کوئی اوزار نہیں تھا۔ اس نے اپنے جیبی چاقو سے کام چلایا تھوڑی سی جالی کاٹنے کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ایک گھنٹے تک طفیلا کھانے پینے کے لوازمات کے ساتھ آتا جاتا رہا۔ رات نو بجے سولنگی نے طفیلے سے کہہ دیا کہ اب وہ نہ آئے۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے کھڑکی کھولی اور بلیڈ نکال کر گرل کاٹنی شروع کر دی۔ یہ کام سولنگی کی توقع سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ گرل مضبوط اور کافی مختلف قسم کی تھی۔ تین چار گھنٹے کی کوشش میں وہ چوکور سریئے کے چند ٹکڑے ہی کاٹ سکا۔ بعد ازاں اس نے احتیاط سے کھڑکی بند کر دی اور اوزار غسل خانے کے روشن دان میں چھپا دیئے۔ علی الصبح وہ واپس چلا گیا۔

یہ سلسلہ پورے پانچ روز تک چلتا رہا۔ گرل اب کافی حد تک کٹ چکی تھی۔ صرف ایک دو سریئے باقی تھے۔ انہیں کاٹ کر سولنگی گرل کا ایک چوکور ٹکڑا کھڑکی سے علیحدہ کر سکتا تھا اور ہم با آسانی وہاں سے گزر کر چار پانچ فٹ نیچے شیڈ پر اتر سکتے تھے۔ چھٹے روز شام کے بعد کمرے کی کھڑکیوں میں عجیب طرح کی روشنی نظر آنے لگی۔ حسب معمول سات بجے کے قریب سولنگی کمرے میں پہنچا تو میں نے اس کی توجہ کھڑکیوں کی طرف دلائی۔ روشنی دیکھ کر وہ بھی حیران ہوا۔ کھڑکی کے پٹ کھول کر اس نے نیچے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا "میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں" اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں بے قراری سے انتظار کرتی رہی۔ وہ مٹھائی کا دونہ لے کر کوئی دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس کے بالوں بھرے چہرے پر مایوسی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "معاملہ خراب ہو گیا ہے نیچے گلی میں شامیانے وغیرہ لگے ہیں اور لائٹنگ ہو رہی ہے۔"

سولنگی کے بتانے سے پہلے ہی مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ سرچ لائٹوں کی روشنی

ہے۔ سولنگی نے جو کچھ بتایا اس سے صورت حال واضح ہو گئی۔ نیچے گلی میں کسی لڑکی کی پیدائش کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ اور یہ جشن مسرت کم از کم ایک ہفتہ جاری رہنا تھا۔ میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا' کون کہتا ہے لوگ لڑکی کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے جسے یقین نہ ہو یہاں آکر دیکھ لے۔ سولنگی کی زبانی پتہ چلا کہ گلی میں ایک چھوٹا سا سٹیج بنا ہوا ہے۔ دور دور سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی ہیں اور لڑکی کی پیدائش پر مسرت کا اظہار کر رہی ہیں۔ ان کی یہ مسرت ہمارے لئے مایوسی کا پیغام بن کر آئی تھی۔ جس اندھیری نیم سنسان گلی میں ہم نے اترنا تھا وہاں بیسیوں افراد جمع تھے اور روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اسی دوران ادھ کھلی کھڑکی سے ہارمونیم اور گھنگھروؤں کی مدھم صدائیں آنے لگیں۔ رقص و سرود کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔

اس نئی افتاد کے باعث ہم نے کمرے سے نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ ایک دو راتوں تک صورت حال کا جائزہ لیں.......... دو راتوں کے جائزے کے بعد واضح ہو گیا کہ یہ جشن طرب ختم ہونے تک ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ گلی ساری رات روشن رہتی تھی اور صبح تک ناچ گانے میں بھی کوئی وقفہ نہیں آتا تھا۔ تیسرے روز سولنگی نے مجھ سے کہا کہ اب وہ چار دن بعد ہی آئے گا۔ تب تک ہنگامہ ختم ہو چکا ہوگا اور ہم پروگرام کے مطابق یہاں سے نکل چلیں گے۔ حبس کی شدت میں لو بھی بھلی لگتی ہے۔ میں جن حالات میں گھری ہوئی تھی ان میں ایک خطرناک ڈاکو کا ساتھ بھی مجھے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کچھ بھی تھا بہرحال میرے لئے بے ضرر ثابت ہوا تھا۔ یہ جان کر کہ اب وہ چار دن بعد آئے گا میں پریشان ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"سولنگی! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے بعد وہ طفیلا وغیرہ پھر پرانی ڈگر پر آجائیں۔"

اس نے کہا "بیگم جی اطمینان رکھو! سولنگی سے دھوکہ کریں گے تو ادھیڑ کر رکھ دوں گا انہیں۔"

سولنگی واپس چلا گیا۔ میں ایک ایک پل گن کر ہفتے کی شب کا انتظار کرنے لگی۔ سولنگی نے ٹھیک ہی کہا تھا اس کے جانے کے بعد بھی باجو اور طفیلے کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک ہی رہا۔ ہاں انہوں نے کھانے میں خواب آور دوا پھر دینی شروع کر دی۔ ایک بار پھر مجھ پر صبح و شام نیند کی یلغار رہنے لگی۔

کسی وقت بستر پر چپ چاپ لیٹے میرا دھیان سلیم کی طرف چلا جاتا اور جسم میں درد کی لہریں پھیل جاتیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ درد میری جان ہلکان کرتا تھا' پھر بھی اچھا لگتا تھا۔ کوئی عجیب بات تھی اس لاعلاج درد میں۔

سولنگی کے جانے کے بعد یہ تیسری شام کا واقعہ ہے۔ کریہہ چہرہ باجو میرے پاس آئی اور ایک نیا جوڑا پہننے کو دیا۔ اس کے ساتھ ہی کہنے لگی کہ میں نہا دھو کر سنگھار کر لوں۔ میں نے چونک کر اس کی وجہ پوچھی۔ وہ رعونت سے بولی۔

"ابھی تیرے اندر سے "کیوں کیا کیسے" والی باتیں نہیں نکلیں؟ جو کہا جاتا ہے وہ کر۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ باجو کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے کہا۔

"برے سے برے شخص کی بھی ایک زبان ہوتی ہے تم کیسے لوگ ہو کہ سولنگی کو زبان دے کر پھر رہے ہو۔ وہ تمہارا جینا حرام کر دے گا۔"

باجو نے کہا "بک بک بند کر' سولنگی سے نبٹنا تیرا کام نہیں ہے۔ یہ کپڑے پہن لینا' میں ابھی آتی ہوں" جوڑا میرے منہ پر مار کر وہ باہر نکل گئی۔ میری چھٹی حس مجھے دور دراز کے اندیشوں میں مبتلا کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اگر آج میں اس چار دیواری سے نہ نکل سکی تو کوئی سنگین واقعہ رونما ہو جائے گا۔ باجو کے کہنے پر میں نے کپڑے پہن لئے اور منہ ہاتھ بھی دھو لیا لیکن ذہن میں ایک اور ہی طرح کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا گیا میرے دل کی دھڑکنیں شدت پکڑتی گئیں اور میں کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتی گئی۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں ساڑھے نو کا وقت بتا رہی تھیں جب میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر کمرے کو اندر سے کنڈی لگائی اور پیچ کس استعمال کر کے عقبی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول لئے۔ جالی تو پہلے ہی کٹ چکی تھی بس گرل کے ایک دو سریئے اٹکے ہوئے تھے۔ ان سریوں کو بھی سولنگی نے نصف سے زائد کاٹ رکھا تھا۔ میں نے ان سریوں پر تھوڑا سا بلیڈ اور چلایا۔ پھر گرل پکڑ کر آگے پیچھے جھلایا تو دہلیز کے قریب سے قریباً ڈیڑھ ضرب دو فٹ کا ٹکڑا علیحدہ ہو کر میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں اس ٹکڑے کو ٹیڑھا کر کے اندر کمرے میں آئی۔ دوپٹے کو کمر سے باندھا

اپنے خوابیدہ ذہن کو پوری طرح بیدار کیا اور کسی نہ کسی طرح خلا میں سے گزر کر نیچے شیڈ پر پہنچ گئی۔ ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ اور خلا میں سے گزرنے کی کوشش میں پورے جسم پر خراشیں آئی تھیں۔ شاید پیٹ اور بازوؤں سے خون بھی رس رہا تھا مگر مجھے اس تکلیف کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ شیڈ پر پہنچتے ہی خنک ہوا کے جھونکے جسم سے ٹکرائے۔ میں نے نیچے جھانکا۔ قریباً چالیس فٹ نیچے گلی میں قناتوں کے اندر شور شرابا جاری تھا۔ غالباً کچھ ہیجڑے ڈھولکی کی تھاپ پر عجیب بے ڈھنگی آوازیں نکال رہے تھے۔ ایک طرف دودھیا بلبوں کی روشنی میں دیگوں کی طویل قطار نظر آ رہی تھی۔ کچھ سجے سجائے تانگے بھی نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں ان کا کیا مصرف تھا۔ جس شیڈ پر میں کھڑی تھی وہ سرچ لائٹوں اور دوسری روشنیوں کی زد میں تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ابھی کوئی تماشائی اوپر دیکھے گا اور میری طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگے گا۔ یہ بڑی کٹھن گھڑیاں تھیں۔ میں نے پشت دیوار سے لگائے دائیں طرف کھسکنا شروع کیا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اوپر کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے دھڑ دھڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ یقینی طور پر باجو یا طفیلا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ اب خطرے کی تلوار دو دھاری ہو گئی تھی۔ شیڈ بمشکل دو فٹ چوڑا تھا اور اپنے خوابیدہ ذہن کے ساتھ اس پر چلنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ تین چار گز کا فاصلہ میرے لئے "صدیوں کی مسافت" تھا۔ ہر ہر گھڑی محسوس ہوا کہ میں پکڑی جاؤں گی یا توازن کھو کر نیچے پختہ گلی میں جا گروں گی۔ شیڈ ختم ہوا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر ایک چھت نظر آئی۔ ٹائلوں کی درزیں بند کرنے کے لئے جو سیمنٹ لگایا جاتا ہے وہ مستطیل خانوں کی صورت میں صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف رکشے یا سکوٹر کے دو ٹائر پڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ویٹ لفٹنگ میں استعمال ہونے والا ایک تنگ سا بنچ تھا جس کے ایک پائے تلے سبز رنگ کی ایک پتنگ دبی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں چمکا اور دوسرے ہی لمحے میں نے آنکھیں بند کر کے چھت پر چھلانگ لگا دی۔ مجھے یاد ہے میرا دایاں پاؤں ربڑ کے ٹائر پر پڑا جبکہ دوسرا پختہ فرش سے ٹکرایا۔ ایک ٹیس سی ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک دوڑتی چلی گئی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے میرے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ تاہم یہ چیخ اور چھت پر گرنے کی آواز نیچے ڈھول ڈھمکے کے شور میں دب کر رہ گئی۔ میں کتنے ہی لمحے بے حرکت چھت پر

پڑی رہی پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور نیچے جھکی جھکی برساتی کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر تاریک سیڑھیوں پر آئی اور سنبھل کر نیچے اترنے لگی۔ سولنگی کے بیان کے مطابق اس عمارت کی دو بالائی منزلیں واقعی خالی تھیں۔ تیسری منزل پر رہائش کے آثار نظر آتے تھے۔ یہاں مجھے صحن میں ایک دری نما کپڑا الگنی پر جھولتا مل گیا۔ یہ دری میرے لئے غنیمت تھی۔ میں نے اسے چادر کی طرح سر پر ڈال کر گھونگھٹ سا نکال لیا۔ دری گیلی تھی اور کسی بچے کے پیشاب کی سخت بو آرہی تھی۔ میں دری میں لپٹی لپٹی نچلی منزل تک پہنچی۔ مختلف کھانوں کی خوشبو کے ساتھ پلیٹوں کی کھڑکھڑ بھی سنائی دے رہی تھی۔ تاہم یہ سارا ہنگامہ زینوں کی جانب رہ گیا۔ میں سیڑھیاں اتر کر اطمینان سے ان میں شامل ہو گئی۔ میں جھک کر چل رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ چال ڈھال سے ادھیڑ عمر عورت نظر آؤں۔ بائیں پاؤں نے اب تھوڑا سا لنگڑانا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے میں زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ میں بھرے پرے بازار میں قریباً ایک فرلانگ آگے آئی ہوں گی جب ایک پولیس والے کی تیز سیٹی سنائی دی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور خون جیسے رگوں میں جم گیا۔ پولیس والے کی توجہ کا مرکز میں ہی تھی۔ وہ ایک کانسٹیبل تھا ایک لاٹھی سی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ میری طرف بڑھا تو میں تیزی سے ایک تنگ بغلی گلی میں مڑ گئی۔ گلی میں مڑتے ہی مجھے ایک جنرل سٹور نظر آیا۔ جنرل سٹور کے آر پار راستہ تھا۔ میں سٹور میں گھسی اور دوسرے دروازے سے نکل کر ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر آ گئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں خود حیران رہ گئی۔ لیکن خطرہ ابھی پوری طرح دور نہیں ہوا تھا۔ ممکن تھا کانسٹیبل میرے پیچھے ہو۔ میں ایک ریڑھے کی آڑ میں سیدھی نکلی چلی گئی اور پھر بغیر سوچے سمجھے ایک نیم تاریک دروازے میں گھس گئی.......... ایسا کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا کیونکہ چند سیکنڈ بعد مجھے کانسٹیبل کی سیٹی بالکل قریب سے سنائی دی۔ وہ دروازے کے سامنے منڈلا رہا تھا۔ میں دائیں پاؤں پر زور دیتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی اور عمارت کی دوسری منزل پر آ گئی۔ یہاں تیسری منزل کی سیڑھیوں کے نیچے ایک تاریک گوشہ مجھے چھپنے کے لئے نہایت موزوں نظر آیا۔ میں وہاں گھس کر بیٹھ گئی.......... کہیں بالکل پاس سے گانے بجانے کی مدہم آوازیں آرہی تھیں۔ میں قریباً آدھ گھنٹہ اپنی پناہ گاہ میں دبکی رہی۔ آخر مجھے احساس ہوا کہ فوری خطرہ ٹل گیا ہے۔

گانے کی آوازیں اب اور بھی واضح اور بلند ہو گئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا ایک سے زیادہ لڑکیاں باری باری گانوں کے ٹکڑے گا رہی ہیں۔ شاید کوئی مقابلہ وغیرہ ہو رہا تھا۔ یہ آوازیں میری پناہ گاہ سے چند گز دور ایک نیم روشن کھڑکی سے آرہی تھیں۔ میں تاریکی میں کچھ آگے کو کھسک کر اس کھڑکی کے پاس پہنچی۔ نیلی جالی کی دوسری طرف اندر کا منظر حیران کن تھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ ان کے ساتھ ایک منشی قسم کا شخص موٹی سی ڈائری لئے بیٹھا تھا۔ میز پر سگریٹ کے پیکٹ اور چائے کی پیالیاں تھیں۔ داہنی طرف ایک قطار میں پندرہ بیس لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ادھیڑ عمر و بوڑھی عورتیں بھی تھیں۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور اگالدان وغیرہ رکھے تھے۔ سازندے آلتی پالتی مارے سازوں سے الجھے ہوئے تھے۔ ایک گھٹیا سے فلمی گانے کی دھن پر دو لڑکیاں محو رقص تھیں۔ چند لمحے بعد انہوں نے رقص ختم کیا تو ایک دوسری لڑکی اٹھی اور رقص کا مظاہرہ کرنے لگی۔ ایک سٹل فوٹوگرافر مختلف زاویوں سے تصویریں بھی بناتا جا رہا تھا۔ یہاں کے ماحول سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید یہ فلمی لوگ ہیں جو یہاں کسی نئی رقاصہ کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔ میک اپ زدہ چہروں والی لڑکیاں دلکش زاویوں سے بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی خود ساختہ ادائیں اور مسکراہٹیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ فلموں میں رقص کرنے کی شدید خواہشمند ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جنہیں اپنے منتخب ہونے کی امید نہیں تھی اور وہ اس سارے بکھیڑے کو فضول سمجھ کر لاپرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مختلف چہروں سے پھسلتی ہوئی میری نگاہ اچانک ایک چہرے پر آکر رک گئی.......... عشرت کو دیکھ کر میں چند لمحوں کے لئے سناٹے میں رہ گئی۔ یقیناً وہ عشرت ہی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ بیمار ہے' عشرت سے یوں ملاقات ہو گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ شاہ دین ٹوانہ اور خان رحیمی اسے نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے تھے اور وہ اس گنجان آباد بازار کے اس دھواں دھواں کمرے میں رقاصہ لڑکیوں کے درمیان بیٹھی رقص کرنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔

قریباً دس منٹ بعد عشرت کی باری بھی آ گئی۔ فلمساز نے انگلی کے اشارے سے

اسے اٹھنے اور رقص کرنے کی ہدایت کی۔ عشرت کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ وہ سستی کے ساتھ اٹھی اور سرخ رنگ کے قالین پر چلی آئی۔ اب میں اسے زیادہ بہتر طور سے دیکھ سکتی تھی۔ اس کے بجھے بجھے رخساروں پر ویرانی کا ڈیرہ تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑے ہوئے تھے۔ ان حلقوں کو میک اپ کی تہہ بھی چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ سازندوں نے ساز چھیڑے تو اس نے بازوؤں کو حرکت دی اور رقص کرنے لگی۔ ہم تیری جدائی کا غم سہ بھی نہیں سکتے۔ اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے۔ وہ بڑی نقاہت سے رقص کر رہی تھی' ایک منٹ میں ہانپ کر رہ گئی۔ ایک دفعہ قالین سے اس کا پاؤں الجھا اور گرتے گرتے بچی.......... دوسری لڑکیوں میں سے ہر لڑکی نے قریباً تین منٹ رقص کیا تھا مگر عشرت کا رقص فلمساز نے ایک ہی منٹ میں ختم کرا دیا اور ایک دوسری لڑکی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ عشرت سر جھکائے تھکی تھکی سی واپس اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

یہ کارروائی قریباً آدھ گھنٹہ مزید جاری رہی۔ پھر فلمساز نے دو بالکل نو عمر اور تیز و طرار رقاصائیں منتخب کیں۔ وہ خوشی سے پھلجھڑی بن گئیں اور بڑی بے تکلفی سے فلمساز اور اداکار کے درمیان آبیٹھیں۔ فلمساز نے ان کی ساتھی بوڑھی عورتوں سے بات چیت شروع کر دی۔ خالص پیشہ ورانہ قسم کی گفتگو تھی جو تند و تیز قہقہوں اور گالی گلوچ کے بعد پندرہ منٹ میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد سب لوگ باہر آنے لگے۔ میں دوبارہ سیڑھیوں کے نیچے اپنی محفوظ پناہ گاہ میں چھپ گئی۔ رقاصائیں سازندے اور بوڑھی عورتیں' سب ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔ میں تاریکی میں دبکی ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ عشرت جانے والوں میں شامل نہیں۔ وہ سب سے آخر میں چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر آئی اور سیڑھیاں اترنے کی بجائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس عمارت میں کہیں رہتی ہے۔ میں نے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر دیکھا وہ تیسری منزل پر پہنچ گئی تھی۔ اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر میں بھی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اب بلب بجھا دیئے گئے تھے اور سیڑھیوں میں نہ ہونے کے برابر روشنی تھی۔ یہ صورت حال میرے لئے بہت مناسب تھی۔ دبے پاؤں چلتی میں بھی تیسری منزل پر پہنچی اور اس وقت خوش قسمتی سے میری نظر اس دروازے پر پڑ گئی جس میں عشرت داخل ہو رہی

تھی۔ یقیناً یہ اس کے اپنے کمرے کا دروازہ تھا کیونکہ اس قطار میں تمام تر رہائشی کمرے تھے۔ کمروں کے آگے بالکونی کی شکل میں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ یہاں اکا دکا افراد نظر آ رہے تھے۔ میں ایک بار پھر سیڑھیوں کے نیچے والے خلا میں گھس گئی۔ یہ خلا بھی بالکل دوسری منزل کے خلا جیسا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں کاٹھ کباڑ کی بجائے کچھ ایندھن پڑا تھا۔ میں قریباً ایک گھنٹہ یہاں بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ ٹخنے میں رہ رہ کر ٹیس اٹھتی تھی اور کبھی کبھی حبس کا احساس بھی ہونے لگتا تھا۔ بالکونی اب خالی نظر آنے لگی تھی۔ کمروں کی بیشتر کھڑکیاں بھی تاریک ہو چکی تھیں۔ میں نے عشرت کو کمرے میں تنہا داخل ہوتے دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی تنہا ہو گی۔ میں بہ آہستگی اپنے تاریک گوشے سے نکلی اور دبے پاؤں چلتی عشرت والے دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ میری تیسری دستک پر عشرت نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں مدہم روشنی ہو رہی تھی۔ وہ پہلے تو پہچاننے میں یکسر ناکام رہی.......... پھر بتدریج اس کی آنکھوں میں حیرت خوف اور خوشی کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے اس نے جلدی سے مجھے اندر کھینچ کر دروازے کو کنڈی لگا دی۔

"شا.......... شاہدہ تم؟" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی حیرت زدہ آواز برآمد ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں سمندر اچھل رہا ہے۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی اور میرے ساتھ چپکتی چلی گئی۔ کتنی ہی دیر اس نے اسی طرح مجھے بازوؤں میں جکڑے رکھا۔ میں نے بمشکل اسے خود سے جدا کیا۔ ہم دونوں مسہری پر بیٹھ گئیں۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ اس کمرے سے بھی چھوٹا جس میں میں کئی روز باجو اور طفیلے کی نگرانی میں قید رہی تھی اور اب اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچی تھی۔ میں نے دیکھا بستر کے ساتھ ایک میز پر دواؤں کی شیشیاں رکھی ہیں اور پیلے لفافوں میں بڑے بڑے ایکسرے بھی موجود ہیں۔ ایک طرف صندوق میں عشرت کا مختصر سا سامان رکھا تھا اور دیوار پر اس کے دو جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں پہنچتے ہی مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ عشرت نے حیران لہجے میں اپنا سوال پھر دہرایا "تم یہاں کیسے شاہدہ؟"

میں اسے کیا بتاتی کہ پچھلے چند ہفتوں میں کن طوفانوں سے گزر چکی ہوں اور میرے دل پر کیا کیا صدمے گزرے ہیں۔ میں اسے صرف اپنی روئیداد سنا سکتی تھی' وہی

روئیداد جس کا کچھ نہ کچھ حصہ اخباری خبروں کے ذریعے بھی اس تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے وہاب چنگیزی کے ڈیرے پر پیش آنے والے خواب ناک واقعات سنائے۔ ان چار لاشوں کا ذکر کیا جو میں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک قطار میں پڑے دیکھی تھیں۔ باجو اور طفیلے کے بارے بتایا اور اس کھڑکی کا ذکر کیا جو مجھے گوشت نوچنے والے درندوں کے بدبودار نوکیلے دانتوں سے بچا کر یہاں تک لائی تھی۔ عشرت سب کچھ حیرت کے سمندر میں گم سنتی رہی.......... میری کہانی ختم ہوئی تو میں نے عشرت کے حالات پوچھے۔ اس کی اشکبار آنکھیں کچھ اور بھی اشکبار ہو گئیں۔ روتے ہوئے بولی۔

"شاہدہ! میں تو مرتے مرتے بچی ہوں۔ تین دن ہسپتال رہ کر پچھلے ہی ہفتے آئی ہوں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

جواب میں آہوں اور سسکیوں کی درمیان عشرت نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

"سالار کی بھیجی ہوئی عورت خانم مجبور کر کے عشرت کو خان رحیمی کی کوٹھی سے لے کر آئی تھی۔ یہاں واپس پہنچنے کے دوسرے ہی دن عشرت کو سینے میں بائیں طرف درد شروع ہوا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے میو ہسپتال لے جایا گیا' جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی چند ماہ قبل جب ابھی اسے شاہ دین ٹوانہ کے سپرد نہیں کیا گیا تھا اسے یہ تکلیف ہو چکی تھی۔ عشرت کی عمر ابھی اتنی نہیں تھی کہ اسے ایسی جان لیوا بیماری لاحق ہوتی' مگر شاید یہ مرض اسے وراثت میں ملا تھا اور رہی سہی کسر ان تباہ کن حالات نے پوری کر دی تھی جن سے وہ گزر رہی تھی۔ وہ فطرتاً ایک شریف لڑکی تھی اور اس گھناؤنے ماحول میں پھنس کر شب و روز ایک عذاب جھیل رہی تھی۔ ایسی قیامتیں پتھر سے تراشے ہوئے دل پر بھی گزرتیں تو اسے جونک لگ جاتی۔ میں نے غمزدہ نگاہوں سے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ میرے سامنے اشکبار بیٹھی وہ کملایا ہوا پھول لگ رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی۔ یہ لڑکی اپنے شریفانہ ماحول میں رہتی اور پاکیزگی کا نور اس کے چہرے پر ہوتا تو رعب حسن سے دیکھنے والی آنکھیں کانپ کانپ جاتیں۔ مگر آج وہ

ایک لاچار اور ٹھکرائی ہوئی مخلوق کی طرح اس حبس زدہ کمرے میں پڑی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کا زرد چہرہ دیکھ کر خوف آنے لگا۔ مجھے لگا جیسے وہ ان چند ہی دنوں میں زندگی اور زندہ لوگوں سے بہت دور چلی گئی ہے.......... میں نے اس سے اس کے علاج معالجے کے بارے میں پوچھا۔ وہ بے دلی سے جواب دیتی رہی۔ میں نے اسے بتایا کہ خان رحیمی اور شاہ دین ٹوانہ اس کی گمشدگی سے بے حد پریشان ہیں اور جگہ جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عشرت کو ان معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اب اس کے دل میں بس ایک ہی خواہش ہے کہ وہ اپنے گھر اپنی ماں کے پاس واپس پہنچ جائے۔ کہنے لگی۔

"شاہدہ! تم بڑے اچھے وقت پر ملی ہو' مجھے کسی تمہارے ہی جیسے سہارے کی ضرورت تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ بچوں گی نہیں۔ میری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے کچھ دن اس چاردیواری میں گزار لوں اور جہاں میری ماں رہتی ہے۔"

میں نے عشرت کو تسلی دی اور اسے کہا کہ وہ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہے۔ اسے کوئی لاعلاج بیماری نہیں اور دل کے عمر رسیدہ مریض بھی کئی کئی سال جیتے ہیں' بلکہ عام لوگوں سے بھی لمبی عمریں پا جاتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ کہنے لگی۔

"کچھ بھی ہے شاہدہ' میں ایک دو روز میں یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے یہاں سے چلی جانا اس کے اپنے بس میں ہے' وہ جب چاہے گی یہاں سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے گی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا سالار اور خانم وغیرہ تمہیں یہاں سے جانے دیں گے؟"

وہ بے دلی سے مسکرائی تو اس کے ہونٹوں پر دکھ کے ٹوٹے ہوئے شیشے بکھر گئے۔ کہنے لگی "جب گنا بیلنے میں سے گزر جائے تو اسے پھینک ہی دیا جاتا ہے۔ مجھ میں اب کیا رہا ہے جو مجھے سنبھال سنبھال کر رکھیں گے۔ نہ ناچ سکتی ہوں نہ گا سکتی ہوں نہ مردوں کے ستم جھیل سکتی ہوں۔ میری اہمیت کا اندازہ تم اس کمرے سے ہی کر لو' جب میں ٹھیک تھی اور سالار کے مہمان مجھ پر راتیں ٹپکاتے تھے تو میرا ٹھکانہ یہ کمرا نہیں دوسری منزل کا

ایک شاندار فلیٹ تھا جہاں ائر کنڈیشنز اور ہیٹر لگے تھے اور وال ٹو وال کارپٹ بچھے ہوئے تھے......... اب بھی بچھے ہوئے ہیں لیکن میری جگہ کوئی اور آ چکی ہے۔ پرسوں میری طبیعت پھر زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ سالار مجھے دیکھنے آیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب مجھے اپنے پاس رکھنے میں اسے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے خانم کے ذریعے اسے کہلوایا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دے۔ شاید آج کل کسی وقت خانم اس کا جواب لے آئے گی..........."

دروازے سے باہر قدموں کی آواز آئی اور پھر ایک مخصوص دستک سنائی دی۔ عشرت بری طرح گھبرا گئی۔ اس نے بدحواسی سے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک میلا سا پردہ اٹھا کر کمرے کے پچھلے حصے میں آ گئی۔ یہاں سبز روغن والا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دروازے کے رخ سے صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ یہ ساتھ والے کمرے میں کھلتا ہو گا۔ عشرت نے اپنی طرف سے دروازے کی کنڈی کھولی اور ہلکی سی دستک دی۔ دستک کے چند لمحے بعد کسی نے دوسری طرف سے کنڈی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ ایک ٹھگنی اور بڈھی سی عورت نظر آئی جس کے کٹے ہوئے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اسے دیکھ کر عشرت نے گھبراہٹ سے کہا۔

"ہیرا! یہ میری سہیلی ہے اسے کمرے میں چھپالے کچھ دیر کے لئے۔"

ہیرا نامی اس عورت نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور مجھے بازو سے تھام کر اندر کھینچ لیا۔ یہ کمرہ پہلے سے بھی بدبودار تھا۔ شاید یہ عورت چرس پیتی رہی تھی۔ کمرے میں بدبو کے ساتھ دھواں بھی پھیلا تھا۔ مجھ سے میرا حسب نسب پوچھنے کی ناکام کوشش کے بعد عورت نے مجھے گالیاں دیں اور پھر سر پر دوپٹے کی گرہ باندھ کر مسہری پر پھیل گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں اس کے گونجدار خراٹے سن رہی تھی.......... رات کا باقی حصہ میں نے اسی بدبودار کمرے میں سوتے جاگتے اور ابکائیاں لیتے گزار دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ کئی بار دل میں آئی کہ خراٹے لیتی ہوئی عورت کو اٹھاؤں یا خود ہی عشرت کے کمرے میں کھلنے والے دروازے پر دستک دوں مگر ان خیالات کو عملی جامہ پہنانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بالآخر یہ منحوس رات بھی کٹ گئی۔ علی الصبح اندرونی دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف عشرت ہی تھی۔ میں

اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ رات بھر کوئی انسان نما جانور اس کمرے میں موجود رہا ہے۔ عشرت کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے اور اس کے ہونٹوں کی ماتمی نیلاہٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کے قبرستان میں کہیں زندگی کا نشان سا ہے۔ کوئی خوشی کی کرن ہے جو اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس کے دل سے پھوٹ رہی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ سالار نے اسے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ تمام تصویریں اور نیگٹیو اسے واپس کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی آئندہ زندگی میں کوئی دخل نہیں دیا جائے گا۔ وہ بھی ماضی کے ان چھ سات سالوں کو یکسر فراموش کر دے گی.......... تمام باتیں طے کر لی گئی ہیں اور اب وہ جانے کے لئے آزاد ہے۔

کیسی آزادی تھی یہ! میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا اس شب بیدار عمارت کے بیشتر مکین اب سو رہے تھے لیکن عشرت جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کچھ دیر کے لئے وہ کمرے سے نکلی تو واپسی پر ایک اخبار لے آئی۔ اخبار کے اندرونی صفحے کی ایک خبر پر اس نے انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو۔"

میں نے سرخی پڑھی لکھا تھا "واصف چنگیزی قتل کیس کی مفرور ملزمہ بازار حسن سے فرار" نیچے تفصیل درج تھی' واصف چنگیزی قتل کیس کی مفرور ملزمہ ثناء محمود کو کل بازار حسن کے علاقے میں دیکھا گیا۔ پولیس نے چھاپا مارا مگر وہ چھاپے سے قبل ہی اپنے ٹھکانے سے فرار ہو گئی۔ معلوم ہوا ہے کہ ثناء محمود کے بہت سے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطے ہیں اور وہ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتی ہے۔ یاد رہے کہ پچھلے دنوں ثناء محمود نے کچھ غنڈہ عناصر کے ساتھ مل کر جھنگ میں چنگیزی فیملی کی رہائش گاہ پر ہلہ بولا تھا۔ اس واقعے میں چودھری وہاب چنگیزی کا سب سے چھوٹا بھائی شجاع اور ایک ملازم جان مسیح موقعہ پر ہلاک ہو گئے تھے۔ نیز اس کیس کی ایک اور فریق پرنسپل میڈم نادرہ نے کہا ہے کہ انہیں ثناء محمود اور اس کے ساتھیوں سلیم اور چودھری شہاب وغیرہ کی طرف سے جان کا خطرہ ہے' لہٰذا اس کی حفاظت کی جائے۔ انہوں نے ثناء محمود کے کردار پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا کہ ایسی عورت صرف ایک خاندان کے لئے نہیں پورے معاشرے کے لئے بدنامی کا داغ ہوتی ہے۔ ملزمہ کو گرفتار کر کے جلد از جلد مثالی سزا دی جانی چاہئے۔

پرنسپل نادرہ جو ایک فلاحی اصلاحی ادارے کی چیئرمین بھی ہیں نے کہا ہے کہ اگر انتظامیہ نے اپنے پورے وسائل بروئے کار لا کر قاتلہ کو جلد گرفتار نہ کیا تو اس کا شدید ردعمل ہو گا۔"

خبر پڑھ کر میڈم نادرہ کا منحوس چہرہ میری نگاہ میں گھومنے لگا۔ یہ عورت اونٹ کا کینہ رکھتی تھی اور مجھے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ چنگیزیوں کے ہاں اس کا آنا جانا بدستور جاری تھا اور وہ ان کی ہر منصوبہ بندی میں شریک رہتی تھی۔

جونہی شام گہری ہوئی میں اور عشرت ان گلیوں سے نکل آئیں جہاں عورت اپنے سب سے گھناؤنے اور قابل نفرت روپ میں پائی جاتی ہے۔ عشرت برقعے میں تھی جبکہ میں نے خود کو ایک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اپنے سامان میں سے عشرت جسم کے لباس کے سوا کوئی چیز ساتھ نہیں لائی تھی۔ ہم بڑی سڑک پر پہنچیں اور وہاں سے رکشے میں سوار ہو کر اچھرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ عشرت کی والدہ اسی علاقے میں رہتی تھیں۔ اچھرہ پہنچ کر ایک نئے بنے ہوئے دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر ہم رکیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ برقعے کے اندر عشرت کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ آج کئی سالوں کے بعد وہ اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ دوبارہ کال بیل بجانے کے لئے اٹھا لیکن کسی مردہ شاخ کی طرح نیچے جھول گیا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے گھر کے باسیوں کو اپنی آمد سے آگاہ کر سکے۔ میں نے آگے بڑھ کر کال بیل بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے' چہرے میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی' مگر معلوم نہیں کیوں مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں دلکشی تھی۔ وہ بڑی شفقت سے بولی "فرمایئے"

نقاب کے پیچھے سے عشرت نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے دروازے کے اندر لے آئی۔ دفعتاً عشرت نے ایک چیخ ماری اور ادھیڑ عمر عورت سے لپٹ گئی۔ عورت بوکھلا گئی اور اس کا نقاب الٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ عشرت کا چہرہ دیکھ کر وہ یوں پیچھے ہٹ گئی جیسے ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔ کتنی ہی دیر وہ پھٹی ہوئی نظروں سے عشرت کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ تب اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی "عشرت

یہ.......... یہ تم ہو!" عشرت نے زار و قطار روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ سات سال بعد ماں بیٹی کا یہ ملاپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی مگر اس نے عشرت کو اپنے بازوؤں میں لے کر یوں اپنے سینے سے چمٹایا کہ کچھ دیر کے لئے وہ اس کے جسم کا ہی ایک حصہ بن گئی۔ ان دونوں کے رونے نے گھر کی دیواروں کو ہلا دیا اور مجھے لگا کہ میں اپنی جگہ کھڑی کھڑی مسمار ہو جاؤں گی۔ میں وہ کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی جو ماں بیٹی کے ملاپ کو دیکھ کر میرے دل پر طاری ہوئی۔ لگتا تھا ان دونوں کے ساتھ ساتھ میں بھی آنسوؤں کے تند و تیز سیلاب میں بہتی جا رہی ہوں۔ روتے روتے عشرت کی ماں کی نگاہ اچانک میری طرف اٹھی اور وہ سکتے کی حالت میں رہ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے پہچان گئی ہے۔

بعد کے واقعات میں مختصراً بیان کرتی ہوں۔ عشرت نے اپنی ماں کو وہ سب کچھ بتایا جو پچھلے چھ سات برسوں میں اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ یہ ایک دلدوز کہانی تھی' جو وہ وقفے وقفے سے مسلسل تین روز تک سناتی رہی۔ ان دونوں کی آنکھیں روتی رہیں اور سسکیاں در و دیوار میں گونجتی رہیں۔ میں گم صم ان کے پاس بیٹھی رہتی یا اٹھ کر خالی گھر میں گھومنے لگتی۔ یہ گھر عشرت کی ماں صادقہ نے پچھلے ہی برس تعمیر کرایا تھا۔ یہاں اس کے ساتھ ایک بوڑھی ملازمہ کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ یہ ملازمہ بھی گھر کے فرد ہی کی طرح تھی اور صادقہ کو اس کا نام لے کر پکارتی تھی۔ صبح سویرے صادقہ جب اپنی گارمنٹس کی دوکان پر چلی جاتی تو یہی ملازمہ پورے گھر کی نگہبان ہوتی تھی۔ وہ بڑی چاق و چوبند اور ہوشیار عورت تھی۔ ہماری آمد کے دوسرے ہی روز صادقہ' عشرت کو ایک ہارٹ سپیشلسٹ کے پاس لے گئی۔ طویل معائنے اور ٹیسٹوں وغیرہ کے بعد اس نے بھی کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ صرف دواؤں میں معمولی تبدیلی کی اور مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ لیکن آرام شاید عشرت کی قسمت میں ہی نہیں تھا۔ گھر واپس پہنچتے ہی اس کے دماغ پر ایک عجیب بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ اس بات کی ضد کر رہی تھی جس کی ضد اس نے پچھلے پندرہ سولہ سال میں کبھی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی اصل ماں سے ملنا چاہتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے صادقہ سے باتیں کرتے سنا۔ اس نے صادقہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بڑے فریادی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ماں! مجھے اس سے ملا دو۔ ایک بار صرف ایک بار اگر

مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہو تو میری یہ خواہش پوری کر دو۔"

جواب میں صادقہ نے اس کا ماتھا چوما اور کہا "بیٹی! میں تجھے کیسے سمجھاؤں میں سچ کہتی ہوں' مجھے کچھ پتہ نہیں' اگر پتہ ہوتا تو کبھی نہ چھپاتی.........."

اسی روز رات کو جب عشرت گہری نیند سو گئی تو صادقہ میرے پاس چلی آئی۔ اس گھر میں آنے کے بعد تنہائی میں میرے اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں جانتی تھی وہ مجھے پہلے روز ہی پہچان گئی ہے اور نہ پہچاننے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ وہ مجھے بھابی ثمینہ کی نند کے طور پر اچھی طرح جانتی تھی تاہم عشرت کے سامنے اس نے اپنی شناسائی ظاہر نہیں کی تھی اور میں بھی چپ رہی تھی.......... وہ کچھ دیر بغور مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک میرے قدموں میں گر پڑی اور رونے لگی۔

"بیٹی! ہماری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے کچھ کہہ دیا تو قیامت آجائے گی۔ مجھ سے وعدہ کرو چپ رہو گی.......... کچھ نہیں کہو گی۔"

میں جانتی تھی صادقہ کیا کہہ رہی ہے اس کی تشویش سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں عشرت کے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔ اگر میں یہ بات افشا کر دیتی کہ عشرت بیرون ملک میں تعلیم حاصل نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ پچھلے کئی سال سے "گناہوں کی بستی" میں رہائش پذیر تھی تو بھابی ثمینہ کے لئے کیا طوفان کھڑا نہ ہو جاتا۔ ممکن تھا کہ وہ چند ہی روز میں طلاق کا کاغذ تھام کر اسی گھر میں بیٹھی نظر آتی۔ میں نے بمشکل صادقہ کو اپنے قدموں سے اٹھایا اور حوصلہ دے کر کرسی پر بٹھایا۔ وہ کہنے لگیں۔

"بیٹی! میں جانتی ہوں تیرے اپنے ساتھ بھی بہت ظلم ہوا ہے۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو چکا ہے۔ تیرے بارے میں سوچ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔"

میں نے کہا "آنٹی صادقہ' میں اب تسلی تشفی کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

آنٹی صادقہ نے کہا "ثناء کیا یہ بہتر نہیں کہ تم خود کو.......... قانون کے حوالے کر دو۔ میرا ایمان ہے کہ اگر تم حق پر ہو تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا "آنٹی یہ سب کتابوں کہانیوں کی باتیں ہیں۔ اس دور میں حق پر آنچ

بھی آتی ہے وہ شرمسار بھی ہوتا ہے اور سچائی بناوٹ کی اصولوں سے چھپتی بھی ہے۔ میرے لئے اب موت کے سوا اور کسی کے پاس انصاف نہیں ہے۔"

میری باتوں سے آنٹی صادقہ قدرے ہراساں نظر آنے لگی کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی "بیٹی' میرا سینہ تیرے لئے کشادہ ہے' میرا دل چاہتا ہے تجھے اپنی چادر میں اس طرح چھپا لوں کہ کوئی ڈھونڈے سے ڈھونڈ نہ سکے۔ مگر میں جانتی ہوں یہ ممکن نہیں ہے پولیس کے علاوہ چنگیزیوں کے کارندے بھی تیری تلاش میں ہیں۔ وہ ہر جگہ تیری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ دو تین دفعہ تو وہ یہاں تک بھی پہنچ چکے ہیں۔ ایک دفعہ مقامی تھانیدار ان کے ساتھ تھا اور دو دفعہ وہ اکیلے آئے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں اگر وہ پھر اس طرف نکل آئے تو تجھے کہاں چھپاؤں گی۔"

میں آنٹی صادقہ کی بات پوری طرح سمجھ رہی تھی اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہی کہتا۔ میرا وجود اب موت کی علامت تھا اور کوئی بھی موت کو اپنے آنگن میں جگہ نہیں دیتا۔ میں نے کہا۔

"آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں یہاں صرف عشرت کو چھوڑنے آئی تھی۔ زیادہ دیر آپ کو تکلیف نہیں دوں گی۔ صرف پرسوں تک کی مہلت دے دیں۔ پرسوں دوپہر سے پہلے چلی جاؤں گی۔"

آنٹی صادقہ نے نرمی سے کہا "نہیں بیٹی! ایسی جلدی والی تو کوئی بات نہیں میرے بس میں ہو تو تجھے ساری عمر یہیں رہنے کے لئے کہوں۔ مگر میں نہیں سمجھتی یہ ٹھکانہ تمہارے لئے محفوظ ہے۔ کوئی بھی یہاں آسکتا ہے۔ زرینہ (عشرت) ثمینہ سے ملنے کو کہہ رہی ہے۔ میں اسے اب تک ٹالتی آ رہی ہوں میں کب تک ٹالوں گی۔"

اس رات میں دیر تک بے قرار سی چھت پر ٹہلتی رہی۔ ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی خود کو یقین دلاتی رہی کہ میں ہی ثناء ہوں۔ حویلی میں تصادم کے مناظر رہ رہ کر میری آنکھوں میں کوندتے اور میں حیرانی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگتی۔ کیا میں نے کبھی خواب میں بھی سوچا تھا کہ اس طرح ایک تیز دھار آلہ پکڑ کر زندہ جسموں پر چلاؤں گی۔ اور ٹرائیگر دبا کر کسی کو موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ مگر یہ سب کچھ ہوا تھا' اور میں نے کیا تھا "بنگال ٹائیگر" کی خوفناک آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی اور پہریدار کے بکھرے ہوئے

ہاتھ پاؤں نگاہوں میں رقصاں ہو گئے۔ پھر چار مردہ جسموں کی قطار آنکھوں کے روبرو آئی اور مجھے لگا کہ میرے ذہن میں پھر وہی دھند بھر رہی ہے جو مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس دھند سے گھبرا کر میں جلدی سے سونے کے لئے لیٹ گئی.......... میں نے ایک خواب دیکھا۔ میڈم نادرہ ایک سونے کی وہیل چیئر پر بیٹھی میرے سامنے آئی۔ اس کی گرد لمبی لمبی زبانوں والے سینکڑوں افراد تھے۔ ان سب کی ایک ایک انگلی پالش شدہ لوہے کی طرح چمک رہی تھی۔ میڈم نادرہ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہی وہ بدبخت لڑکی ہے جس نے مجھے کار تلے روندا تھا۔ اب تو تمہیں یقین آیا کہ یہ جرائم پیشہ ہے۔ اب یہ آوارہ گردوں کی سردار ہے۔ بازار حسن میں رہتی ہے اور گینگ کے ساتھ گھومتی ہے۔ شبخون مارتی ہے اور قتل کرتی ہے۔ کیا اس بدخصلت کے لئے معافی کی کوئی گنجائش ہے؟"

"نہیں.......... نہیں" لمبی زبانوں والوں نے بیک زبان کہا۔ پھر وہ سارے مرد و زن کورس کی صورت میں چیخنے لگے۔ "مرجا بے حیا.......... مرجا بے حیا" اور اپنی آہنی انگلیاں میرے جسم پر چبھونے لگے۔ میرے چہرے پر' میری آنکھوں میں' میری پسلیوں میں۔ میں نے خود کو موت کے عذاب میں گرفتار پایا اور چلا کر اٹھ بیٹھی۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں اٹھ کر حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں جاگ گئی تھی۔ میرا منہ بند تھا لیکن چیخیں اب بھی دیواروں میں گونج رہی تھیں۔ یہ کوئی وہم نہیں تھا۔ میں چیخیں صاف سن رہی تھی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی سچ مچ چیخ رہا ہے۔ یہ عشرت تھی میں دروازے سے نکل کر بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی۔ وہ مسہری پر دراز تھی اور اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ آنٹی صادقہ اسے چپ کرانے کی کوشش میں' اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ یقیناً وہی پہلے والا معاملہ تھا۔ عشرت ضد کر رہی تھی اور آنٹی صادقہ بیچارگی سے کہہ رہی تھی کہ میں کیا کروں' کہاں سے لاؤں تمہارے ماں باپ کو' میں نے کچھ سنا نہیں لیکن بغیر سنے ہی میں ان کی ساری باتیں سمجھ رہی تھی۔ عشرت کا چہرہ اب پہلے سے زیادہ بیمار دکھائی دیتا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر میرے سینے میں ہوک سی اٹھ جاتی تھی۔

اسی دوپہر کا واقعہ ہے میں شربت کا گلاس لے کر عشرت کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا اور جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گئی۔ کمرے میں ایک ایسی صورت نظر آئی تھی جس کا میں یہاں تصور بھی نہ کر سکتی تھی.......... خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ میڈم نادرہ سے یوں ملاقات ہو گی۔ چند لمحوں کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے ابھی کل رات والا خواب ہی دیکھ رہی ہوں.......... میڈم نادرہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ یہ سوال ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر برسا.......... غالباً آنٹی صادقہ سے اس کی جان پہچان تھی۔ شاید ہمارے ہی گھر میں کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ وہ عشرت کی مزاج پرسی کے لئے آئی بیٹھی تھی۔ ممکن سوال یہ تھا کہ آنٹی صادقہ نے تو ابھی رشتے داروں میں بھی کسی کو عشرت (زرینہ) کی واپسی کا نہیں بتایا تھا۔ پھر میڈم نادرہ سے اس کا ایسا خاص کیا تعلق تھا جو اسے بتا دیا۔ شاید وہ اتفاقاً خود ہی چلی آئی تھی..........

گھر میں میڈم نادرہ کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی میں سنگین اندیشوں کی زد میں آگئی۔ اگر اس عورت کو پتہ چل جاتا کہ میں اس چار دیواری میں ہوں تو وہ بلائے ناگہانی کی طرح مجھ سے چمٹ جاتی اور ایک گھنٹے کے اندر اندر میرے ہر دشمن کو میری سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں جلدی سے واپس ہوئی اور مکان کی پچھلی جانب ایک چھوٹے سے بیڈ روم میں چلی گئی۔ یہ بیڈ روم زیادہ تر بند رہتا تھا اور اس وقت میرے لئے مناسب پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ اٹیچ باتھ روم بھی تھا اگر زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تو میں باتھ روم میں بھی جا سکتی تھی۔ ابھی مجھے اس کمرے میں آئے بمشکل ایک منٹ ہی ہوا تھا کہ آنٹی صادقہ کے قدموں کی آواز آئی اور اس کے ساتھ وہیل چیئر کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ دونوں صحن سے اس طرف آ رہی تھیں۔ میں جلدی سے باتھ روم کی تاریکی میں گھس گئی۔ دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر چلی آئیں۔ میں یہ جان کر حیران ہوئی کہ میڈم نادرہ سسکیوں سے رو رہی ہے۔ پھر ایکا ایکی جیسے اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے دروازے کی درز سے جھانکا۔ آنٹی صادقہ نے تیزی سے بڑھ کر کمرے کا بیرونی دروازہ بند کیا اور میڈم نادرہ کو بازوؤں سے تھام کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ میڈم نادرہ چیئر پر بیٹھی بیٹھی آنٹی صادقہ

سے لپٹ گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں یہ راز بالکل نہیں آرہا تھا۔ میڈم نادرہ کا یہاں پہنچنا ہی کم اسرار انگیز نہیں تھا اب بند کمرے میں اس کی یہ آہ و بکا اور بھی حیرتناک تھی۔ میڈم نادرہ کی روتی بلکتی آواز آئی۔

"یہ کیا ہو گیا صادقہ! میری بیٹی کو کس جرم کی سزا ملی ہے۔ کیا گناہ کیا تھا اس نے؟"

صادقہ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "حوصلہ کرو نادرہ شکر کرو وہ زندہ ہے۔"

میڈم نادرہ کی آواز آئی "تم اسے زندہ کہتی ہو صادقہ......... ہائے میری پھول سی بچی۔ ظالموں نے اسے مسل کر رکھ دیا۔ وہ کہیں کی نہیں رہی۔ اس سے تو مرجاتی تو اچھا تھا۔ ہائے......... میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے صادقہ مجھے کہیں سے زہر لادے۔ میں یہ درد نہیں جھیل سکتی۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔"

آنٹی صادقہ سنبھال رہی تھیں اور نادرہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں بڑی کربناک تھیں۔ ایک بڑے انگلش میڈیم اسکول کی پرنسپل اور مشہور معروف سماجی شخصیت میڈم نادرہ کی یہ حالت میرے لئے بے حد تعجب خیز تھی......... میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دونوں عورتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ عشرت یعنی زرینہ میڈم نادرہ کی بیٹی ہے......... میڈم نادرہ ہی وہ عورت ہے جس کی بیٹیوں کو صادقہ نے ماں بن کر پالا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوا......... میڈم نادرہ اپنی بیٹیوں سے دور کیوں رہی۔ یہ سوال بہت اہم تھا۔ میری نگاہوں میں اپنی بڑی بھابی ثمینہ کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کا مطلب تھا وہ بھی میڈم نادرہ کی بیٹی ہے......... میڈم نادرہ جس نے مجھ پر زمین تنگ کر رکھی تھی اور ہواؤں میں میری بو سونگھتی پھرتی تھی۔ میں نے سچ بولنے کا وعدہ کر رکھا ہے' اس لئے سچ کہتی ہوں کہ اپنی دشمن میڈم نادرہ کو یوں تڑپتے بلکتے دیکھ کر مجھے بالکل ترس نہیں آیا بلکہ ایک طرح کا سکون اور اطمینان محسوس ہوا۔ میرا دل چاہا وہ اور روئے تڑپے' میری طرح دیواروں سے سر ٹکرائے اور سینہ کوبی کرے۔ یہ عورت شیطانیت سے لبالب بھری ہوئی تھی اور اس کے لئے میرے پاس بددعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

آنٹی صادقہ بڑی بدحواس نظر آتی تھی۔ اس نے کہا "نادرہ تم نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاؤ بہتر ہے۔ میں تمہیں بعد میں سب کچھ بتاؤں گی۔

آؤ میں تمہیں پچھلے دروازے سے نکال دیتی ہوں۔ گلی سے ہو کر گاڑی کی طرف چلی جانا.........وہ اس کی کرسی کو برآمدے کی طرف دھکیلنے لگی۔

میڈم نادرہ نے بریک لگا کر کرسی روک لی۔ روتے ہوئے بولی "صادقہ کیا بات ہے تم بتاتی کیوں نہیں ہو' اور کون ہے یہاں؟"

آنٹی صادقہ نے تیز سرگوشی میں کہا "جو لڑکی زرینہ (عشرت) کو یہاں لائی ہے' پتہ ہے کون ہے؟"

"کون ہے؟" نادرہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

"ثناء" آنٹی صادقہ نے جواب دیا......... یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا شیشہ زور دار چھناکے سے کمرے کے بیچوں بیچ ٹوٹ گیا ہے۔ دروازے کی اوٹ سے میری نگاہ میڈم نادرہ کے چہرے پر پڑی۔ اس کا رنگ زرد ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں حیرت سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ آنٹی صادقہ نے اس کی کرسی دھکیلتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی لیکن یہاں سے نکلنے والی بات کرو۔ وہ اوپر والے کمرے میں ہے' کسی وقت بھی نیچے آسکتی ہے"

اس وقت نہ جانے کیا ہوا۔ میرے اندر سے غم و غصے کی ایک بلند لہر اٹھی اور میں دو قدم چل کر دروازے کے پیچھے سے نکل آئی۔ آہٹ سن کر آنٹی صادقہ اور نادرہ نے بیک وقت گھوم کر دیکھا۔ میڈم نادرہ پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ ہوا۔ اس دفعہ آنٹی صادقہ بھی اس حیرت میں برابر کی شریک تھی۔ وہ صاف طور پر ہراساں نظر آئی۔ ہکلا کر بولی۔

"ثناء......... یہ......... یہ نادرہ بہن ہیں۔ زرینہ کی خیریت پوچھنے آئی تھیں۔"

میں نے کہا "آپ کے چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا آنٹی......... میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ مجھے پتہ ہے یہ زرینہ کی خیریت پوچھنے کیوں آئی ہیں۔"

میڈم نادرہ کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ آنٹی صادقہ بھی خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ میں نے میڈم نادرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تمہاری بیٹی پچھلے سات سال سے بازار حسن کی زینت تھی۔ لگے ہاتھ اب ایک اخباری بیان اس کے بارے میں بھی دے دو۔ کہہ دو کہ

میری بیٹی سرطان کا پھوڑا ہے۔ ایسی عورت اپنے خاندان کے لئے ہی نہیں پورے معاشرے کے لئے بدنامی کا داغ ہوتی ہے۔ میری بیٹی کو سرعام سنگسار کیا جانا چاہئے۔"

میڈم نادرہ سکتے کی حالت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بمشکل اپنے لبوں کو حرکت دے کر بولی "تم......... زرینہ کو......... لے کر آئی ہو؟"

میں نے کہا "تمہیں کوئی شک ہے؟"

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں مستحکم قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" آنٹی صادقہ نے کراہ کر پوچھا۔

"میں اپنے بڑے بھائی کو ایک ٹیلیفون کال کرنے جا رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"انہیں ان کی نئی ساس کے بارے میں بتاؤں گی' اور اس سالی کا تعارف بھی کراؤں گی جو پچھلے سات سال سے بیرون ملک "زیر تعلیم" ہے۔"

میرے اس فقرے نے میڈم نادرہ کو تڑپا کر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتی ہوئی مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کی خود سر مغرور اور خوفناک عورت چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے اور وہ کرسی سمیت لپک کر میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ ایک بار پھر اس کی گھٹی گھٹی سی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ وہ اپنی ناک میرے پیٹ پر رگڑ رہی تھی اور پکار رہی تھی۔

"خدا کے لئے بیٹی......... خدا کے لئے میری دونوں بیٹیاں برباد ہو جائیں گی۔ میرا سب کچھ لٹ جائے گا۔ تمہیں تمہارے ماں باپ کا واسطہ' مجھے معاف کر دو کسی سے کچھ نہ کہنا۔ کسی کو کچھ نہ بتانا......... میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

وہ پوری قوت سے میری ٹانگوں کو جکڑ کر مجھے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میری آنکھوں میں اپنے پیاروں کے مرے ہوئے چہرے گھوم رہے تھے۔ ان کی آخری ہچکیاں کانوں میں طوفان اٹھا رہی تھیں۔ میڈم نادرہ کی منحوس آواز میرے کانوں تک کیسے پہنچتی۔ اس کی التجاؤں کا منظر میری نگاہوں میں کیونکر آتا۔

میں دروازے کی طرف بڑھتی رہی۔ وہیل چیئر الٹ گئی اور فربہ اندام میڈم نادرہ میرے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگی۔ لرزتی کانپتی آنٹی صادقہ نے میرے سامنے دروازہ بند کر دیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹا دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ میڈم نادرہ ابھی تک میرے ساتھ گھسٹ رہی تھی اور فریاد کناں تھی۔

"ہم پر رحم کرو ثناء......... ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ خدا کے لئے ہماری بات مان لو۔"

یقیناً اس وقت کوئی مجھے نہ روک سکتا تھا۔ نہ آنٹی صادقہ' نہ میڈم نادرہ نہ عشرت اور نہ گرفتاری کا خوف۔ لیکن اس وقت ایک معصوم سے چہرے نے روک لیا۔ یہ چہرہ میرے تصور میں آیا اور اس نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ یہ میرے پانچ سالہ بھتیجے شعیب کا چہرہ تھا۔ وہ نمناک آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"پھوپھو میری ماں پر ترس کھاؤ۔ اگر تم نے میری ماں پر ترس نہ کھایا تو میں بھی دربدر ہو جاؤں گا۔ میرا آشیانہ بکھر جائے گا۔ وہ تنکے بکھر جائیں گے جن پر میری اور تمہارے پیار کی نشانیاں ثبت ہیں۔ کیا تم مجھے رلانا چاہتی ہو۔ مجھے' پنکی اور گڈو کو گلیوں میں بھٹکانا چاہتی ہو۔ ایک مدت سے تم نے ہمیں کوئی ٹافی لا کر نہیں دی۔ کوئی کہانی نہیں سنائی۔ ان ساری کہانیوں اور ٹافیوں کے بدلے جو تمہاری طرف رہ گئی ہیں اور ان ساری کہانیوں اور ٹافیوں کے بدلے جو تمہاری طرف رہ جائیں گی' میری یہ چھوٹی سی بات مان لو۔ اس ظالم عورت کو معاف کر دو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میری ماں کو بھی........."

یکایک میری ٹانگوں کی طاقت زائل ہو گئی۔ میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ میڈم نادرہ نے مجھے رکتے دیکھا تو اور زور سے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ آنٹی صادقہ نے بھی آ کر مجھے تھام لیا۔ اتنے میں عشرت کے کمرے سے اس کی آواز آنے لگی۔ وہ پکار کر پوچھ رہی تھی کہ کون ہے اور یہ شور کیا ہے۔ آنٹی صادقہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بات نہیں پڑوس سے آواز آئی ہو گی۔ پھر وہ مجھے کندھوں سے تھام کر اندر لے جانے لگی۔ میں نے نیچے گری ہوئی نادرہ کو دیکھا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "میڈم تم عورت نہیں ایک ڈائن ہو۔ تم نے میرے معصوم فرحان کو کھایا ہے۔ تمہاری گردن پر عابد اور فرخندہ کے خون کے چھینٹے ہیں۔ میں تم سے انتقام لوں گی۔ مگر اس وقت ثمینہ کے معصوم بچوں کے

صدقے میں تجھے معاف کرتی ہوں۔" آنٹی صادقہ مجھے دھکیلتے ہوئے اندر لے گئی اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر گئی۔ میں کسی بے جان شے کی طرح مسہری پر لڑھک گئی اور چہرہ بازوؤں میں چھپا کر اپنی جلتی آنکھوں سے آنسو ٹپکانے کی ناکام کوشش کرنے گی.......... آدھ پون گھنٹے بعد آنٹی صادقہ واپس آئی۔ وہ میڈم نادرہ کو رخصت کر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک اندیشوں کے گہرے سائے تھے.......... اس رات دیر تک وہ میرے پاس بیٹھی رہی اور اس کہانی کی گرہیں کھولتی رہی جس نے برسوں سے اسے اور نادرہ کی دونوں بیٹیوں کو جکڑ رکھا تھا۔ اس کہانی کا کچھ حصہ عشرت بھی مجھے سنا چکی تھی۔ آنٹی صادقہ نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب میڈم نادرہ اور آنٹی صادقہ، لڑکپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھیں۔ دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ میڈم نادرہ کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ جبکہ صادقہ ایک ہیڈ کلرک کی بیٹی تھی اور یہ لوگ بمشکل سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔ دونوں سہیلیاں خوبصورت تھیں۔ خوش گفتار اور چنچل تھیں۔ ان کی زندگی امنگ ترنگ کے ہر رنگ سے سجی ہوئی تھی۔ فارغ وقت میں وہ کالج کی لائبریری میں بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں من پسند کتابوں سے دل بہلاتیں۔ دونوں ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ندیم شیرانی کی بہت دلدادہ تھیں۔ انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کی تحریریں پڑھیں تھیں اور اسے اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ تھا بھی ایک خوش شکل اور خوبصورت نوجوان۔ چند مشاعروں میں نادرہ اور صادقہ اس سے آٹوگراف بھی لے چکی تھیں۔ پروگرام بنا کر انہوں نے ایک دفعہ ندیم شیرانی کو مال روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں گھیر لیا اور بہت دیر اس کا دماغ چاٹتی رہیں۔ یہ ملاقات بعد ازاں ملاقاتوں کے ایک سلسلے کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ وہ تینوں مختلف جگہوں پر ایک دوسرے سے ملتے رہے اور ایک دوسرے کو جانتے رہے۔ پھر ایک وقت ایسا آگیا جب نادرہ اور صادقہ نے آپس میں فیصلہ کرنا تھا کہ ان دونوں میں سے کس نے ندیم کے ساتھ آگے بڑھنا ہے اور کس نے یہیں سے واپس لوٹ جانا ہے۔ اس مرحلے میں صادقہ نے قربانی دی اور خاموشی کے ساتھ ان دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ندیم شیرانی سے محبت نہیں کرتی تھی۔ شاید اس کی محبت نادرہ سے زیادہ قدیم اور شدید تر تھی۔ مگر وہ ندیم شیرانی کو

سکھی اور خوشحال دیکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ خوشی اور خوشحالی کی اسے نادرہ سے ہی مل سکتی ہے۔ وہ مفلس شاعر کے گھر کو لاکھوں کے جہیز سے بھر سکتی تھی جبکہ صادقہ کے پاس ایک محبت بھرے دل اور ایک خالی دامن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ صادقہ کے راستہ بدلنے کے سات آٹھ ماہ بعد ہی ندیم شیرانی اور نادرہ کی شادی ہوگئی۔ نادرہ کے گھر والے شیرانی کو گھر داماد رکھنا چاہتے تھے لیکن اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال انہوں نے بڑے طمطراق سے نادرہ کو رخصت کیا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سا جہیز لے کر آئی اور اس کے والد نے ندیم شیرانی کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں بھی مدد دی۔ شادی کے بعد ایک سال تک تو ٹھیک رہا مگر پھر حالات بتدریج خراب ہونے لگے۔ ندیم شیرانی کی طبیعت میں خودداری تھی۔ مگر جو کچھ وہ اپنی سسرال کی طرف سے قبول کر چکا تھا وہ اس کے گلے کی ہڈی بن گیا تھا۔ نہ اگل سکتا تھا اور نہ نگل سکتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے نادرہ یا اس کے والدین کی طرف سے کوئی ایسی بات ہوجاتی تھی جس پر وہ پہروں کڑھتا رہتا تھا۔ آخر اپنی خودداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے خود کو سسرال کے ہر بوجھ سے آزاد کر لیا۔ کاروبار ختم کر کے ایک اخبار میں سب ایڈیٹر کی نوکری کر لی اور اپنی قوت بازو سے زندگی کی گاڑی کھینچنے لگا۔ نادرہ کو یہ تھرڈ کلاس زندگی کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ شروع ہی سے فیشن پرست تھی اور سوسائٹی کے حلقوں میں بن ٹھن کر گھومنا اس کی ہابی تھی۔ اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ندیم شیرانی نے شب و روز محنت کی یہاں تک کہ وہ اپنے پھیپھڑوں کو روگ لگا بیٹھا لیکن نادرہ پھر بھی "سکھی" نہ ہوئی۔ ان کے اختلافات دن بدن بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ طلاق تک نوبت آگئی۔ ان کی دو بچیاں بھی تھیں۔ وہ بچیاں اس کشمکش کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ عدالت کے بکھیڑے شروع ہوئے۔ آخر ایک روز یہ نتیجہ نکلا کہ نادرہ بچیوں کو باپ کے پاس چھوڑ کر اور علیحدگی کا پروانہ لے کر والدین کے گھر پہنچ گئی.......... اگلے دو تین ماہ میں ندیم شیرانی کی حالت مزید خراب ہوگئی اور وہ رات دن خون تھوکنے لگا۔ کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔ بڑی بچی ثمینہ کی عمر اس وقت چھ سال اور چھوٹی زرینہ کی چار سال تھی۔ باپ ان کا واحد سہارا تھا اور وہ بھی موت کی دہلیز پر تھا۔ ایسے وقت میں بدنصیب شاعر کی وہ دوسری پرستار آگے بڑھی جو ایک روز چپکے سے اپنا راستہ الگ کر گئی تھی اور جس نے اپنی پرخلوص چاہت کو سیپ کے موتی

کی طرح چھپا کر گہرے تاریک پانیوں میں اتار دیا تھا.......... یعنی صادقہ.......... وہ اب ایم اے کر چکی تھی اور گارمنٹس ڈیزائننگ کے ایک کورس کے بعد برسر روزگار تھی۔ اس کی والدہ ایک جگہ اس کی شادی کی بات بھی چلا رہی تھی اور توقع تھی کہ جلد ہی رشتہ طے ہو جائے گا۔ لیکن اس موقعے پر صادقہ نے اپنی مخلص اور بے لوث محبت کے لئے پھر ایک یادگار قربانی دی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ ایک روز ندیم شیرانی کے محلے داروں نے دیکھا کہ خون اگلتے اور دم توڑتے شاعر کے گھر میں ایک سنجیدہ صورت لڑکی جھاڑو دے رہی ہے اور اس کی بچیوں کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ جس چار دیواری کے پاس سے گزرنا لوگ پسند نہیں کرتے وہاں ایک صحت مند خوب رو لڑکی کا کیا کام ہے۔ کسی نے کہا یہ ندیم شیرانی کی کوئی عزیزہ ہے۔ کسی نے کہا رائٹرز گلڈز والوں نے نرس بھیجی ہے۔ کسی نے کہا یہ شیرانی کا کوئی پرانا چکر ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بہرحال صادقہ تن دہی سے اپنے کام میں لگی رہی۔ اس نے ندیم شیرانی کے آخری دنوں کو بہت سہل بنا دیا۔ صادقہ کے آنے کے پندرہ بیس روز بعد ہڈیوں کے ڈھانچے سے زندگی کی آخری رمق بھی رخصت ہو گئی۔ ندیم شیرانی کی موت کے گیارہویں روز صادقہ نے اس کی دونوں بچیوں کو لیا اور حیدر آباد چھوڑ کر خاموشی سے کراچی روانہ ہو گئی۔ یہاں اس نے کرایے کا مکان لیا اور ایک جگہ ملازمت کر کے اپنا اور بچیوں کا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے اب ندیم کی بچیاں ہی جینے کا سہارا تھیں۔ دو ڈھائی برس اسی طرح گزر گئے۔ صادقہ کو نادرہ اور اس کے گھر والوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں' کیا کرتے ہیں۔ وہ حیدر آباد میں اپنا آبائی مکان چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو چکے تھے۔ ایک روز نادرہ نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتی اور کھوج لگاتی ہوئی کراچی میں صادقہ کے گھر آ پہنچی۔ اس کا حسن اب پہلے سے زیادہ نکھر آیا تھا۔ اور وہ بڑے امیرانہ لباس میں تھی۔ اپنی بچیوں کو دیکھنے کی خواہش اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ صادقہ کو پتہ چلا کہ نادرہ دوسری شادی کر چکی ہے اور جھنگ میں اپنے زمیندار شوہر کے ساتھ ٹھاٹ کی زندگی گزار رہی ہے نادرہ کے والدین نے یہ دوسری شادی کرتے ہوئے نادرہ کو کنوارہ ظاہر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بچیوں سے ملنے کے لئے بہت چھپ چھپا کر یہاں تک پہنچی تھی.......... اس کے بعد ماں بیٹیوں کے ملاپ کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ نادرہ تین چار ماہ بعد

نہایت خاموشی سے کراچی آتی اور بچیوں سے ملنے صادقہ کے گھر پہنچ جاتی۔ تاہم بچیوں کو اس بارے میں بالکل نہیں بتایا گیا کہ گاہے بگاہے ان کے گھر آنے والی اور ان کے لئے تحفے تحائف لانے والی عورت درحقیقت ان کی ماں ہے۔ وہ اسے اپنی ماں کی کوئی عزیز سہیلی سمجھتی تھیں.......... اور یہ بے خبری کئی سال گزرنے کے باوجود آج تک قائم تھی۔
اسی دوران وہ واقعہ رونما ہو گیا جس میں عشرت (زرینہ) اشرف نامی نوجوان کے فریب کا شکار ہو کر غلط کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ نہ صرف وہ اپنی عزت گنوا بیٹھی بلکہ اس کی قابل اعتراض تصاویر ایک خطرناک شخص کے قبضے میں آ گئیں۔ سالار نامی وہ شخص بڑی مہارت کے ساتھ عشرت کی نفسیات سے کھیلا اور بالآخر اسے بے بس کر کے گناہوں کی دنیا میں کھینچ لے گیا۔

اس واقعے کے دو تین سال بعد ہی میڈم نادرہ کی اپنے دوسرے شوہر سے بھی علیحدگی ہو گئی اور وہ لاہور میں اپنے بھائی کے گھر آ بیٹھی۔ اس نے اپنا حق مہر بذریعہ عدالت حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے پاس کافی رقم تھی۔ اس نے اپنا ایک انگلش میڈیم اسکول کھول لیا اور فارغ البالی کے دن گزارنے لگی۔ بظاہر اسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی لیکن اندر ہی اندر ایک روگ بھی لگا ہوا تھا۔ اپنی گمشدہ بیٹی کا روگ۔ اس کا کھوج لگانے کے لئے اس نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ مگر ناکام ہوئی تھی۔
آخر ساڑھے چھ برس بعد آج اسے اپنی بیٹی کا پتہ چلا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ وہ سرتاپا دکھ اور اذیت کے پسینے میں ڈوب گئی تھی۔ جس بیٹی کی صورت دیکھنے کے لئے وہ دن رات ترسی تھی اور جسے دور دور تک تلاش کراتی رہی تھی۔ وہ اسی شہر کی ایک "غلیظ" بستی میں موجود رہی تھی اور اپنے گھائل جسم پر ذلت کے عذاب جھیلتی رہی تھی.......... شاید یہ میڈم نادرہ کے لئے صلہ تھا ان تمام زیادتیوں اور ناانصافیوں کا جو اس نے کسی دوسرے کی بیٹی سے روا رکھی تھیں۔ قدرت کا یہ انتقام کتنا واضح اور دوٹوک تھا۔ میڈم نادرہ کے رویے نے مجھے ذلیل و خوار کر کے جس بستی تک پہنچایا تھا اس کی اپنی بیٹی بھی اسی بستی سے برآمد ہوئی تھی اور اس حالت میں کہ اس بیچاری کے دامن میں پچھتاوے اور موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔
پوری روئیداد سنانے کے بعد آنٹی صادقہ نے ایک بار پھر مجھ سے درخواست کی کہ

یہ راز ہمیشہ کے لئے میرے سینے میں دفن ہو جائے ورنہ وہ تینوں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ انہوں نے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ ایک دوماہ تک وہ شہر چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں جا کر آباد ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کوئٹہ کے قریب نوشکی چلی جائیں۔ وہاں ان کا ایک منہ بولا بھائی رہتا ہے۔ آنٹی صادقہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عشرت کا سایہ بھی بھابی ثمینہ اور اس کی زندگی پر ڈالنا نہیں چاہتی۔

اگلے روز کا واقعہ ہے۔ نو بجے کے قریب آنٹی صادقہ دکان پر چلی گئیں تو میں عشرت کے پاس آبیٹھی اور اس کی دلجوئی کی باتیں کرنے لگی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد عشرت نے شکایت کی کہ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا ہے۔ میں نے اس کو زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اس نے کہا گلوکوز پینے کو دل چاہتا ہے۔ جس ادھیڑ عمر ملازمہ مختار کا میں نے ذکر کیا ہے وہ باورچی خانہ دھونے میں مصروف تھی۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور برقعہ ڈال کر خود ہی گلوکوز لینے چلی گئی۔ جنرل اسٹور زیادہ دور نہیں تھا۔ کافی بھرا پرا بازار تھا۔ میں گھر سے قریباً ایک فرلانگ آگے آئی ہوں گی کہ بازار میں ٹریفک جام نظر آئی سب سے آگے ایک اینٹوں والا ٹرک اور سریے سے لدی ہوئی بیل گاڑی سر جوڑے کھڑے تھے اور ان کے پیچھے دونوں طرف کافی دور تک گاڑیوں رکشاؤں اور تانگوں وغیرہ کی دو قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ایسے مناظر ہماری سڑکوں پر عام دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن جس منظر نے مجھے چونکایا وہ ایک سرخ ٹویوٹا جیپ کا منظر تھا۔ میں دیکھتے ہی پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ چنگیزیوں کی جیپ تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے افراد بھی چنگیزیوں کے کارندے تھے۔ یہ جیپ بھی دوسری گاڑیوں کے ساتھ بڑی دھیمی رفتار سے آگے کو کھسک رہی تھی۔ جیپ کا دایاں اشارہ روشن تھا جس کا مطلب تھا وہ اسی گلی میں مڑے گی جس کے آخری سرے پر آنٹی صادقہ کا گھر ہے۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جگہ جگہ میری بو سونگھنے والے پالتو کتے تھوڑی ہی دیر بعد آنٹی صادقہ کے دروازے پر بھونکنے والے تھے۔ میں الٹے پاؤں واپس مڑی اور قریباً بھاگنے والے انداز میں دوبارہ گھر چلی گئی۔ میری بدلی ہوئی رنگت دیکھ کر ملازمہ مختار نے پوچھا "کیا ہوا بیٹی؟"

میں نے کہا "اماں' وہ چنگیزیوں کے بندے پھر یہاں آ رہے ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔

آنٹی صادقہ کو میری طرف سے خدا حافظ کہہ دینا.......... اور ہاں برآمدے سے میری چارپائی اٹھا دو اور بستر لپیٹ کر کہیں چھپا دو اور چھت پر میرا دھلا ہوا جوڑا پڑا ہے۔ وہ بھی صندوق میں رکھ لو۔ میری کوئی نشانی یہاں نہیں رہنی چاہئے۔"

مختار کو مختلف ہدایات دیتی ہوئی میں عشرت کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ مسہری پر نیم دراز حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں اسے تشویش میں مبتلا کر رہی ہوں۔ بہرحال محتاط لفظوں میں نرمی کے ساتھ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ میرا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی اور میرے رکنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ میں جوتی پہن کر اور اپنا چھوٹا سا پرس لے کر اس سے رخصت ہونے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ میں نے جلدی سے مسہری پر بیٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے رخسار چومتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنا حوصلہ بلند رکھے۔ انشاء اللہ بہت جلدی وہ ٹھیک ہو گی اور ہم دوبارہ ملیں گے۔

عشرت نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ میرے گلے سے لگی سسکتی رہی اور اسی حالت میں کہنے لگی.......... "شاہدہ' بابری.......... تمہیں بہت چاہتا ہے.......... تمہارے حالات سنبھل جائیں.......... تو اس سے.......... شادی کر لینا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا.........." یہاں تک کہہ کر چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے میری طرف سے جواب کی توقع کر رہی ہو' پھر اوپر تلے کئی ہچکیاں لے کر بولی "اور ہاں.......... جب کبھی وہ تمہیں ملے تو اس سے کہنا کہ مجھے معاف کر دے.......... میں نے اپنی نادانیوں سے اسے بہت ستایا ہے۔ میں اس قابل نہیں تھی.......... کہ میرا سایہ بھی اس پر پڑتا۔"

میں نے کہا "دیکھو ایسی بے معنی باتیں کر کے خود کو دکھ مت پہنچاؤ۔ تمہاری توجہ صرف اپنی صحت پر ہونی چاہئے.........."

یکایک بیرونی گیٹ کے پاس کسی گاڑی کا وزنی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی کال بیل گونج اٹھی۔ میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"عشرت! وہ لوگ آ گئے ہیں۔ میں اب چلتی ہوں۔"

عشرت سے رخصت ہو کر میں کمرے سے باہر نکلی اور عقبی دروازے سے نکل کر گلی میں آگئی۔

تھوڑی دور آکر مجھے ایک خالی رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر میں بادامی باغ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں سے مجھے بس پکڑ کر ایک بار پھر جھنگ کا رخ کرنا تھا۔ اپنے پروگرام کے مطابق میں آنٹی صادقہ کے گھر سے کل نکلنا چاہتی تھی' مگر چنگیزیوں کی آمد کے سبب فوری طور پر گھر چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ اب مجھے ایک رات کہیں نہ کہیں گزارنا تھی۔ لاہور میں یا جھنگ میں۔ تاکہ جمعرات کے روز "بڑی حویلی" پہنچ سکوں' اور بھک منگوں کی اس قطار میں شریک ہو سکوں جنہیں وہاب چنگیزی اپنے ہاتھوں سے نوازتا تھا۔ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ایک نامعلوم کشش مجھے وہاب کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی۔ وہاب کو جہنم واصل کرنے کے سوا میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف' ہوا میں فضا میں اور درودیوار میں وہاب ہی وہاب نظر آتا تھا۔ میں ایک چیونٹی تھی مگر میرے دل میں ایک ہاتھی کو ہلاک کرنے کا عزم تھا اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں کامیاب ہوں گی کیونکہ میرے ساتھ میرے پیاروں کی آخری سانسیں سفر کر رہی تھیں ان کی بے گناہی کا احساس میرے وجود کو ناقابل شکست ہمت عطا کر رہا تھا۔ حالات نے' معاشرے نے اور قانون نے مجھے وہاب کے مقابل تنہا چھوڑ دیا تھا۔ مگر تنہا ہو کر بھی میں تنہا نہیں تھی۔ جیسے شدید گھٹن کے بعد آندھی آتی ہے۔ ایسے ہی بے بسی کی انتہا نے مجھے لامتناہی اختیار کی پہلی سیڑھی پر لاکھڑا کیا تھا۔ اب دیکھنے کو میں تنہا تھی مگر میرے ساتھ منہ زور جذبوں کا ایک سیل رواں چل رہا تھا۔ یہ کچھ مجھے ہی معلوم تھا کہ ان منہ زور جذبوں کو لگام ڈال کر میں نے آنٹی صادقہ کے گھر یہ چند دن کیسے گزارے تھے۔ میں ساری ساری رات جاگی تھی اور ہر ہر پل اس "جمعرات" کا انتظار کیا تھا جو مجھے ایک بار پھر وہاب کے روبرو کر سکتی تھی۔ اپنے تیز دھار آلے کے ساتھ اس کی منحوس گردن تک پہنچنے کا موقع دے سکتی تھی۔ یہ وہی تیز دھار آلہ تھا جس سے میں نے حویلی میں پہریدار جان مسیح کی گردن پر وار کیا تھا۔ بعد ازاں باجو اور طفیلے نے میری بیہوشی کے دوران یہ آلہ (استرا) میرے لباس سے نکال کر کمرے کے روشندان میں پھینک دیا تھا۔ ایک روز کھڑکی کی گرل کاٹتے ہوئے سونگی کو لکڑی کے ایک ٹکڑے کی ضرورت پڑی۔ لکڑی

ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ اس روشندان تک جا پہنچا جہاں یہ استرا پڑا تھا۔ یوں استرا ایک بار پھر میری دسترس میں آگیا۔

رکشہ مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا بادامی باغ بس اڈے پر پہنچ گیا۔ میں جھنگ جانے والی بس کے انتظار میں ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ موسم اب کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ دھوپ میں کھڑے ہونے سے گرمی لگتی تھی۔ سائے کے لالچ میں میں ایک پانوں سگریٹوں کے کھوکھے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میں ہر چیز کو "طائرانہ" نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ یہی وہی نگاہ تھی جو پھانسی پانے والا تختہ دار کی طرف جاتے ہوئے قرب و جوار پر ڈالتا ہے۔ وہ آگاہ ہوتا ہے کہ ان مناظر کو' اس زمین کو اور اس نیلے آسمان کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ میں بھی موت کی مسافر تھی۔ اس ظلم کی جاگیر سے میرے زندہ لوٹنے کا امکان بہت کم تھا۔

اپنے کان کے قریب مجھے ایک سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ "کوئی خدمت ہو تو بتاؤ جناب۔" میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک شخص جو ابھی کھوکھے کے عقب سے نکلا تھا بظاہر لاتعلقی سے میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ ڈبی دار شلوار قمیض گلے میں بڑا سا تعویذ۔ اس کا حلیہ ہرگز شریفانہ نہیں تھا۔ جی چاہا گھوم کر ایسا تھپڑ اس کے منہ پر ماروں کہ دور تک آواز جائے' لیکن اس خواہش کو عملی جامہ پہنانا مشکل تھا۔ مجمع لگا کر میں کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ میری خاموشی دیکھ کر اس شخص کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔ چند انچ میری طرف کھسک آیا اور بولا "دیکھو' ناراض نہ ہو جانا۔ اس طرح تمہارا یہاں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔ وہ سامنے میری ویگن کھڑی ہے۔ جہاں جانا ہے میں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں کسی بس سے اتری ہوں۔ میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے کہا "تم اپنا کام کرو' مجھے معلوم ہے میں نے کہاں جانا ہے اور کس پر جانا ہے۔" جواب میں اس نے ایک فحش سی مسکراہٹ کے ساتھ ایسا جملہ کہا کہ میں خود پر بالکل قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے اسے سخت لہجے میں دفع ہو جانے کے لئے کہا میری بلند آواز سن کر اور بھی کئی افراد ہماری طرف دیکھنے لگے۔ کچھ چہروں پر مسکراہٹ اور کچھ پر لاتعلقی نظر آئی۔ وہ شخص تو مجھے گھورتا ہوا واپس چلا گیا لیکن اب اور بہت سی آنکھیں میرے چاروں طرف گردش کرنے لگی تھیں۔ ان آنکھوں کے مالک زیادہ تر ڈرائیور اور کنڈیکٹر

تھے۔ میں نے اخباروں میں کئی دفعہ پڑھا تھا کہ اکیلی عورتوں کو اسٹیشن اور بس اڈے پر مشکلات پیش آتی ہیں لیکن تجربہ پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ میرے ہی وطن عزیز کا کوئی حصہ ہے۔ یوں لگتا تھا میں کسی جنگل میں آگئی ہوں اور درختوں کی اوٹ سے خون آشام جانور مجھے گھور رہے ہیں۔ شکر تھا کہ یہ دن کا وقت تھا اور اڈے پر رونق تھی۔ رات ہوتی اور یہ گہما گہمی نہ ہوتی تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس صورت حال کا ایک سبب میرا برقعہ بھی ہے۔ یہ وہی برقعہ تھا جسے پہن کر عشرت اپنے "دوزخ" سے نکلی تھی۔ برقعے کی تراش خراش مجھے قطعاً پسند نہیں تھی۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں میں نے اسے پہنا تھا۔ مشکل میں گرفتار ہو کر یہ احساس ہوا تھا کہ "بے وقار پردے" سے باوقار بے پردگی کہیں بہتر ہوتی ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی چادر ہی میں نے سلیقے سے اوڑھ رکھی ہوتی تو اس بے ڈھنگے برقعے سے کہیں زیادہ تحفظ مجھے فراہم کرتی۔ خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ مطلوبہ بس جلد آجائے اور میں اس میں بیٹھ جاؤں۔ چار پانچ منٹ گزرے تھے کہ ایک ڈنڈا بردار سنتری مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ سنتری نے قریب آکر اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بی بی! کہاں جانا ہے تجھے۔ کہاں سے آئی ہو؟"

پہلے تو میرے دل میں آئی کہ اس خدائی فوجدار کو کوئی جواب نہ دوں۔ مگر میں بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے محتاط لہجے میں بتایا کہ مجھے فوری طور پر جھنگ جانا پڑ گیا ہے۔ بس کے انتظار میں یہاں کھڑی ہوں۔ میرے جوابات سے اس نے رائے قائم کی کہ میں خوفزدہ ہوں اور وہ مجھ پر رعب گانٹھ سکتا ہے کہنے لگا۔

"میرے ساتھ چلو۔ تمہیں بڑے تھانیدار صاحب بلا رہے ہیں۔"

"کہاں ہیں بڑے تھانیدار؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی لال گاڑی کے پیچھے۔" سنتری کا لہجہ رعب دار تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ بہت سی تماشائی نظریں ہم پر لگی ہیں اور اس جگہ تماشا بننا ٹھیک نہیں۔ میں خاموشی سے سنتری کے ساتھ چل دی۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جیسے مجھے ڈنڈے سے ہانک کر لا رہا ہو۔ میں بہت سبکی محسوس کر رہی

تھی مگر بگڑے ہوئے حالات کو مزید بگاڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ایک کچے راستے سے گزار کر وہ مجھے ایک پیلی بلڈنگ کے پچھواڑے لے آیا۔ یہاں ایک کمرے میں موٹی توند اور چربی دار جبڑوں والا ایک سب انسپکٹر پھیل کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دو نو عمر لڑکے اور ایک پندرہ سالہ لڑکی بھی مجرموں کی طرح بینچ پر بیٹھے تھے۔ سب انسپکٹر نے کڑی نظروں سے مجھے سر تاپا گھورا اور ایک اسٹول پر بیٹھنے کو کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے کھردرے پن سے پوچھا۔

میں نے ایک فرضی نام بتایا۔ سب انسپکٹر نے مزید سوال جواب شروع کر دیئے۔ اس کے طرز گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سمجھ رہا ہے۔ دونوں نو عمر لڑکے اور لڑکی بھی اسی الزام میں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ غالباً اڈے پر آوارہ گردی کرنے والوں کے خلاف کوئی مہم شروع کی گئی تھی۔ سب انسپکٹر کے لہجے میں تحکم اور آنکھوں میں بے باک چمک تھی۔ مجھے وہ بڑا کرخت شخص لگا۔ خاص طور پر وہ جو زبان استعمال کر رہا تھا وہ کسی طور بھی قانون کے محافظ کے شایان شان نہیں تھی۔ اتنے میں شلوار قمیض والا وہی شخص نظر آیا جو اسٹاپ پر مجھ سے ہمکلام ہوا تھا۔ اندر آکر وہ بے تکلفی سے سب انسپکٹر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ وہ بھی سادے لباس میں پولیس والا ہی تھا۔ مجھ سے اس کی چھیڑ چھاڑ دراصل تفتیش کے زمرے میں آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا اڈے پر پولیس والوں نے مشکوک افراد کے لئے جال بچھا رکھا ہے۔ میری بے خبری مجھے اس جال میں لے آئی تھی اور اب میں خود کو بری طرح پھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ سب انسپکٹر اور اے ایس آئی تو مجھے نہیں پہچان پائے تھے اور میں ان کے نزدیک صرف مشکوک لڑکی تھی لیکن عین ممکن تھا کہ ابھی کوئی آنکھ مجھے مفرور قاتلہ کے طور پر پہچان لے۔ میں نے سوچا مجھے جلدی کسی نہ کسی طرح ان لوگوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہئے۔ مگر کیسے؟ میری گھبراہٹ مجھے سب انسپکٹر کی نظروں میں مشکوک تر کر رہی تھی۔ وہ مجھے گھورتا ہوا خالص "پولیس والے انداز" میں اے ایس آئی سے بولا۔

"رمضان علی۔ کوئی زنانی بلا کر اس کی جامہ تلاشی تو لو۔ مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرے لباس میں چھپا ہوا آلہ تفتیش کا رخ کسی خطرناک سمت بھی موڑ سکتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں نواز حسنی کا خیال آیا۔ نواز

حسنی کے آفس کا نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ میں ایک کال کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے تمسخر سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کال کر کے تم کون سی توپ چلا لو گی۔ بہرحال میرے اصرار پر اس نے ٹیلی فون میری طرف بڑھادیا۔ میں نے نواز حسنی کے دفتر کا نمبر ڈائل کیا۔ پرسنل سیکرٹری نے اٹھایا۔ خوش قسمتی سے نواز حسنی سے بات ہو گئی۔ میری آواز سنتے ہی وہ تقریباً چیخ پڑے۔

"شاہدہ۔ کہاں سے بول رہی ہو تم؟ تمہاری تلاش میں تو ہم نے زمین آسمان ایک کر رکھا ہے۔"

میں نے انہیں اپنے ٹھکانے سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ کرائمز برانچ کا ایک سب انسپکٹر مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انڈر سیکرٹری نواز حسنی سیخ پا ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سب انسپکٹر کو ریسیور دو۔ میں نے ریسیور سب انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بڑی شان سے ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ آواز سنتے ہی بدک کر رہ گیا۔ جلدی سے کرسی پر اٹین شین ہو گیا اور ہکلا ہو کر بولا۔ "جی.......... جی جناب۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں جناب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ویری سوری سر.........."

بات ختم کرنے کے بعد سب انسپکٹر نے ریسیور دوبارہ مجھے تھما دیا اور خود ایک طرف مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ نواز حسنی صاحب نے کہا۔

"مس ثناء! میں نے سب انسپکٹر کو سمجھا دیا ہے تم یہیں رکو۔ ابھی دس منٹ میں میرا آدمی تمہیں لینے کے لئے پہنچ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے سر۔ میں انتظار کرتی ہوں۔"

جونہی سلسلہ منقطع ہوا سب انسپکٹر نے مجھے بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی اور معذرت وغیرہ کرنے لگا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہی طرح کی ہلچل تھی۔ سب انسپکٹر سے تو جان چھوٹ گئی تھی' کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ نواز حسنی کا آدمی پہنچنے سے پہلے ہی میں یہاں سے نکل جاتی۔ مجھے اب نواز حسنی' خان رحیمی یا چوہدری شہاب کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری منزل صرف اور صرف بڑی حویلی تھی۔ کسی دوسرے معاملے میں پڑ کر میں اپنی منزل کھوٹی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہاں سے نکلنے کے لئے کیا بہانہ تراشوں۔ پھر دل میں آئی کہ ایک دفعہ نواز حسنی سے مل ہی لوں۔ شاید کسی نئی بات کا پتہ

چل جائے۔ اسی کشمکش میں تھی کہ کمرے سے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ نواز حسنی کی بھیجی ہوئی گاڑی آگئی ہے اب ساتھ جانے کے سوا اور چارہ نہیں تھا۔ نواز حسنی نے ڈرائیور کے علاوہ اپنا اسسٹنٹ بھیجا تھا۔ ساتھ میں ڈینو بھی تھا۔ میں ڈینو کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ پر گلابی اردو کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ بتا رہا تھا کہ پچھلے دنوں مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا جاتا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نواز حسنی کی کوٹھی میں اس وقت خان رحیمی بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بوڑھی عورت بھی کل رات سے آئی ہوئی ہے اور وہ ہر صورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ڈینو نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ عورت سلیم کی ماں ہے۔ (یاد رہے کہ ڈینو بھی اب میرے اور سلیم کے اصلی ناموں سے آگاہ ہو چکا تھا) میں پریشانی کے عالم میں سوچنے لگی کہ سلیم کی ماں کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ سلیم سے میری آخری ملاقات نواں کوٹ والے مکان میں ہوئی تھی۔ جب آدھی رات کو اس نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور دروازہ نہ کھولنے پر مجھے گالیاں دیتا ہوا چلا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اب ڈینو کی زبانی اس کی ماں کا سن کر حیران ہونا یقینی تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد نواز حسنی کی بھیجی ہوئی گاڑی مجھے ان کی کوٹھی کے سامنے اتار رہی تھی۔ یہ وہ کوٹھی نہیں تھی جس میں میں نے رئیس احمد کو نواز حسنی صاحب کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھا تھا اور جہاں سے اختر زماں کو دیکھ کر میں بھاگ نکلی تھی۔ یہ شہر کے مشرقی علاقے میں کینٹ کے پاس ایک اور بنگلہ نما کوٹھی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی میری آمد کی خبر یہاں پہنچ چکی تھی۔ دروازے پر ہی خان رحیمی نے اپنے خطرناک برنارڈ کتوں کے ہمراہ میرا استقبال کیا۔ اس کے اردگرد محافظ موجود تھے۔ وہ خود بھی مسلح اور چوکس نظر آتا تھا۔ خان رحیمی کو ایسے الرٹ موڈ میں میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ تھے' لہٰذا لمبی چوڑی داستانیں سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ خان رحیمی مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے آیا۔ اس نے میرے بھائی اور اس کے اہل خانہ کی موت پر تعزیت کی اور اس بات سے سو فیصد اتفاق کیا کہ یہ کوئی عام واردات نہیں اور اس المناک واقعے کے ذمے دار صرف اور صرف چنگیزی ہیں۔ خان رحیمی نے بتایا کہ وہ اور نواز حسنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ وہاب چنگیزی کو کیفر کردار تک پہنچایا جا

سکے۔ انہوں نے ملک کے ایک چوٹی کے وکیل کی خدمات حاصل کی ہیں اور وہاب کے خلاف مقدمات کی ہر طرح پیروی کر رہے ہیں۔ خان رحیمی نے کہا کہ اگر پیر قادر کی بھاری بھرکم سیاسی شخصیت بیچ میں نہ کود پڑتی تو اب تک وہاب سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ اچانک مجھے اس عورت کا خیال آیا جسے سلیم کی ماں بتایا جا رہا تھا۔ میں نے دینو سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

دینو نے کہا "او تے جی کملی عورت ہے۔ آپ کو لبھنے (ڈھونڈنے) نکلی ہوئی ہے۔ ہم نے کہا تھا اماں جی ہم سارے جو لبھ رہے ہیں تو آپ کو لبھنے کی کیا لوڑ ہے کہنے لگی۔ نہیں پتر۔ مجھے بھی جنجل خراب ہونے دو۔ کیا پتہ سوہنے رب کو کس کی حالت پر ترس آجائے۔"

میں سوچ میں ڈوب گئی۔ آخر اس عورت کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ نہ اس نے کبھی مجھے دیکھا تھا اور نہ میں نے۔

میں اس کا ذکر بھی پہلی مرتبہ سن رہی تھی میں نے خان رحیمی سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"وہ بتاتی کچھ نہیں۔ بس کہتی تھی کہ میرا اس لڑکی سے ملنا بہت ضروری ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں پہنچی ہے۔ ویری سٹرینج وومن۔"

میں نے سوچا وہ سلیم کے بارے مجھ سے کچھ جاننا چاہتی ہے لیکن سلیم کا تو مجھے بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ شام ہونے والی تھی۔ کچھ دیر بعد نواز حسنی بھی گھر پہنچ گئے۔ ارسہ ان کے ساتھ ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور وہ لپک کر میرے گلے سے جھول گئی۔ نواز حسنی صاحب مجھے بے حد احسان مندی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میرا کندھا تھپکا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ثناء! یہ اب تمہاری نہیں' ہم سب کی جنگ ہے۔ ہم سب مل کر چنگیزی خانوادے سے لڑیں گے تمہارے عزیزوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ انصاف کی چکی بہت دیر سے پیستی ہے لیکن بہت باریک پیستی ہے۔"

ارسہ کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ اس کا بھائی اب تک اسپتال میں زیر علاج ہے اور کل اس کے پتے کا ایک اور آپریشن ہونا ہے۔ ارسہ اور اس کے پاپا اسپتال سے ہی آ رہے

تھے۔ جہاں تک عشرت کا تعلق تھا خان رحیمی اور نواز حسنی سمیت کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کن ہاتھوں سے ہوتی ہوئی کس آنگن تک جا پہنچی ہے اور کس حال میں ہے۔ میں نے بھی یہ سب کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

رات کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ کھانے کے دوران ہی گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ خان رحیمی کا دھیان سلیم کی والدہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ عورت ابھی تک نہیں لوٹی۔

نواز حسنی صاحب نے کہا "اسے جانے ہی نہیں دینا تھا۔ لاہور جیسے بڑے شہر میں اجنبی خود تو گم ہو سکتا ہے کسی گم شدہ کو ڈھونڈ نہیں سکتا۔" کھانے کے بعد میں کچھ دیر ارسہ کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی پھر ارسہ مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر خود اپنے پاپا کے پاس سٹڈی روم میں چلی گئی۔ مجھے بستر پر لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا دینو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ کھڑا تھا کہنے لگا۔

"یہ جی سلیم کی والدہ ہیں۔ آپ سے ملنا چاہوندی ہیں۔"

میں نے دیکھا بوڑھی عورت کے چہرے پر حزن و ملال کی زردی تھی۔ وہ بہت تھکی تھکی اور نڈھال نظر آتی تھی۔ اس کے چاندی بال بھیگ کر گردن اور پیشانی سے چپٹے ہوئے تھے۔ کپڑے بھی بارش سے تر تھے۔ وہ ابھی ابھی باہر سے لوٹی تھی کچھ دیر تک ٹک میرا چہرہ دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی شناسائی نظر آئی۔

میں نے اخلاقاً ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا "آیئے تشریف لایئے!" اس نے آگے بڑھ کر روایتی انداز میں میرے سر پر پیار دیا اور اندر آ گئی۔ دینو واپس چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے اسے کرسی پیش کی۔ وہ انکار کر کے میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ بالکل روبرو۔ اس کا چہرہ میرے چہرے سے چند انچ کی دوری پر تھا۔ شاید اس کی نظر کمزور تھی اور مجھے غور سے دیکھنا چاہتی تھی۔ در و دیوار بادلوں کی گرج سے گونج رہے تھے اور کھڑکیوں کے شیشوں پر بجلی کی چمک تھی۔ ایسے میں عورت کے دیکھنے کا انداز مجھے بڑا ڈرامائی اور خوابناک سا لگا۔ پھر میں نے دیکھا کہ عورت کی آنکھوں سے آنسو امڈے اور

پہلے سے بھیگے ہوئے رخساروں پر پھسلتے چلے گئے وہ رو رہی تھی بڑی خاموشی سے اور بڑے ٹھہراؤ سے۔ اس نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا۔

"بیٹی! میں تجھ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔"

"کہئے ماں جی۔ کیا چاہئے آپ کو؟"

"اپنے بیٹے کی زندگی۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

"آپ......... آپ کا مطلب ہے سلیم؟"

"ہاں میری بیٹی......... یہ دیکھو میری جھولی۔ اس جھولی کو خالی مت لوٹانا۔" دونوں ہاتھ کھول کر اس نے چادر میرے سامنے پھیلا دی۔" مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے اور مجھ سے کیا توقع کر رہی ہے۔

میں نے کہا "اماں جی' کیا بات ہے؟ وہ......... سلیم تو خیریت سے ہے نا؟"

بوڑھی عورت کچھ دیر تو سر اپنے کندھے سے ٹکائے روتی رہی پھر اس نے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ وہ خیریت سے نہیں ہے۔ عورت کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت لاہور ہی میں اپنے ایک شناسا کے گھر موجود ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ سوکھ کر ڈھانچہ ہو رہا ہے۔ رات دن بخار میں تپتا ہے لیکن دوا کے پاس نہیں جاتا۔ ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے دوا نہ کھائی تو حالت مزید بگڑ سکتی ہے۔ یہ سب کچھ بتا کر عورت نے دوپٹہ آنکھوں پر رکھا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ یہ ایک ماں کا رونا تھا۔ اس رونے کو سن کر میرا کلیجہ کانپ گیا۔ سلیم کی والدہ نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اور کہنے لگیں۔

"بیٹی! خدا کے بعد اس وقت مجھے صرف تمہارا آسرا ہے۔ صرف تم ہی میرے بیٹے کو بچا سکتی ہو......... میری بیٹی میرے سلیم کی زندگی میں آجاؤ اور ہم دونوں کو بے موت مرنے سے بچالو۔"

اب میں پوری طرح سمجھ رہی تھی کہ سلیم کی والدہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اس بات کا بھلا کیا جواب دیتی۔ میرے پاس تو اپنی زندگی بھی نہیں تھی میں کسی کی زندگی کیا بچاتی۔ زندگی کے نام پر یہ تھوڑی سی مہلت میرے پاس فرحان کی امانت تھی۔ جس میں مجھے اس کے قاتل تک پہنچنا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ اس تھوڑی سی مہلت میں کسی کی بیوی بننے کا تصور کیسے کر سکتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ سلیم کے بارے میں گداز سوچیں

رُکنے کے باوجود میں ان گھڑیوں میں سنگدل بن گئی تھی۔ میں نے سلیم کی والدہ کی گریہ زاری سے کان بند کر لئے اور صاف کہہ دیا کہ میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اپنے بچے کی موت کے بعد اب میں بھی مرنے کے لئے جگہ ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ میں اب عورت نہیں ہوں صرف ایک ماں ہوں اور میری جو سانسیں باقی رہ گئی ہیں وہ ماں کی سانسیں ہیں۔

سلیم کی والدہ کے چہرے پر درد و کرب کی گہری پرچھائیاں پھیل گئیں۔ تب انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس نے میری ہستی کی عمارت کو بنیادوں سے ہلا دیا اور میرے عقیدوں کی عظیم الشان دیواریں دھماکوں سے زمین بوس ہوگئیں۔ انہوں نے کہا۔

"دیکھو بیٹی! تم ایک ماں ہو اور میں بھی ایک ماں ہوں۔ تم اپنا بچہ کھو چکی ہو' لیکن میرا بچہ ابھی زندہ ہے۔ تمہارا بچہ واپس نہیں آسکتا لیکن میرا آسکتا ہے کیا ایک ماں اپنی ممتا کے صدقے دوسری ماں پر رحم نہیں کھائے گی۔ کیا وہ چاہے گی کہ کل ایک دوسری ماں بھی اس کی طرح اپنے بچے کو روتی پھرے؟"

میں پھٹی ہوئی نظروں سے سلیم کی والدہ کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔ کتنی سادہ لیکن سچی بات کی تھی اس غمزدہ عورت نے۔ اس نے میرا وار مجھ پر الٹا تھا اور ایک ہی لمحے میں مجھے نہتا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس طوفانی رات میں' اس گرجتے برستے موسم میں اور اس تنہا کمرے میں اس سیدھی سادھی ان پڑھ عورت نے میرے ہی لفظوں سے مجھے شکست فاش دے دی تھی۔ مجھے اپنی ممتا پر ناز تھا اور اس نے میری ممتا کو انکار کے نشانے پر رکھ کر میرے ہاتھوں سے "اختلاف کا ہتھیار" گرا دیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بیک وقت فرحان اور سلیم کے چہرے آئے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ دونوں چہرے ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہے ہیں۔ ان کے گڈ مڈ ہونے سے ایک بہت بڑا بھنور پیدا ہو رہا ہے میں اس بھنور میں اترتی چلی جا رہی ہوں۔ میں لڑکھڑا سی گئی اور جلدی سے مسہری پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بیٹی؟" سلیم کی والدہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اچھا......... اچھا میں چلی جاتی ہوں۔ چلی جاتی ہوں میں۔" انہوں نے بڑی پریشانی سے کہا اور رخ پھیر کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ ان کی چال سے دل شق کر دینے والی بیچارگی

جھلک رہی تھی۔

"رک جائیں ماں جی" میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اس گھڑی مجھے اپنی آواز بھی بہت اجنبی سی لگی۔

☆------------☆------------☆

بعد ازاں جو کچھ ہوا اس کا تصور میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ حالات کا تیز دھارا مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ نہایت خاموشی کے ساتھ ماں جی اور مجھ میں سب کچھ طے پا گیا۔ ماں جی نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو میری اور ان کی ملاقات کا پتہ چلے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں سلیم سے ایسے ملوں جیسے میں نے اپنی کوشش سے اسے تلاش کیا ہے۔ لہٰذا اگلے روز وہ خاموشی سے واپس چلی گئیں۔ انہوں نے مجھے سلیم کا مکمل ایڈریس دے دیا تھا۔ وہ اندرون شہر شیرانوالہ گیٹ میں اپنے ایک دوست کے پاس رہ رہا تھا۔ ماں جی کے جانے کے ایک دن بعد میں نے ایک مختصر رقعہ خان رحیمی کے نام تحریر کیا۔ اس رقعے میں میں نے خان رحیمی کو بتایا کہ مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں یہاں سے جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے لکھا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتی۔ اگر آپ میرا بھلا چاہتے ہیں تو براہ مہربانی مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ممکن ہے آپ کو اعتراض ہو کہ میں اپنے خلاف مقدمات کا سامنا کئے بغیر اور وہاب چنگیزی کے خلاف گواہیاں بھگتائے بغیر جا رہی ہوں۔ آپ کا اعتراض اپنی جگہ ٹھیک ہوگا تاہم میں سمجھتی ہوں کہ قانون کے دامن میں اب میرے لئے انصاف نام کی کوئی چیز نہیں بچی۔ وہاب چنگیزی کے خلاف قائم کئے جانے والے بے جان مقدمے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ شاید ہم سب خود کو طفل تسلیاں دے رہے ہیں اور مکمل پسپائی اختیار کرنے سے پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے ہیں۔"

یہ رقعہ خان رحیمی کے زیر مطالعہ کتاب میں رکھنے کے بعد میں نے ویٹو کو تیار کیا اور موقع ملتے ہی خاموشی کے ساتھ نواز حسنی کی رہائش گاہ سے نکل آئی۔

بذریعہ ٹیکسی ہم شیرانوالہ گیٹ پہنچے اور وہاں سے ڈھائی تین فرلانگ پیدل چل کر سلیم کے ٹھکانے پر آگئے۔ یہ ایک تین منزلہ مکان تھا۔ اس مکان کی زیریں منزل میں سلیم کا دوست رہتا تھا۔ اب شام ہو چکی تھی اور دکانوں مکانوں میں بتیاں جل چکی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ وہ گلی بڑا اداس منظر پیش کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے میں پرانے زمانے کے کسی الف لیلوی بازار میں آگئی ہوں۔ تاریک ڈیوڑھیاں اونچے مکان یکے بعد دیگرے روشن ہوتی ہوئی کھڑکیاں۔ دینو نے دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ اس نے شلوار کے اوپر جالی دار بنیان پہن رکھی تھی اور غالباً کھانا کھاتے ہوئے اٹھ کر آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہی سلیم کا دوست وحید شیروانی ہے۔ جب ہم نے بتایا کہ سلیم سے ملنا چاہتے ہیں تو شیروانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے بہت گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ پوچھنے لگا۔

"کہیں آپ........ میرا مطلب ہے آپ........ کہیں یعنی آپ........ ثناء محمود تو نہیں۔"

میں نے اعتماد سے کہا "ہاں' میں ثناء محمود ہی ہوں۔"

شیروانی کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ اس کی آنکھوں میں جوش اور خوشی سے ملے جلے جذبات نظر آئے۔ وہ اپنی شلوار کا آزار بند سنبھالتا ہوا جلدی سے باہر آگیا۔

"آپ........ آپ واقعی ثناء محمود ہیں۔ اوہ گاڈ........ بہت اچھا کیا آپ نے بہت ہی اچھا کیا۔ ایک سیکنڈ پلیز........ معافی چاہتا ہوں۔ میں ابھی حاضر ہوا۔"

وہ اپنے فربہ جسم کو پھرتی پر آمادہ کر کے جلدی سے اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد دوبارہ اس کی صورت نظر آئی۔ اب اس کے جسم پر ڈھنگ کا لباس تھا اور پاؤں میں چپل۔ "آیئے پلیز........ اندر آیئے" وہ ہمارے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے بولا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک بیٹھک نما کمرہ تھا۔ صوفوں پر جھالر دار غلاف' کڑھائی دار پردے۔ فرش پر دری' ٹی وی' فریج' سائیڈ بورڈ' بک شیلف' سب کچھ اسی ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ لجاجت سے بولا۔

"ثناء بہن! میں نہیں جانتا آپ کس لئے آئی ہیں۔ بہرحال آپ کا یہاں آنا ہی بہت بڑی بات ہے۔ خدا کرے آپ حالات کو ٹھیک کر لیں۔"

ایکا ایکی اس کے گول چمکدار چہرے پر اداسی کے بادل چھا گئے۔ کہنے لگا "سلیم کی حالت بہت پتلی ہے۔ ساری ساری رات چھوٹے سے کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ دوا تو اس نے کبھی کھائی ہی نہیں' پچھلے تین دن سے کھانا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ میں تو سمجھا سمجھا کر ہار گیا ہوں۔"

میں نے کہا "میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

شیروانی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے ساتھ لے کر وہ ایک دوسرے کمرے میں اندر سے گزرا اور ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ سلیم اندر ہے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور سلیم نے دروازہ کھولا۔ کمرہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر سلیم واپس مڑ گیا تھا۔ غالباً وہ میری دستک کو اہل خانہ میں سے کسی کی دستک سمجھا تھا۔

"سلیم" میں نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر کہا۔ سلیم نے بری طرح چونک کر اور گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی اور چہرہ رنج و غم کی تصویر تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس بت بنا میری طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس کے ہونٹ لرزے۔

"تم آگئی ہو ثناء؟"

یہ بڑا عجیب سا فقرہ تھا۔ بالکل ڈرامائی انداز کا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تم کہاں سے آئی ہو' کیسے آئی ہو' میرا پتہ کیسے چلا ہے تمہیں؟ بس یہی کہا تھا کہ تم آگئی ہو؟ جیسے وہ جانتا تھا کہ میں ضرور آؤں گی۔ کسی نہ کسی وجہ سے مجھے آنا ہی پڑے گا۔

"ہاں سلیم۔" میں نے کہا "میں آگئی ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے اور وہ بے دم سا ہو کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں جانتی تھی یہ زیادہ سنگین ناراضگی نہیں ہے لیکن اسے دور کرنا ضروری تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے سلیم۔ منہ کیوں پھیر لیا' میرا آنا اچھا نہیں لگا؟"

وہ برہمی سے بولا "اس تنہا کمرے میں میری پاس کیوں آئی ہو۔ میں ایک ناقابل بھروسہ شخص ہوں۔ میری نیت میں فتور آگیا تو کیا کرو گی؟"

میں جانتی تھی کہ وہ اس رات والے واقعے پر شکوہ کناں ہے جب میں نے اس کے بار بار پکارنے پر دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میں نے کہا "سلیم' جب میں سب کچھ بھول کر یہاں آگئی ہوں تو تم بھی سب کچھ بھول جاؤ۔ یہی ہم دونوں کے لئے بہتر ہے۔"

وہ اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ شاید اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ میرے ساتھ کیسا رویہ اپنائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر ہر پل جو خواہش انسان کے ساتھ رہتی ہے وہ اچانک پوری ہو جائے تو وہ سمجھ نہیں پاتا کہ اس کا ردعمل کیا ہونا چاہئے......... اتنے میں دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور شیروانی نے سلیم کو آواز دی۔ سلیم پر اس آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شیروانی ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لئے کھڑا تھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے التجا کی کہ میں یہ کھانا سلیم کو کھلا دوں۔

میں نے کہا "لیکن بھائی صاحب........."

وہ سرگوشی میں بولا "لیکن کچھ نہیں ثناء بہن۔ اگر تم بھی اسے یہ کھانا نہیں کھلا سکتیں تو پھر دنیا میں کوئی بھی نہیں کھلا سکتا۔"

شیروانی کے صاف شفاف لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ اس اعتماد میں ہلکی سی شوخی بھی تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔

سلیم نے اس دن کھانا کھایا۔ دوا بھی کھائی اور اپنی گوشہ نشینی بھی ترک کر دی۔ اس رات میں سلیم' دینو اور شیروانی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شیروانی ایک کار ڈیلر تھا۔ جیل روڈ پر اس کا شوروم تھا۔ قسطوں پر بھی گاڑیاں دیتا تھا۔ اس کی بیوی بمعہ بچوں کے میکے گئی ہوئی تھی اور میکہ بھی کہیں آس پاس نہیں تھا۔ شارجہ میں تھا۔ اسے دو ڈھائی ماہ تک آنا تھا اور اس دوران شیروانی اپنے گھر سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے مجھے اور دینو کو بتایا کہ ہم جب تک چاہیں بڑی آزادی سے یہاں رہ سکتے ہیں۔ کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا مکان اس طرح کا تھا کہ وہ ہمیں اپنا کرائے دار بھی ظاہر کر سکتا تھا۔ اس نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا "آج سے آپ تینوں میرے کرائے دار ہیں۔ مکان کا اوپر والا پورشن آپ کا ہوگا۔ پانی بجلی گیس سب کچھ مفت ملے گا لیکن ایک شرط ہے۔ کرایہ میری مرضی کے مطابق ہوگا اور کرایہ یہ ہے کہ آپ تینوں کو ہنسی خوشی رہنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے جتنے دن بھی آپ یہاں گزاریں خوشی خوشی رہیں۔ ایک مدت بعد میری بیوی

اپنے میکے گئی ہے' میں ان سنہری گھڑیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں......... آپ کے چہروں پر اداسی ہوگی تو میرا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

دینو نے مسکرا کر وعدہ کیا "آپ بے فکر رہیں۔ ہم نہ صرف خود خوش رہیں گے بلکہ آپ کو بھی ہنسا ہنسا کر وخت ڈال دیں گے۔"

"وخت؟ یہ وخت کیا ہوتا ہے؟" ٹھیٹ اردو بولنے والے شیروانی نے حیرانی سے پوچھا۔

سلیم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی۔ میں نے اسے بہت دنوں بعد مسکراتے دیکھا تھا۔ شیروانی کے ساتھ اس مکان میں ہم تقریباً دو ہفتے رہے۔ ان دو ہفتوں میں صرف ایک بار سلیم کی والدہ اس سے ملنے آئیں۔ سلیم کے سامنے انہوں نے مجھ سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کی۔ میں بھی لاتعلق ہی رہی......... سلیم اب تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ بخار اتر چکا تھا اور نقاہت بھی دور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ بیمار تھا ہی نہیں......... اس نے وہ سب کچھ ایک خط میں لکھ کر مجھ سے کہہ دیا تھا جو وہ زبانی نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہ خط مختصراً یوں تھا۔

"ثناء! میں کوئی قلم کار نہیں۔ نہ ہی کوئی شاعر یا ادیب ہوں۔ میرے پاس ٹوٹے ہوئے لفظ ہیں۔ انہی لفظوں کا سہارا لے کر تم سے اپنے دل کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں میں تم سے پیار کرتا ہوں اور یہ اعلان مجھے سولی پر چڑھ کر بھی کرنا پڑے تو کروں گا۔ تمہارے بغیر زندہ رہنا اب میرے لئے ناممکن ہے۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں۔ جو میرے دل میں ہے وہی زبان پر آگیا ہے۔ دو ٹوک بات یہ ہے کہ اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کر لو۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور یہ تم پر احسان نہیں ہوگا۔ میرے لئے دنیا میں تمہاری خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں۔ جہاں تک وہاب چنگیزی کا تعلق ہے وہ اب تمہارا نہیں میرا دشمن ہے۔ اس سے نپٹنا بھی میری ذمے داری ہوگی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے وہی سزا دوں گا جس کا وہ حقدار ہے۔ اس شیطان کا انجام ہر طرح تمہاری حسب منشاء ہوگا۔ اس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔ مجبور ہوں۔ جیتے جی دل چیر کر نہیں دکھا سکتا اپنی قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ چھوڑتا ہوں۔"

فیصلہ کیا ہونا تھا۔ فیصلہ تو اس طوفانی شب کو ہو چکا تھا جب دو مائیں ایک تنہا کمرے

میں آمنے سامنے ہوئی تھیں اور ایک شدید کشمکش سے گزر کر ایک فیصلے پر پہنچی تھیں۔

میں نے اپنے فیصلے سے سلیم کو آگاہ کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر کامیابی کا تبسم چمکا اور دنیا جہان کی خوشیاں اس کی دو آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ وہ پھول کی طرح کھلا اور بہار کی طرح بکھراں ہو گیا۔ ایک تند جوشیلے بگولے کی طرح اس نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور اڑا کر کہیں سے کہیں لے آیا۔ میں نے خود کو اس کی وارفتگی کے حوالے کر دیا اور ماضی سے دل و دماغ کے تمام رابطے منقطع کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک رات میں نے اور سلیم نے وحید شیروانی سے اجازت لی اور اس کے گھر سے رخصت ہو کر اسٹیشن آ گئے۔ دینو بطور ملازم ہمارے ساتھ تھا ہم پشاور پہنچے پشاور سے کوہاٹ آئے اور وہاں سے کرم ایجنسی میں داخل ہو گئے۔ یہ آزاد قبائلی علاقہ تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد سلیم نے کچھ عرصہ اسی ایجنسی میں گزارا تھا اور یہاں اس کے جاننے والے موجود تھے۔ ٹل سے آگے ہم پارہ چنار پہنچ گئے۔ پارہ چنار کے ایک مضافاتی گاؤں میں پہاڑی پر بنا ہوا ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان ہماری منزل تھا۔ کہیں قریب سے ایک گنگناتا چشمہ گزرتا تھا۔ دور فاصلے پر افغانستان کے برف پوش پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ یہ مکان غلام خاں نامی ایک اونچے لمبے اور سرخ و سفید پٹھان کی ملکیت تھا۔ غلام خاں زمیندار تھا اور سلیم کا گہرا دوست تھا۔ وہ سلیم کو بابری کے نام سے جانتا تھا۔ اس نے یہ مکان اپنی دوسری شادی کے لئے بنوایا تھا۔ مگر شادی سے چند ہفتے پہلے اس کی پہلی بیوی نے نرینہ اولاد کی خواہش پوری کر دی اور یوں یہ مکان آباد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب یہی مکان میرا اور سلیم کا مسکن ٹھہرا۔ پارہ چنار پہنچنے کے دوسرے ہی روز ایک چھوٹی سی تقریب میں میں سلیم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔ اس تقریب میں شیروانی بھی لاہور سے آکر شریک ہوا۔ شیروانی کے علاوہ دینو وہ واحد چہرہ تھا جسے میں پہلے سے جانتی تھی۔ باقی سب اجنبی تھے۔ اس تقریب میں سلیم کے مقامی دوستوں اور ان کے ساتھیوں نے بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ رات ہوتے ہی انہوں نے ناچنا گانا شروع کر دیا اور ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا میں اور سلیم ملک کی سرحد پھاند کر پولیس اور قانون کی دسترس سے بہت دور آچکے ہیں اور دو مفرور ملزموں کی اس شادی کے شرکاء کو کسی طرح کا کوئی ڈر خطرہ نہیں۔ مقامی عورتیں جوق در جوق آئیں اور میرے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ وہ پہلے تو

کچھ جھجکتی رہیں پھر انہوں نے بے تکلفی کے مظاہرے شروع کر دیئے۔ انہوں نے مجھے لباس بدلنے پر مجبور کیا اور نہایت زرق برق مقامی لباس پہنا دیا۔ اس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے آئینے لگے تھے اور سلائی کڑھائی کا کام تھا۔ میرے بال ابھی تک زیادہ طویل نہیں ہوئے تھے پھر بھی انہوں نے بالوں کو گوندھ گوندھ کر چھوٹی چھوٹی چوٹیوں کی شکل دے دی ۔ میرے ماتھے پر' رخساروں اور ہاتھوں کی پشت پر نقش و نگار بنائے گئے اور میرے چھدے ہوئے کانوں کے بند سوراخ دوبارہ کھول کر چاندی کے وزنی جھمکے آویزاں کر دیئے گئے۔ یہ جھمکے غلام خاں کی بیوی خوش بخت جان کی طرف سے تھے۔ کچھ لڑکیاں ڈھولک' الغوزہ اور دف لے آئیں۔ تیز تیز پشتو لہجے میں وہ نہ جانے کیا کیا گانے لگیں۔ میں "صم بکم" بیٹھی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جب چند بڑی بوڑھیاں موقع پر پہنچیں تو محفل نے اور ہی رنگ اختیار کر لیا۔ چھوٹی چھوٹی رسمیں ادا کی جانے لگیں۔ میری جھولی میں ایک رنگین رومال رکھا گیا جس میں بادام' اخروٹ' خشک خوبانی اور نجانے کیا تھا۔ اس رومال کی گرہیں مجھ سے کھلوائی گئیں۔ پھر میرے پاؤں کے انگوٹھوں کو سرسوں کے تیل میں ڈبویا گیا۔ ایک عورت نے کوئی نامعلوم رسم ادا کرتے ہوئے ایک سرخ دھاگہ جس میں سرخ بیر سے پروئے ہوئے تھے میرے گلے میں ڈال دیا۔ کئی مرحلوں سے گزارنے کے بعد ایک بڑے قرآن مجید کے سائے تلے مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے کو حجلہ عروسی کے طور پر سجایا گیا تھا۔ مجھے وہاں بٹھا کر وہ عورتیں باہر چلی گئیں۔ رات گئے سلیم اندر داخل ہوا۔ اس نے مشرق کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے۔ دور کہیں سے سرد چوٹیوں کو چھو کر آنے والی ہوا کمرے میں چکرانے لگی۔ سلیم مجھے اپنے ساتھ لے کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا کہنے لگا۔

"شاء۔ تمہیں یاد ہے......... تم نے جمعرات کے روز ہوٹل میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج بھی جمعرات ہے۔ کتنے برسوں کے بعد آئی ہے یہ جمعرات۔ مجھے تو محسوس ہوتا ہے میں آج تک اسی نیلی کیبن میں بیٹھا تمہارے انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔"

اس چھوٹے سے خوبصورت مکان میں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اس زندگی کے دو رخ تھے۔ ایک رخ وہ جو سلیم کے لئے تھا اور دوسرا رخ جس کا تعلق صرف اور صرف میری ذات سے تھا۔ سلیم کے ساتھ میں ہنستی بولتی تھی اس کی خوشیوں

میں شریک رہتی تھی۔ کبھی اسے بچے کی طرح بہلاتی تھی اور کبھی خود بھی اس کے ساتھ بچہ بن کر باہمی فاصلے مٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ بہت خوش' بے حد خوش تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ میری خود سپردگی نے اسے دنیا کے ہر غم سے آزاد کر کے' تصور میں آنے والی ہر خوشی اس کی آغوش میں ڈال دی تھی.......... مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس خود سپردگی کے پیچھے جبر کی کون سی داستان پوشیدہ ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اس گھر میں بسنے والی عورت کے سینے میں کون سا طوفان چھپا ہے۔ کیا قیامت ہے جو دل کے تاریک ترین گوشے میں کچھ دیر کے لئے محصور کر دی گئی ہے اور اسے محصور رکھنے میں اس عورت کو کیا کیا عذاب جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

میں ایک دھتکاری' پھنکاری' ذلیل اور بدنام عورت اس عزت کے قابل کہاں تھی جو سلیم اور یہاں کے لوگ مجھے دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر میں خود کو اس عزت کے قابل سمجھتی تو اپنی ذات کے ساتھ ایک بہت بڑا فریب کرتی۔ بستی کے لوگ مجھے دیکھ کر سلام کرتے تھے۔ بڑی بوڑھیاں سر پر پیار دیتی تھیں۔ غلام خاں کے کارندے نگاہیں جھکا کر بات کرتے تھے۔ مگر میں جانتی تھی میں کون ہوں۔ میں ایک مفرور قاتلہ تھی جس کی گرفتاری کے لئے ایک روز بازار حسن کے چوبارے پر چھاپہ مارا گیا تھا اور میں پولیس سے بچ کر نکل گئی تھی۔ میں کون ہوتی تھی ایک باعزت مرد کی زندگی پر قبضہ جمانے والی۔ اس کے نام سے اپنا نام جوڑنے والی اور اس کے بچوں کی ماں بن کر اس کی نسل کو آگے بڑھانے والی۔ میں اب متاع کوچہ و بازار تھی۔ میرا نصیب قدموں تلے روندا جاتا تھا یا.......... مرجاتا۔ جس نے مجھے گلے کا ہار بنایا تھا۔ اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مجھے معلوم تھا جلد یا بدیر اسے اس غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ جب محبوبہ بیوی بن کر ہر پل ساتھ رہے گی اور جذبوں کے گلشن پر قربتوں کی برف گرے گی تو چند ہی ماہ میں سب کچھ بدل جائے گا۔ پھر رات کے نرم اندھیرے پر دن کی شفاف روشنی کو فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ اس روشنی میں سلیم آنکھیں کھول کر دیکھے گا تو اسے میرا اصل چہرے نظر آنے لگے گا۔ ایک مفرور قاتلہ کا بدنصیب چہرہ۔ وہ وقت محبت کرنے کا نہیں ہوگا' نفرت کرنے کا ہوگا یا ترس کھانے کا.......... اور وہی وقت راستے بدلنے کا بھی ہوگا۔

یہ سب کچھ ذہن میں رکھ کر ہی میں نے اس نئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں نے سلیم کی بیوی بن کر خود کو اس کے لئے اتنا ارزاں کر دیا تھا کہ میرے خیال میں اس کی محبت چند ماہ سے زیادہ جی ہی نہیں سکتی تھی.......... مگر بتدریج مجھے احساس ہونے لگا کہ میری سوچ اور میرے حالات ایک ہی رخ پر نہیں چل رہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ سلیم کی محبت اور وارفتگی گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے بعد اس کے اندر میری ضرورت کا احساس اور بھی شدید تر ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے دل میں کوئی خوف بیٹھ گیا ہے کہ میں اس سے جدا ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے بھی خود سے جدا کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ زمیندار غلام خان نے اسے اپنے ایک باغ کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ یہ باغ گاؤں سے قریباً پانچ فرلانگ کی دوری پر پہاڑ کی ترائی میں تھا۔ سلیم صبح آٹھ بجے باغ پر جاتا اور شام پانچ بجے فارغ ہوتا۔ لیکن اس دوران وہ گھر کے کم از کم چھ چکر ضرور لگاتا۔ ہر ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کسی نہ کسی بہانے گھر چلا آتا مجھے سامنے بٹھا کر دیوانوں کی طرح صورت دیکھتا۔ میں سٹپٹاتی' پریشان ہوتی اسے دھکیل دھکیل کر گھر سے نکالتی' کبھی سچ مچ خفا ہو جاتی مگر اس پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس کی محبت کی شدت سے خوف آنے لگتا۔ میرے اندر سے کوئی پکار کر کہتا۔

"ثناء' زندگی میں تیری کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی' یہ بھی پوری نہیں ہوگی کہ سلیم تجھے دل سے اتار دے۔ تمہارے نصیب کو تمہاری آرزوؤں سے بیر ہے بس یہی ساری بات ہے۔ تم سو سال بھی انتظار کرو گی تو سلیم کی چاہت سے دامن نہیں چھڑا سکو گی۔ سلیم کی ماں سے کئے ہوئے وعدے کی بیڑی ہمیشہ تمہارے پاؤں میں رہے گی اور اپنے پیاروں کے انتقام کی آرزو ٹوٹے خنجر کی طرح تمہارے دل میں دھنستی رہے گی.........." کبھی میں سوچتی کوئی ایسا کام کروں یا سلیم سے ایسا رویہ اپناؤں کہ وہ مجھ سے دور ہو جائے' مگر یہ سوچ عملی جامہ کبھی نہ پہن سکی۔ ہزار ہا صدمے جھیل کر بھی میرا دل پتھر نہیں بنا تھا۔ اس دل میں اتنی جرات نہیں تھی کہ کسی کی دل شکنی کر سکے۔ کسی کے خوابوں کے محل مسمار کر سکے۔ خدا گواہ ہے یہ کام میرے نزدیک آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ایک طرف میں پورے

چنگیزی خانوادے کو جہنم واصل کرنے کی جرات دل میں رکھتی تھی اور ایک طرف کسی بے گناہ کی آنکھ سے ٹپکنے والے ایک آنسو کا تصور میرے لئے سوہان روح بن جاتا تھا۔ گردش دوراں نے میری فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک رات میں نے سلیم کو ساتھ والی چارپائی پر بڑبڑاتے سنا۔ وہ اکثر نیند کی حالت میں بڑبڑانے لگتا تھا مگر آج میں اٹھ کر بیٹھ گئی' وہ بار بار میرا نام پکار رہا تھا' پھر کہنے لگا۔

"ایک بار مجھے میرے بیٹے کا چہرہ دکھا دو.......... پھر میں چلا جاؤں گا۔ خدا کی قسم چلا جاؤں گا.......... وہاب کو قتل کر کے لوٹوں گا یا کبھی نہیں لوٹوں گا۔ یہ تیری نہیں میری لڑائی ہے۔ میری لڑائی ہے.......... میڈم نادرہ کی دشمنی تجھ سے نہیں مجھ سے تھی۔"

میں نے شانہ جھنجھوڑ کر سلیم کو جگا دیا وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب روشن کیا اور میری طرف سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا۔ کیسی آواز تھی؟"

میں نے کہا "کوئی آواز نہیں تھی صرف تم بڑبڑا رہے تھے۔ وہی پرانی باتیں۔ سلیم! تمہارے دل سے یہ بات کیوں نہیں نکلتی۔ میں اپنا ماضی بھول چکی ہوں تم بھی بھول جاؤ صرف یہی ایک راستہ ہے ہمارے زندہ رہنے کا۔ میں نے اپنا انصاف خدا پر چھوڑ دیا ہے' یقین کرو میں اپنے حالات سے سمجھوتہ کر چکی ہوں۔ تم اس سمجھوتے کو ناکام کرنے والی باتیں سوچتے ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

سلیم' خاموش رہا۔ میں جانتی تھی اس خاموشی کے پیچھے ایک ہنگامۂ قیامت ہے' میں اس قیامت سے خوفزدہ تھی۔ میں سلیم کو اپنی آگ سے بچانا چاہتی تھی اور جتنا بچانا چاہتی تھی وہ اتنا ہی اس آگ کی طرف کھنچا آتا تھا۔ کمرے میں بتی جلتے دیکھ کر دینو نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور بولا۔

"خیر تو ہے استاد جی۔ میری کوئی لوڑ شوڑ ہو تو بتا دو۔"

سلیم نے کہا "نہیں تمہاری کوئی لوڑ نہیں اور مجھے پتہ ہے جب لوڑ پڑی تو تم نظر نہیں آؤ گے۔"

دراصل یہ آزاد علاقہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی حفاظت خود کرنا پڑتی تھی۔ بچوں تک کے کندھوں سے بندوقیں لٹکی نظر آتی تھیں۔ دینو اور سلیم کے سرہانوں کے نیچے بھرے

ہوئے پستول موجود رہتے تھے۔ سلیم نے پچھلے دو مہینے کی آمدن میں سے کچھ رقم نکال کر ایک طاقتور رائفل بھی خرید رکھی تھی۔

دینو چڑ کر بولا "استاد جی! میں نے دس برس ایک میمن سیٹھ کے گھر ملازمت کیتی ہے۔ کم از کم دس چور پھڑ کا چکا ہوں اس کے گھر میں۔"

سلیم نے شرارت سے کہا "خواب میں تو تم نے اور بھی کئی "جی داریاں" دکھائی ہوں گی۔ میں حقیقت کی بات کر رہا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں چور نہیں آتے' ڈاکو آتے ہیں' نام بعد میں پوچھتے ہیں گولی پہلے مارتے ہیں۔"

دینو نے جھلا کر کہا "استاد! ان ساری باتوں کا پتہ تو ویلا آنے پر لگے گا جو بھونکتے ہیں وہ وڈتے (کاٹتے) نہیں۔"

اس کے بعد دینو منہ سر لپیٹ کر سو گیا۔ سلیم بھی لیٹ گیا' میں نے لائٹ آف کر دی اور اسے کہا کہ وہ سو جائے.......... کافی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بدستور جاگ رہا ہے۔

"کیا بات ہے سلیم' جاگ رہے ہو؟"

"ہاں اب نیند نہیں آئے گی" اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیوں' کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ.......... یہی کہ تمہارے بغیر یہ آٹھ دس روز کیسے کٹیں گے!" (سلیم کام کے سلسلے میں ٹل شہر جا رہا تھا اور اسے وہاں چند دن لگنے تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ متعدد بار اپنی پریشانی کا اظہار کر چکا تھا)

میں نے کہا "سلیم' تمہاری اتنی محبت میری جان لے لے گی۔ اتنی محبت مت کرو مجھ سے۔ ایسی محبت خود مر جاتی ہے یا محبت کرنے والوں کو مار دیتی ہے۔"

"میرے بس میں کچھ نہیں ثناء" اس نے سادگی سے کہا "میں پاگل ہوں۔ تم میری خطاؤں کو معاف کر دیا کرو۔ جو گھڑی تم سے دور گزارتا ہوں وہ گھڑی دردناک عذاب ہوتی ہے.......... مجھے لگتا ہے کسی دن تم سے علیحدہ میرا کوئی وجود ہی نہیں رہے گا.........."

سلیم کی ایسی ہی باتوں سے میری روح کانپ جاتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کسی نے

میری قوت گویائی چھین لی ہے.......... اس نے میرا ہاتھ اپنے کشادہ سینے پر رکھ لیا کہنے لگا "ثناء تم سے یہ نہیں کہتا کہ مجھ سے اتنی محبت کرو جتنی میں کرتا ہوں' لیکن ایک التجا ہے۔ میری محبت پر انگلی مت اٹھایا کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یہی میرے حق میں بہتر ہے۔"

میں نے پوچھا "کس وقت جانا ہے؟"

وہ بولا "پرسوں صبح چھ بجے کے قریب۔"

"اور واپسی کب ہوگی؟"

"بدھ کے روز شام کو یا جمعرات کی صبح۔"

"اپنا خیال رکھنا۔"

"تمہای خاطر ضرور رکھوں گا.......... اور ہاں میں نے غلام خاں کی بیوی سے کہہ دیا ہے وہ رات کو تمہارے پاس آجایا کرے گی۔ دینو بھی موجود ہوگا۔"

دیر تک سلیم ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ باتوں کو جان بوجھ کر طول دے رہا ہے اور اس کی گفتگو میں تسلسل بھی کم ہے.......... یہ عقدہ کچھ دیر بعد کھلا کہ وہ گفتگو برائے گفتگو میں مصروف تھا کیونکہ اس نے میری آواز ٹیپ کرنے کے لئے ٹیپ ریکارڈر چلا رکھا تھا۔ کیسٹ کو ٹیپ ریکارڈر سے نکال کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور مسکرا کر بولا۔

"کم از کم تمہاری آواز سے دوری کا مسئلہ تو حل ہوا۔"

تیسرے روز علی الصبح وہ روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اس کی پسندیدہ ڈش آلو کی بھاجی تیار کی۔ کچھ اس نے کھالی کچھ ساتھ لے جانے کے لئے ٹفن میں رکھ لی۔ پتلون قمیض پہن کر اس نے ریوالور کوٹ کے نیچے لگا لیا۔ اسے باغ کے لئے کچھ زرعی دوائیں اور سامان وغیرہ خریدنے جانا تھا۔ قریباً آٹھ دس ہزار روپے کی رقم اس کے پاس تھی۔ غلام خان نے بڑی سڑک تک پہنچانے کے لئے جیپ فراہم کی تھی جو دروازے کے باہر کھڑی مسلسل شور مچا رہی تھی۔ مجھے بمشکل "خدا حافظ" کہنے کے بعد وہ جیپ میں بیٹھ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

☆==========☆==========☆

سلیم کے جانے کے بعد مجھے اکیلے پن کا احساس ہونے لگا۔ جیسے میرے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اور میں ایک کشتی پر تنہا رہ گئی ہوں۔ اگر ہمدرد غلام خاں اور اس کی محبت کرنے والی بیوی میرے آس پاس نہ ہوتی تو معلوم نہیں تنہائی کا یہ احساس میرے اندر کیا کیا طوفان اٹھا دیتا۔ غلام خاں کی بیوی اور اس کی بچیاں ایک لمحے کے لئے مجھے تنہا نہیں چھوڑتی تھیں۔ سارا دن گھر کے صحن میں جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔

عیدالفطر کی آمد آمد تھی۔ بستی کی کئی لڑکیاں دوپہر کے وقت آجاتیں اپنے کپڑوں پر سلائی کڑھائی کرتیں اور دوپٹوں کو رنگ دیتیں۔ جتنی معصوم شکلیں تھیں اس سے زیادہ معصوم ان کی ہنسی اور ان کی باتیں تھیں۔ شہر کی رنگینیوں اور ہنگاموں سے دور اس دور افتادہ پہاڑی بستی میں زندگی کتنی حسین اور سادہ تھی۔ کبھی میرا دل چاہتا کاش ماضی سے میرا ناطہ سچ مچ ٹوٹ جائے۔ میری یادداشت کے ساتھ ایسا کچھ ہو کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے۔ نہ اپنے فرحان کی توتلی باتیں۔ نہ فرخندہ اور عابد کی خونچکاں لاشیں نہ بھائی تنویر اور اس کے اہل خانہ کے بے جان چہرے۔ سب کچھ میرے ذہن کی تختی سے مٹ جائے۔ میں اس بستی میں ایک نئی زندگی شروع کر سکوں۔ یہاں کے معصوم باشندوں کی معصوم مسکراہٹوں میں گھل مل جاؤں۔ سلیم کی بے پناہ محبت کا جواب محبت سے دے سکوں اور اس چار دیواری کو اپنی چار دیواری سمجھ کر اس میں زندگی گزارنے کی تمنا کروں۔ مگر اس سوچ کی عمر چند لمحوں سے طویل نہیں ہوتی تھی۔ وہاب چنگیزی کا مکروہ چہرہ اپنی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ میرے تصور میں گھس آتا تھا۔ نیم روشن کمرے میں اپنے ساتھ اس کی درندگی یاد آتی تھی۔ اس کے فاتحانہ قہقہے یاد آتے تھے۔ اس کی زہریلی بدبودار پھنکاریں میں اپنی گردن پر محسوس کرتی تھی اور مجھے اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اس خوبصورت چار دیواری سے بھی نفرت ہو جاتی تھی۔

سلیم کو بدھ کے روز آنا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں رات گئے تک اس کی منتظر رہی۔ اگلا دن بھی انتظار میں کٹا۔ شام کو عید کا چاند نظر آیا۔ بستی کے لڑکے بالے خوشی سے اچھلنے کودنے لگے۔ بستی سے کچھ فاصلے پر ایک اونچی جگہ آگ کا الاؤ دہکا دیا گیا۔ مقامی رواج کے مطابق یہ چاند نظر آنے کا اعلان تھا۔ بستی کے نوجوان اور خوش طبیعت بوڑھے اس الاؤ کے گرد جمع ہو کر گپیں ہانکنے اور ساز بجانے لگے۔ ذرا اندھیرا ہوا تو غلام

خان کی بیوی کئی دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر آگئی۔ چاند رات منانے کا ان کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ سب بستی کے ساتھ ایک ہموار میدان میں جمع ہو گئیں۔ بہت سی لالٹینیں نیم دائرے کی شکل میں رکھ دی گئیں۔ ناچ گانے کا دور شروع ہوا۔ سب کچھ پشتو میں تھا لیکن ایک گیت اردو نما پشتو میں بھی گایا گیا شاید مجھے سنانے کے لئے تھا۔ مفہوم کچھ یوں تھا۔

"میرا دولہا گھر سے باہر ہے۔ میں سرما کی لمبی کالی راتوں میں سرخ چادر پر سنہری تاروں سے پھول کاڑھتی ہوں اور اس کو یاد کرتی ہوں۔"

"میرا دولہا گھر سے باہر ہے۔ میں بہار کی معطر شاموں میں پھلواری سے جھک جھک کر پھول چنتی ہوں اور ہر پھول کے بدلے ایک آنسو اس کے نام پر گراتی ہوں۔"

"میرا دولہا گھر سے باہر ہے۔ میں برسات کی جھڑیوں میں دہلیز پر بیٹھ جاتی ہوں اور دور دیس سے آنے والی ہوا سے پوچھتی ہوں کہیں وہ مجھے بھول تو نہیں گیا ہے۔"

گیت کی پرسوز لے اونچی نیچی گھاٹیوں میں گونج رہی تھی لیکن میں کسی گیت سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اپنی ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کل غلام خان رات گئے تک میرے گھر بیٹھا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ٹل میں سلیم کا کام پانچ چھ دن سے زیادہ کا نہیں تھا معلوم نہیں اب وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟

اندیشے رہ رہ کر میرے دل میں سر اٹھانے لگے۔ کہیں وہ پنجاب تو نہیں چلا گیا تھا۔ وہاں میرے اور اس کے لئے ہر طرف موت کا جال بچھا ہوا تھا اور ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ابھی کم از کم ایک برس تک ہم قبائلی علاقے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کبھی وسوسہ جاگتا کہ چنگیزیوں کے ہرکارے یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے سلیم کا کھوج لگا لیا ہے۔ وہ وقت یاد آیا جب پچھلے ہفتے وہ مجھ سے رخصت ہو رہا تھا۔ دل کی گہرائی سے ایک ہوک اٹھی۔ مجھے لگا جیسے میں سلیم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ بے پناہ اور بے حد شدید۔ اتنی ہی جتنی اپنے فرحان سے کرتی ہوں۔ شاید یہ دونوں محبتیں ایک ہی نا آسودہ جذبے کے دو عکس تھے۔ جو افتادِ زمانہ کے ہاتھوں یوں باہم مل گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا پہچاننا مشکل تھا۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب بستی کی طرف سے دینو بھاگتا ہوا آیا۔ اس

کے بھاگنے کے انداز سے ہی ظاہر تھا کہ وہ کوئی اطلاع لے کر آ رہا ہے۔ ہانپتا ہوا میرے پاس پہنچا اور بولا۔

"بی بی جی استاد آگیا ہے۔ ساتھ ہی سامان سے بھری ہوئی پک اپ بھی لیاندی ہے۔ آپ آکر دیکھو تو سہی۔ کیا کیا شیویں (چیزیں) لے کے آیا ہے۔"

"وہ.......... خیریت سے تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

ہاں جی' بالکل۔ چاروں خانے خیریت سے ہے۔ بس آپ آجاؤ فٹافٹ۔"

پلک جھپکتے ہی سلیم کی واپسی کی خبر پوری بستی میں پھیل گئی۔ میں دوسری عورتوں کے ساتھ گھر پہنچی تو غلام خاں اپنے چند کارندوں کے ساتھ مل کر ایک بڑی فریج ایک ٹرک نما پک اپ سے اتار رہا تھا۔ دو قالین رول کئے ہوئے دروازے پر پڑے تھے اور سلیم خود اندر کمرے میں ایک رنگین ٹیلی ویژن مناسب جگہ پر رکھوا رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور سلیم کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے کہ وہ یہ ہزاروں روپے کی اشیاء اٹھا لایا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بڑی خاص مسکراہٹ کھیل گئی۔ محبت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"شاء تم کچھ دیر کے لئے غلام خاں کے گھر خوش بخت کے پاس بیٹھ جاؤ' اتنی دیر میں میں مزدوروں سے یہ سارا سامان سیٹ کروا لیتا ہوں.........."

میں سلیم سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اتنے میں غلام خاں اسی طرف چلا آیا۔ "او خوچے تم ادھر کھڑا کیا کرتی ہے؟ جاؤ نا اپنی بہن کے پاس بیٹھو' ہم ابھی سلیم بھائی کے ساتھ مل کر تمہارے گھر کو سجاتا بناتا ہے۔ آج چاند رات ہے ناں۔ قسم سے تمہارا گھر محل لگے گا۔"

قریباً دو گھنٹے خوش بخت کے پاس بیٹھ کر جب میں دوبارہ گھر پہنچی تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر یہ باور کرنا مشکل تھا کہ میں ایک دور دراز پہاڑی بستی کے مکان میں کھڑی ہوں۔ گھر گلبرگ کی کسی عالیشان کوٹھی کا حصہ لگتا تھا۔ قالین' پردے' فریج' ٹیلی ویژن' واشنگ مشین' صوفے غرض شہری زندگی کی بیشتر آسائشیں یہاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نئے قالین کو دیکھ کر جوتی اتارنے لگی تو وہ پیار سے ڈانٹ کر بولا۔

"خبردار' یہ قالین تمہاری جوتی کی مٹی سے زیادہ مہنگا نہیں۔ جوتی سمیت آؤ۔"

میں نے کہا "سلیم، تم باغ کا سامان لینے گئے تھے یہ کیا کیا اٹھا لائے ہو؟ کیوں اتنا خرچ کیا ہے؟"

اس نے کہا "خرچ کہاں کیا ہے ثنا بیگم؟ یہی تو دکھ ہے کہ خرچ نہیں کر سکتا۔ کاش میرے بس میں ہو اور میں دنیا کی ہر وہ شے اس چار دیواری میں لے آؤں جو تمہیں خوشی اور راحت دے سکتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم میرا دل تمہارے لئے کیا کیا کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے بتا دیا تو تم مجھے سچ مچ پاگل سمجھنے لگو گی۔"

میں نے پوچھا "لیکن یہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے ہیں؟"

وہ بولا "تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے یہ میرا شعبہ ہے مجھ پر بھروسہ رکھو میں اس چار دیواری میں کوئی ناپاک چیز لے کر نہیں آؤں گا۔"

"لیکن پھر بھی سلیم۔ پتہ تو چلے۔ کیا تم لاہور گئے تھے؟"

وہ مسکرایا "اب تم اصل بیوی لگی ہو۔ بیوی تفتیش نہ کرے تو لگتا ہے کام کی نہیں صرف نام کی بیوی ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر دو اس تفتیش کا جواب۔"

وہ خوش دلی سے مسکرایا "شوہر جواب دے دے تو پھر وہ اصل شوہر کہاں ہوا؟"

اتنے میں دینو آگیا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی پر بڑی سی پٹی لپیٹی ہوئی تھی اور بہت سٹپٹایا ہوا نظر آتا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک چھوٹا صوفہ کمرے میں رکھتے ہوئے اس کی انگلی صوفے اور دیوار کے درمیان آگئی ہے۔ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس گھر وچ تو الٹی گنگا چلدی ہے۔ ہر کام غلط ہوندا ہے۔ چوٹ وی لگدی ہے تو غلط۔"

سلیم نے کہا "چوٹ تو کیسی بھی لگے غلط ہی ہوتی ہے۔"

وہ بیزاری سے بولا "بس جی، صحیح چوٹ بھی ہوندی ہے۔ اب یہی چوٹ جو ہتھ کی انگلی پر لگی ہے پاؤں پر لگدی تو اچھا نہیں تھا؟ یہ جو میرے دیہاڑی کے دو درجن پھیرے بازار اور باغ کے لگدے ہیں یہ تو ختم ہوندے۔"

میں نے کہا "ہاں یہ بات تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

سلیم بولا "خیر اب بھی چانس ختم نہیں ہوا۔ ابھی باہر ایک صوفہ اور پڑا ہے۔ اٹھا

لاؤ۔ شاید تمہاری مراد پوری ہو جائے۔"

وہ انگلی پر پھونکیں مارتا ہوا بولا۔ "نہیں جی، اب آپ اپنی مراد پوری کر لیں دو دن گھر میں تو ٹک کر بیٹھیں گے نا؟"

اس نوک جھونک کے درمیان ہی غلام خاں اور اس کی بیوی آگئے۔ وہ ستائشی نظروں سے گھر کے در و دیوار کو دیکھنے لگے۔ غلام خان کی بیوی نے پشتو نما اردو میں کہا۔

"ان دو صوفوں کے درمیان یہ جگہ کچھ خالی خالی سی لگتی ہے۔ یہاں کچھ ہونا چاہئے تھا۔"

غلام خان اپنی داڑھی کھجاتا ہوا بولا "خو چے میرا خیال ہے......... یہاں باوا لوگ کیلئے کوئی پلنگ ولنگ رکھ چھوڑو۔"

"باوا لوگ؟ باوا لوگ کون؟" دینو نے پوچھا۔

"اوئے لکڑی کی بندر، تم چپ کیوں نہیں رہتی۔ جب تم کو کچھ اتہ پتہ نہیں تو کیوں زبان اڑاتی ہے بیچ میں۔"

دینو اپنے لئے مونث کے صیغے پر ہمیشہ سیخ پا ہو جاتا تھا' وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

سلیم نے پوچھا "بھائی غلام خان، سچی بات ہے باوا لوگ کا مطلب تو میں بھی نہیں سمجھا۔"

غلام خان ہنسا "اوے کھوتے کا پتر، تم بڑا نکمی ہے، خدائی خوار باوا لوگ کا مطلب بھی نہیں سمجھتی۔ اوئے ام کس نامعقول کے ساتھ یاری لگا بیٹھا ہے۔ تمہاری شادی کو چھ مہینے ہو گئے۔ ہم نے تو کیا کیا پروگرام بنا رکھے ہیں جشن مشن کیلئے اور تمہارے کان پر ابھی جوں بھی نہیں رینگا۔"

خوش بخت دوپٹہ منہ میں دبائے ہنس رہی تھی میں بھی کسی حد تک غلام خاں کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہا تھا مجھے معلوم تھا اس گھر میں کبھی بچے کی چہکار نہیں گونجے گی۔ بچے کے لئے اس گھر میں جگہ تھی اور نہ میرے دل میں۔ میں نے سلیم کو بھی بتا دیا تھا کہ ابھی مجھے بچے کی خواہش نہیں۔ غلام خان کا مطلب سمجھ کر سلیم کچھ چپ سا ہو گیا۔ میں بھی قہوہ بنانے کے بہانے باورچی خانے میں چلی آئی۔ قہوہ لے کر میں دوبارہ کمرے میں پہنچی تو ماحول پر چھا جانے والی

عارضی پژمردگی دور ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر غلام خان' خوش بخت' سلیم اور دینو کے درمیان نوک جھونک ہو رہی تھی اور قہقہے گونج رہے تھے۔ کچھ دیر قہوے کا دور چلتا رہا پھر غلام خاں اور خوش بخت اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ سلیم نے کہا کہ وہ ایک چکر باغ کا لگا آئے۔ میں نے کہا "رات ہو گئی ہے۔ اب صبح چلے جانا۔"

اس نے کہا کہ ایک دوسری پک اپ پر باغ کا سامان کھاد اور دوائیں وغیرہ وہاں پہنچائی ہیں۔ انہیں ذرا دیکھ آؤں۔"

میں نے کہا "دینو کو بھیج دو۔ وہ دیکھ آتا ہے۔"

کہنے لگا "جو میں کر کے آؤں گا' دینو نہیں کرے گا۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"آتے آتے تمہارے لئے رات کی رانی لے کر آؤں گا' بہت پھول کھلے ہوئے ہیں وہاں۔"

میں نے پوچھا "اتنی رات گئے پھولوں کا کیا کرنا ہے؟"

وہ مسکرایا "جی چاہتا ہے کسی دن اس سارے گھر کو پھولوں سے بھر دیا کروں پھر ہم دونوں ساری رات جاگتے رہیں اور گھر میں گھومتے رہیں۔ باتیں کرتے رہیں اور باتیں سنتے رہیں۔ کبھی اس کمرے کی دہلیز پر بیٹھیں' کبھی اس کمرے کی دہلیز پر' کبھی سامنے والے برآمدے میں ٹہلنے لگیں اور کبھی.........' اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ گئی۔

وہ چلا گیا' میں نے دینو کو آواز دے کر کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ خود میں کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کمر سیدھی کر کے اٹھی اور کمرے میں ادھر ادھر بکھری چیزوں کو سنبھالنے لگی۔ سلیم کی پتلون جھاڑی تو اس کے اندر سے کچھ کاغذ اور نوٹ بیڈ پر گر گئے۔ کاغذات اور پیسوں کے بارے میں وہ ایسی ہی لاپرواہی برتتا تھا۔ میں سنبھالتی رہتی تھی اور وہ گماتا رہتا تھا۔ میں نے کاغذ اٹھائے اس میں کچھ تو سامان کی رسیدیں تھیں جو اس نے ٹل سے خریدا تھا اور پشاور سے منگوایا تھا اس کے علاوہ ایک نامانوس سا کاغذ بھی تھا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ دو گاڑیوں کی ڈلیوری رسید تھی۔ ایسی رسید گاڑی فروخت کرنے والا گاڑی خریدنے والے سے لیتا ہے' تاکہ گاڑی کا ہینڈ اوور

کرنا سند رہے۔ میں نے رسید پڑھی اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ سلیم نے تین دن پہلے لاہور میں اپنی دو ویگنیں کسی شخص کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کی ہیں۔ وہ ان ویگنوں کو فروخت کرنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر لاہور پہنچا تھا اور اسے واپسی میں دیر بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی یہی ۲ ویگنیں اس کی کل جائیداد ہیں جو اسے باپ کے ترکے سے ملی ہیں۔ وہ یہ دو ویگنیں بھی فروخت کر کے ان کے بدلے گھر کا آسائشی سامان لے آیا تھا۔ آخر کیا ضرورت تھی اس گھر کو قیمتی سامان سے بھرنے کی۔ جس گھر کو رہنا ہی نہیں تھا اس گھر کو بنانے سنوارنے میں نقصان کے سوا کیا حاصل ہونا تھا۔ عجیب شخص تھا یہ بھی۔ میں نے کیا سوچا تھا اور سامنے کیا آرہا تھا۔ میں اس کی محبت کی دلدل میں لحہ بہ لحہ دھنستی جا رہی تھی۔ رہی سہی کسر غلام خاں' خوش بخت اور ان کی بیٹیوں نے پوری کر دی تھی۔ ان کی پرخلوص چاہت ناک میں دم کئے رہتی تھی۔ کاش یہ چاہتیں مجھے کچھ عرصہ پہلے ملی ہوتیں۔ سوچتے سوچتے میرے دل میں آئی کیوں نہ کسی دن خاموشی سے یہ سب کچھ چھوڑ کر چلی جاؤں۔ سارے جنجالوں سے جان چھڑا کر اس راستے پر پہنچ جاؤں جس کا اختتام میرے انتقام کی تکمیل پر ہوتا تھا یا میری موت پر......... مگر اس سوچ کے ساتھ ہی سلیم کی والدہ کا چہرہ تصور میں آیا اور وہ فقرے کانوں میں گونجنے لگے جنہوں نے چند لمحوں میں میری زندگی کا نقشہ بدل دیا تھا۔

"دیکھو بیٹی تم ایک ماں ہو اور میں بھی ایک ماں ہوں تم اپنا بچہ کھو چکی ہو مگر میرا بچہ ابھی زندہ ہے۔ تمہارا بچہ واپس نہیں آسکتا لیکن میرا آسکتا ہے۔ کیا ایک ماں اپنی ممتا کے صدقے دوسری ماں پر رحم نہیں کھائے گی۔"

میں سوچنے لگی کیا میرے اس طرح چلے جانے سے وہ عہد بچ جائے گا جو میں نے اپنی طرح کی ایک دکھی ماں سے کر رکھا ہے۔ کیا میں اس کے بچے کو پہلے سے زیادہ اذیت ناک عذاب میں تو مبتلا نہیں کر جاؤں گی؟"

"کیا وہ زندہ رہ سکے گا؟"

میں سوچتی رہی اور نیا نویلا نرم و گداز بیڈ نوکیلے پتھروں کی مانند میرے جسم پر چبھتا رہا۔ دیوار گیر میوزیکل کلاک نے گیارہ بجے کا وقت بتایا مکان میں اور مکان سے باہر خاموشی تھی بستی کے سامنے اونچی ہموار چٹان پر چاند رات کا جشن منانے والے نوجوان

اور خوش طبع بوڑھے بھی اب گھروں کو جا چکے تھے۔ بس کہیں کہیں درختوں کی طرف سے کسی شخص کے بولنے یا بکری کے ممیانے کی صدا آجاتی تھی۔ کمرے کی ایک ادھ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لئے بستر سے اٹھی۔ یہی وقت تھا جب مجھے دینو کی پہلی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ وہ مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف آئی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے برآمدے میں اوپر تلے دو فائر گونجے۔ پھر میں نے دینو کو دیکھا وہ بھاگتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اس کے پیچھے شلوار قمیض اور پگڑی والا ایک دراز قد شخص تھا۔ دراز قد شخص نے بندوق کا وزنی کندا پورے زور سے دینو کے سر پر مارا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ فرش پر گرا اور بے حرکت ہوگیا۔ یہ سارا منظر میں نے ایک یا دو سیکنڈ کے اندر دیکھا پھر پلٹ کر کھڑکی کی طرف آئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کھڑکی تک پہنچتی یا اس میں سے کود کر باہر نکلتی' ادھ کھلی کھڑکی ایک دھماکے سے پوری کھل گئی اور ایک رائفل بردار کود کر اندر آگیا۔ میں حلق کی پوری قوت سے چیخی۔ رائفل بردار نے مجھے دبوچنا چاہا تو میں جھکائی دے کر اس کی زد سے نکلی اور پتھر کا ایک وزنی گلدان پورے زور سے اس کے منہ پر مارا۔ میری ضرب بے حد کاری ثابت ہوئی۔ مدمقابل کے حلق سے چیخ سی نکل گئی وہ الٹ کر پہلے ایک میز سے ٹکرایا پھر ٹی وی سیٹ پر جا گرا۔ بالکل نیا ٹی وی سیٹ جسے ابھی آن بھی نہیں کیا گیا تھا پہلو کے بل فرش پر گرا اور چکنا چور ہوگیا۔ اسی دوران میرے عقب سے ایک شخص کمرے میں داخل ہو چکا تھا اس نے مجھے زور دار دھکا دیا اور میں اوندھے منہ بیڈ پر جا گری۔ کھلی ہوئی مہندی کا وہ پیالہ جو خوش بخت میرے لئے رکھ گئی تھی الٹ کر بیڈ پر پھیل گیا۔ تب ایک سخت ضرب میری کنپٹی پر لگی۔ پتہ نہیں یہ مکہ تھا' ریوالور یا بندوق کا کندا تھا یا کچھ اور۔ بہرحال اس ضرب نے مجھے نڈھال کر دیا اور مجھے لگا میں بے ہوش ہو رہی ہوں۔ میں نے ایک بار پھر چیخنا چاہا لیکن آواز نے حلق تک پہنچنے سے انکار کر دیا۔ کوئی شخص میرے بازوؤں کو موڑ کر پشت پر باندھ رہا تھا۔ کانوں میں بھاگتے دوڑتے قدموں اور تیز تیز باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا حملہ آور پورے گھر میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ غالباً وہ سلیم کی موجودگی سے آگاہ تھے اور اسے تلاش کر رہے تھے۔ میں نے اپنی مزاحمت کو جمع کر کے ایک بار پھر مدد کے لئے پکارنا چاہا لیکن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ

میرے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس دیا گیا ہے اور میری آواز تالو کے اندر ہی گونج رہی ہے۔

پھر کسی نے مجھے کندھے پر اٹھایا اور بھاگ کر کسی گاڑی میں ڈال دیا۔ فائرنگ کی مسلسل آوازیں بھی آرہی تھیں۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور مجھے لے کر آگے بڑھی' میں نے گردن موڑ کر گاڑی کی کھڑکی میں سے دیکھا عقب میں سرخ روشنی نظر آرہی تھی۔ یہ روشنی آگ کے شعلوں کی تھی۔ جو ہمارے مکان کی ایک کھڑکی سے نکل رہی تھی۔ شعلوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ پٹرول یا کیروسین آئل کی آگ ہے اور چند ہی لمحوں میں پورے گھر کو لپیٹ میں لے لے گی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی گھر میں کھڑی سلیم سے باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب جیسا لگا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟

کیوں ہو رہا تھا؟

"پشتو میں بولنے والے یہ لوگ کون تھے۔ دفعتاً گاڑی کو جھٹکا لگا۔ اس نے گلی میں دو تین سخت موڑ کاٹے اور غلام خاں کے گھر کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ایک شخص نے گاڑی کے اگلے حصے سے کھڑے ہو کر زور زور سے پشتو بولی۔ ان فقروں میں غلام خاں کا نام بڑی نفرت سے لیا گیا اور اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم پر قیامت ڈھانے والے ہمارے نہیں غلام خاں کے دشمن ہیں۔ ایکا ایکی غلام خاں کے گھر کی چھت سے ریوالور کے فائر ہوئے۔ بستی کے دیگر گھروں کی طرح غلام خاں کے گھر کی چھت پر بھی ایک گول مورچہ سا بنا ہوا تھا۔ مٹی کے اس مورچے میں فائرنگ کے لئے جا بجا سوراخ رکھے گئے تھے۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ فائر اسی مورچے سے کئے گئے ہیں۔ ایک دو گولیاں گاڑی میں بھی لگی تھیں۔ دفعتاً مجھے غلام خاں کی آواز گاڑی سے چند گز کی دوری پر آئی۔ میں سیٹ پر بندھی پڑی تھی اور دیکھ نہیں سکتی تھی تاہم میرا اندازہ تھا کہ غلام خاں اپنے گھر کے بیرونی گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آواز غیض و غضب سے چیختی ہوئی تھی۔ اوپر تلے خود کار رائفل کے دو برسٹ چلے' پھر مجھے خوش بخت کے رونے کی آواز آئی۔ وہ دردناک آواز میں بین کر رہی تھی۔ میں نے چشم تصور سے اونچے لمبے سرخ و سفید غلام خاں کو خاک و خون میں لوٹتے اور اس کی بیوی کو روتے پیٹتے دیکھا ایک بار پھر تڑپ کر میں نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہا لیکن میرے سرہانے بیٹھے شخص نے

مجھے یوں اپنے گھٹنوں کے نیچے دبالیا جیسے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے دبایا جاتا ہے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک ہی خیال تھا' میں اپنے میزبان کے دشمنوں کے ہاتھوں اغوا ہو رہی ہوں........ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ سلیم کہیں سے آجائے اور مجھے ان لوگوں کے چنگل سے نکال لے' مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکال دیا۔ سلیم اس اندھی رات کے روبرو نہ ہی آتا تو اچھا تھا۔ اسے ابھی زندہ رہنا تھا۔ اسے ابھی دو بوڑھی آنکھوں کے لئے بہت بہت جینا تھا۔ گاڑی ایک بار پھر حرکت میں آچکی تھی۔ اس کے ساتھ فائرنگ کی تڑ تڑ بھی جاری تھی۔ ایکا ایکی فائرنگ رک گئی اور گاڑی اونچے نیچے راستے پر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

میں ایک خواب دیکھ رہی تھی' منظر چنگیزیوں کے ڈیرے کا تھا' میں نے دیکھا بدنصیب پہریدار شمشیر خاں رائیل بنگال ٹائیگر کے چنگل میں ہے۔ درندہ اس کے جسم کو ادھیڑ رہا ہے۔ پھاڑ رہا ہے۔ شمشیر خاں کے حلق سے کربناک چیخیں اور جسم سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔ دفعتاً میں دیکھتی ہوں کہ شیر کے خدوخال وہاب چنگیزی کے خدوخال میں ڈھل رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اگلا نصف دھڑ حیوان کا بن جاتا ہے۔ وہ چنگھاڑ رہا ہے اور اپنے خوفناک دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ تب میں دیکھتی ہوں کہ پہریدار شمشیر خاں کی جگہ میں خود پڑی ہوں رو رہی ہوں' چلا رہی ہوں۔ وہاب سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہوں' مگر اس کی دم تیزی سے گردش کر رہی ہے اور اس کے پنجے میرے جسم کا گوشت ادھیڑے چلے جا رہے ہیں۔ اذیت کے بے پناہ احساس کے ساتھ میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے خود کو کھجور کی ایک چٹائی پر پایا۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے اور دوران خون رکنے سے ہتھیلیوں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ کنپٹی پر لگنے والی چوٹ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں بدقت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ نیچی چھت والا ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ ایک کھڑکی اور دروازے کے سوا کوئی رستہ نہیں تھا۔ کھڑکی میں زنگ آلود آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ درزوں سے آنے والی روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوپہر سے کچھ پہلے یا بعد کا وقت ہے۔ چٹائی

کے پاس ہی چمڑے کی بہت سی کترن پڑی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا واٹر کولر اور المونیم کا ایک گلاس تھا۔ کمرے سے باہر مکمل خاموشی تھی۔ لگتا تھا قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں۔ پیاس سے میرا حلق کانٹا ہو رہا تھا۔

میں نے پکار کر کہا "کوئی ہے........ کوئی ہے" فوراً ہی دروازے کے بالکل پاس سے ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

"ذرا چھری تلے سانس لے بچی۔ ابھی تجھے پانی پلاتے ہیں۔" بولنے والے کا لہجہ مقامی تھا۔

اس کے سخت لب و لہجے نے مجھے ان گنت اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔ یہ خطرناک لوگ تھے۔ نہ جانے مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ میرے کانوں میں دینو کی چیخ و پکار گونجی اور پھر اس کے گرنے کا منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھا۔ بچا بھی تھا یا نہیں۔ پھر خوش بخت کی چیخیں میرے ذہن میں ہلچل مچانے لگیں۔ اپنے شوہر کے سرہانے اس کے بین بڑے دلدوز تھے۔ کتنا خوشحال اور مطمئن جوڑا تھا وہ۔ غلام خاں پروگرام بنا رہا تھا کہ اس برس اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے اور بیوی کے ساتھ بیت اللہ جائے گا اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس نے اسے نرینہ اولاد کی نعمت سے نوازا لیکن اس کے تمام پروگرام دست اجل نے بیک جنبش قلم منسوخ کر دیئے تھے۔ میں اپنی سوچ میں کھوئی تھی۔ جب اچانک کمرے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔ یہ ٹاپیں بتدریج دروازے کے پاس پہنچیں اور پھر رک گئیں۔ کئی افراد گھوڑوں سے اترے اور دروازے کی جانب بڑھے۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر پیش آمدہ حالات کے لئے تیار کیا اور ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے سے باہر کسی نے تالے میں چابی گھمائی اور پٹ کھول دیئے۔ کمرہ اجلی روشنی سے بھر گیا۔ میرے سامنے کم از کم پندرہ افراد کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب مقامی لباس میں اور پوری طرح مسلح تھے۔ ان میں ایک دراز قد درمیانی عمر کی عورت بھی تھی۔ اس کا رنگ بے حد اجلا اور آنکھیں نیلی تھیں اس نے چہرے کا زیادہ تر حصہ ایک سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سوگواری اس عورت کے چہرے پر ٹوٹ کر برس رہی ہے۔ اس کی نیلی جھیلوں میں اشکوں کا تلاطم تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس

کی کمر سے گولیوں کی پیٹی بندھی تھی اور خنجر لٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بھی بے پناہ رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا میرے سامنے پہنچا کچھ دیر درد ناک نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے پھڑک رہے تھے۔ دفعتاً وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور مجھ پر جھپٹا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور خنجر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک ساعت کے اندر خنجر کا پھل میرے سینے میں اترنے والا تھا اور میں موت کے ذائقے سے آشنا ہونے والی تھی۔ موت کے انتظار کی یہ ساعت صدیوں سے بھاری تھی۔ اس ساعت کے گزرنے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ خنجر کو میرے جسم تک پہنچنے سے پہلے روک لیا گیا تھا۔ روکنے والا ایک درمیانی عمر کا باریش شخص تھا۔ وہ پوری قوت کے ساتھ خنجر بدست بازو سے لپٹا ہوا تھا اور پکار رہا تھا۔

"ہوش کرو صاحب جان' ہوش کرو' اس میں ہمارا ہی نقصان ہے۔" دیکھتے ہی دیکھتے پانچ چھ اور آدمی بھی قوی ہیکل صاحب جان سے لپٹ گئے اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے نکل نکل کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے۔ خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں دمک رہا تھا۔ اس نظارے کی دہشت لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ معلوم نہیں اس شخص کو مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ کیا صدمہ پہنچا تھا اسے میری ذات سے۔ میں تو خود ظلم کا ہدف اور صدموں کا نشانہ تھی۔ میں ہکی بکی اس شخص کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک شخص مجھے دھکیل کر کمرے کے ایک کونے میں لے گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے خنجر والے سے بچانا چاہتا ہے۔ اسی دوران خنجر والا بے پناہ جوش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ غصے سے چنگھاڑتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا میرے اور موت کے درمیان اب کوئی چیز حائل نہیں۔ میں نے سمٹ کر دروازے کی جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن ٹھوکر کھا کر پہلو کے بل گری۔ میرا یہ گرنا ہی مجھے خنجر بردار کے پہلے "قاتل وار" سے بچا گیا۔ خنجر میرے کندھے سے چھوتا ہوا کچی دیوار میں لگا۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور دوبارہ مجھ پر وار کرتا' باریش شخص زندگی کا فرشتہ بن کر ایک بار پھر اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے حملہ

آور کے خنجر والے ہاتھ پر کوئی چیز ماری۔ میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی۔ بہرحال خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ باریش شخص نے اسے دبوچنا چاہا مگر وہ جھکائی دے کر تیر کی طرح میری طرف آیا اور خالی ہاتھ مجھے پیٹنے لگا۔ اس کے ہاتھ ہتھوڑوں کی طرح تھے۔ مجھے اپنی ہڈیاں چٹختی محسوس ہوئیں۔

"صاحب جان!" باریش شخص نے ایک بار پھر پکار کر کہا اور بڑی دلیری کے ساتھ اس سے لپٹ گیا۔

اتنے میں دو تین اور افراد حرکت میں آ گئے لیکن وہ مجھے فربہ اندام شخص سے بچانے کے لئے حرکت میں نہیں آئے تھے۔ انہوں نے اس باریش شخص کو پکڑ لیا جو میری حمایت میں فربہ اندام شخص سے لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے کھینچ کر فربہ اندام سے علیحدہ کر دیا۔ میں ایک بار پھر اس غضبناک شخص کے سامنے تنہا رہ گئی جو میری جان کے درپے نظر آتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ سب اردگرد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کون سے ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی تھی مجھے........ میں نیم بے ہوش ہو کر گر گئی تو اس شخص نے مجھے بازو سے کھینچ کر ایک کرخت چہرہ رائفل بردار کے حوالے کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔

"لے جاؤ اس بدبخت کو۔ لے جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے۔" کرخت چہرہ شخص جس کا نام عیدو خان تھا بڑی گھناؤنی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ناک کی ہڈی عجیب طرح سے مڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بازو سے کھینچا اور ایک ایسے جھٹکے سے جس کے بارے میں کچھ بھی نہ جان سکی مجھے اپنے کندھے پر ڈال دیا۔ اس موقع پر میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن عیدو کی گرفت بہت سخت تھی۔ چند فٹ یا چند گز چلنے کے بعد اس نے بے دردی سے مجھے ایک چارپائی پر پھینک دیا۔ یہ ایک دوسرا کمرہ تھا۔ میرا سر کافی شدت کے ساتھ چارپائی کے بازو سے ٹکرایا مگر نہ جانے کیوں میں پہلے سے نیم بے ہوش ہونے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوئی۔ میرے اندر کی عورت جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "ثناء تمہیں ہوش میں رہنا ہے' تمہیں مزاحمت کے حق سے دستبردار نہیں ہونا' تمہیں اپنی حفاظت کرنی ہے۔"

میں دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف خطرناک چہرے دیکھ رہی تھی۔

ان چہروں پر انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ انتقام کی آگ میں تپتے ہوئے یہ چہرے میری بدقسمتی کا کھلم کھلا اعلان کر رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کون مرد تھا یا عورت تھی جس کے بدلے میں مجھے یہاں لایا گیا تھا اور جس پر ہونے والی کسی زیادتی کا انتقام مجھ سے لیا جا رہا تھا۔

اچانک میں نے خود کو ایک ناپاک گرفت میں محسوس کیا اور پورے زور سے چلانے لگی۔ یہی وقت تھا جب اس کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ "کون ہے؟" عیدو خاں کی کرخت آواز مجھے اپنے پاس سے آئی۔

"میں ہوں توخی خانم دروازہ کھولو۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ نیلی آنکھوں والی وہی عورت ہے جو باہر فربہ اندام شخص کے ساتھ نظر آئی تھی۔ عیدو خان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے اندر آگئی۔ یقیناً یہ عورت بھی میری دشمن تھی لیکن عورت تو تھی۔ اس کا وجود مجھے اپنی پناہ گناہ محسوس ہوا میں لپک کر اس کے پاس آگئی۔ اس نے کندھے کے قریب سے میرا بازو تھام لیا اور عیدو خان سے بولی۔

"نہیں عیدو......... یہ بات ٹھیک نہیں۔ برے کے ساتھ برے نہیں بن جاتے۔"

"عیدو خاں نے کہا "لیکن ملکو........."

"بکواس بند کرو۔" توخی خانم دھاڑی۔

"ملکو سے میں خود بات کرلوں گی۔"

عیدو خان اور اس کے دو ساتھی مجھے چھوڑنے پر راضی نظر نہیں آتے تھے لیکن توخی خانم کسی نہ کسی طرح مجھے ان کے چنگل سے نکال ہی لائی۔ اس نے مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے آگے دھکا دیا اور ساتھ لے کر اس مکان سے باہر نکل آئی۔ ایک جانب سے وہی فربہ اندام شخص چند مسلح افراد کے ساتھ برآمد ہوا۔ مجھے توخی خانم کے ساتھ دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ اس نے پشتو میں توخی خانم سے کچھ کہا۔ مجھے آزاد علاقے میں رہتے ہوئے سات آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور میں کسی حد تک پشتو کے الفاظ سمجھنے لگی تھی۔ فربہ اندام شخص جس کا پورا نام حاجت خان ملکو تھا توخی خانم سے پوچھ رہا تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ توخی خانم نے کہا "میں اس لڑکی کو گھر لے جانا چاہتی

ہوں۔"

حاجت خان ملکو بولا۔

"بہن......... یہ اس قابل نہیں کہ تم اسے اپنے گھر کی دہلیز پار کراؤ۔ اس کا مقام ہمارے پاؤں کے جوتے ہیں اور اس کی زندگی ہماری گردن کا بوجھ ہے۔"

توخی خانم نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو ملکو......... میں بھی اسے جوتوں میں ہی بٹھاؤں گی۔ اگر زندہ رہی تو موت کو ترستی رہے گی........."

حاجت خان اور توخی خانم کے درمیان مکالمہ کچھ دیر جاری رہا۔ اس مکالمے سے مجھے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ توخی خانم کو اپنی نوجوان بیٹی کا غم ہے جو کسی وجہ سے اب اس دنیا میں نہیں۔ اس مکالمے کے اختتام پر حاجت خان مجھے توخی خانم کے ساتھ بھیجنے پر رضامند ہو گیا۔

توخی خانم مجھے لے کر ایک اصطبل پر چلی آئی۔ یہ جگہ اس جھونپڑا نما مکان سے نصف فرلانگ دور تھی جہاں مجھے مارا پیٹا گیا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور منہ میں رہ رہ کر خون کا ذائقہ گھل جاتا تھا۔ یہاں چار گھڑسوار موجود تھے۔ ان سب کا لباس تقریباً ایک جیسا تھا۔ بھاری شلوار نما پرتوگ' کڑھائی دار کھلی قمیضیں' سفید پھولوں والے لال پٹکے۔ توخی خانم کو دیکھتے ہی انہوں نے ادب سے سر جھکایا۔ ہمارے پہنچتے ہی دو خالی گھوڑے لا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ توخی خانم نے ایک گھوڑے پر مجھے سوار کرایا اور دوسرے پر خود سوار ہو گئی۔ ہمارا یہ مختصر قافلہ اونچے نیچے پیچیدہ راستے پر سفر کرتا شمال کی جانب روانہ ہوا۔ گھڑسواری کا مجھے تجربہ نہیں تھا' دوسرے راستہ بھی ناہموار تھا۔ میں گر گر جا رہی تھی۔ توخی خانم نے یہ دیکھتے ہوئے مجھے ایک گھڑسوار کے پیچھے بٹھا دیا۔

قریباً پانچ میل فاصلہ دو ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے ہم ایک خیمہ بستی میں پہنچے۔ یہاں خیموں کے علاوہ نیم پختہ جھونپڑے بھی تھے۔ جن پر مکانوں کا گمان ہوتا تھا۔ خیموں اور جھونپڑوں سے باہر کتے اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے تھے۔ کتوں نے ہمیں دیکھتے ہی زور شور سے بھونکنا شروع کر دیا اور ملیشیا کی لمبی قمیضوں اور ننگی پنڈلیوں والے بچے جھونپڑوں سے نکل کر ہمیں دیکھنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک ویسی ہی بستی ہے جہاں سے مجھے لایا گیا ہے۔ ان لوگوں کے رہن سہن کا انداز خانہ بدوشوں جیسا تھا۔ بستی کے درمیان

سے گزر کر ہم ایک کشادہ جھونپڑے میں آئے۔ اس جھونپڑے کی دیواریں گارے اور پتھروں کی تھیں۔ جھونپڑے کے چاروں طرف سرکنڈوں کی ایک اونچی باڑ تھی۔ ایسی باڑیں بیشتر جھونپڑوں کے گرد نظر آتی تھیں۔ جھونپڑے سے باہر لمبے بھورے بالوں والے دو انتہائی خوفناک صورت کے کتے بندھے ہوئے تھے۔ گھڑ سوار باہر ہی رہ گئے۔ توخی خانم مجھے لے کر اندرونی حصے میں پہنچی۔ یہ کشادہ جھونپڑا دو سے زائد حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے سے کسی کے کراہنے کی مدہم آواز آ رہی تھی' کراہنے والا کوئی مرد تھا۔ جھونپڑے میں دو عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک کے بارے بعد میں پتہ چلا کہ وہ توخی کی بیٹی ہے۔ یہ دونوں عورتیں مجھے بڑی نفرت انگیز نظروں سے گھورتی رہیں۔ چند لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا کہ وہ دونوں مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ توخی خانم نے آگے بڑھ کر دونوں عورتوں سے دھیمے لہجے میں مختصر گفتگو کی۔ توخی خانم کی بیٹی اٹھی اور اندر سے ایک بوریا سا اٹھا لائی۔ یہ بوریا اس نے بڑے غصے سے میرے منہ پر مارا اور بولی۔

"اس کو پہن لے۔"

تب میں نے دیکھا کہ یہ بوریا دراصل ایک موٹا اور بھدا سا کپڑا ہے جسے لمبے کرتے کی شکل میں سیا گیا ہے۔ میں حیرانی سے کبھی کرتے کو دیکھتی تھی اور کبھی توخی خانم کو۔ اس کی بیٹی پھنکار کر بولی "تجھے سمجھ نہیں آئی ہماری بات؟" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ مجھ پر جھپٹی۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میرا لباس پھاڑ کر میرے جسم سے علیحدہ کر دے گی۔ میں خود کو اس کی زد سے بچانے کے لئے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ توخی خانم نے مجھے بازو سے پکڑا اور دانت پیستے ہوئے بولی۔

"بدبخت! جو تجھ سے کہا جا رہا ہے وہ کر۔"

جھونپڑے کے ساتھ والے حصے میں جا کر میں نے ریشم کی وہ پھولدار قمیص بدلی جو میرے جسم پر چاند رات کی نشانی تھی۔ آج روز عید تھا اور میں چاند رات کا ریشم اتار کر عید کا بوریا پہن رہی تھی۔ میری نگاہوں میں سلیم کا چہرہ گھومنے لگا۔ کل رات وہ باغ سے رات کی رانی کے پھول لے کر خوشی خوشی واپس لوٹا ہو گا۔ پھر اس نے اپنا آشیانہ شعلوں پر پایا ہو گا اور اپنے عزیز دوست غلام خاں کی خونچکاں لاش دیکھی ہو گی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اس پر کیا بیتی ہو گی۔ یہ کیسی عید آئی تھی ہمارے لئے؟ یہ وہ عید تو نہیں تھی جس کے

لئے کہا جاتا ہے "خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دکھائے" یہ تو ایک قیامت تھی جو ہم سب پر بیت گئی تھی۔

☆------------☆------------☆

اس جھونپڑے میں میری حیثیت ایک کنیز کی تھی۔ مجھ سے سارا دن کام لیا جاتا اور کھانے کو بچا کھچا ملتا۔ یہ پاوندوں (خانہ بدوشوں) کی بستی تھی۔ عمر شاہ لندو نامی شخص یہاں کا سردار یا ملک تھا۔ توخی خانم ملک عمر شاہ لندو کی بیوہ بھاوج تھی۔ اس کے دو بچے تھے ایک لڑکی غلام سکینہ اور ایک لڑکا زر گل۔ یہ زر گل وہی تھا جس کی کراہیں میں نے جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی سنی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک گہرا زخم تھا اور یہ زخم میرا ہی دیا ہوا تھا۔ ان سب باتوں کا علم مجھے بعد میں غلام سکینہ کی زبانی ہوا۔ جب مجھے غلام خان کے گھر سے اغوا کیا گیا اور میں نے حملہ آوروں کی مزاحمت کی تو زر گل ہی وہ شخص تھا جس کے چہرے پر میں نے وزنی گلدان سے ضرب لگائی تھی۔ یہ ضرب بہت سنگین ثابت ہوئی تھی نہ صرف اس کا رخسار پھٹ گیا تھا بلکہ آنکھ کے نیچے بھی ایک گہرا زخم آیا تھا۔ اب اس واقعے کو دس روز ہونے کو آئے تھے لیکن زر گل کا زخم اچھا نہیں ہوا تھا وہ اکثر کراہتا رہتا تھا۔ شب و روز ایک لگے بندھے معمول کے ساتھ گزر رہے تھے' صبح اٹھ کر مجھے کم از کم پندرہ بھیڑوں اور بکریوں کا دودھ دوہنا پڑتا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے نورے گاڑی سے دودھ دوہنا سیکھا تھا اس وقت کیا پتہ تھا جلد ہی یہ کام میری سخت ترین مشقت میں شامل ہو جائے گا۔ میری کلائیاں پھوڑے کی طرح دکھنے لگتیں۔ بعد ازاں مجھے غلام سکینہ اور چند دوسری عورتوں کے ساتھ پانی لانے کے لئے چشمے تک جانا پڑتا۔ چشمے کا فاصلہ ایک میل سے کم نہیں تھا اور راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ واپس آ کر غلام سکینہ تو ریوڑ کے ساتھ بستی سے باہر چلی جاتی اور میں سارا دن توخی خانم کی نگرانی میں کام میں جتی رہتی۔ گھر کا سارا کام مجھ سے لیا جاتا اور اگر کچھ وقت بچتا تو چٹائیاں بننے پر لگا دیا جاتا۔ یہ چٹائیاں کھجور یا اسی طرح کے کسی اور پودے کے خشک پتوں سے بنی جاتی تھیں۔ سارا دن بستی کی گلیوں میں کتے بھونکتے' بچے شور مچاتے اور بکریاں ممیاتی رہتیں۔ میں یہاں سے فرار ہونے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتی تھی۔ خونخوار کتوں اور ان گنت راہزنوں کی زد سے بچ کر اس نامعلوم مقام سے نکل جانا ناممکن تھا۔

غلام سکینہ اب مجھ سے تھوڑی بہت بات کر لیا کرتی تھی۔ ایک رات جب مطلع ابر آلود تھا اور بارش کی ہلکی ہلکی بوچھاڑیں ہوا کے زور سے جھونپڑے کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں۔ غلام سکینہ کے قریب لیٹے لیٹے میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ہولے سے کہا۔

میں نے اپنے لہجے میں التجا کا رنگ سمیٹ کر کہا "سکینہ! تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں کسی دن بتاؤں گی۔"

"کیا بتاؤں گی؟"

"یہی کہ مجھے کس جرم میں یہاں لایا گیا ہے۔"

"اب سو جاؤ......... آدھی رات ہو گئی ہے۔"

سکینہ نے بیزاری سے کہا اور کروٹ بدل کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں اپنی جگہ خاموش لیٹی رہ گئی۔ پھر پتہ نہیں کیوں سکینہ کو مجھ پر ترس آ گیا۔ چند منٹ بعد اس نے رخ دوبارہ میری طرف کیا اور مقامی لہجے میں بولی "ہاں! کیا پوچھنا چاہتی ہو تم؟"

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ سرگوشی میں بولی "دیکھو......... ماں کو کچھ نہ بتانا ورنہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی چمڑی ادھیڑ دے گی۔"

میں نے وعدہ کیا کہ کچھ نہیں بتاؤں گی۔

سکینہ نے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم بے قصور ہو لیکن ہمارے رواج کی مطابق ایسا نہیں ہے۔"

جھونپڑے کی تاریکی میں سکینہ نے سینے سے گہری سانس خارج کی اور بولی "آج سے ڈیڑھ برس پہلے ایک ایسی ہی ابر آلود رات کو ہمارے گھرانے پر قیامت بیت گئی تھی۔ ہمارا پڑاؤ اسی علاقے میں تھا۔ ساتھ والی بستی میں ایک شادی کی رسم تھی۔ حاجت خاں ملکو کی بہن کی شادی تھی۔ میرا والد میری ماں اور میری بڑی بہن نگینہ اس شادی میں گئے ہوئے تھے۔ رات کو کچھ گھوڑ سواروں نے شادی والے گھر پر حملہ کیا۔ اس حملے میں میرا باپ سینے میں گولی لگنے سے جاں بحق ہو گیا جبکہ دو اور شخص بھی شدید زخمی ہوئے۔ گھر سوار جاتے جاتے حاجت خاں کے گھر سے میری بڑی بہن نگینہ کو اٹھا کر لے گئے.........." یہاں

تک کہتے کہتے غلام سکینہ کا لہجہ بھیگ گیا اور وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "میری بہن کی لاش چوتھے روز ایک خشک پہاڑی نالے کے اندر سے ملی۔ ظالموں نے اسے بے آبرو کر کے مار ڈالا تھا......... اور یہ سارا کام اسی غلام خاں کے سگے بھائی نے کیا تھا جس کے پاس تم اور تمہارا شوہر مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمارے قبیلے کا قانون ہے کہ مہمان کے خون کا بدلہ مہمان کا خون ہوتا ہے۔ غلام خان کے گھرانے نے چونکہ حاجت خاں ملکو کے مہمانوں کو قتل کیا تھا لہٰذا حاجت خان بھی اس انتظار میں تھا کہ وہ غلام خاں گھرانے کے مہمانوں کو نشانہ بنائے۔ یہ تمہاری بدقسمتی کہ تم اس آگ کی لپیٹ میں آ گئیں۔ تمہارے اور تمہارے شوہر کے بارے میں حاجت خان کے کارندوں کو بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ صرف بہتر موقع کی تلاش میں تھے۔ تمہاے شوہر کی قسمت اچھی ہے کہ وہ پنجاب سے واپس آنے کے باوجود گھر میں نہیں تھا ورنہ......... اس کا انجام بھی غلام خاں سے مختلف نہ ہوتا۔"

میں نے لرز کر پوچھا "تو......... غلام خاں مر چکا ہے؟"

"ہاں۔"

سکینہ نے میرے بدترین شبہات کی تصدیق کی "غلام خاں اور اس کے بھائی شمشیر گل کی لاشیں ایک ساتھ گری تھیں......... شاید تم بھی اب تک زندہ نہ ہوتیں......... لیکن میری والدہ وہ ظلم نہ دیکھ سکیں جو تم پر میری بہن نگینہ کے بدلے کیا جانے والا تھا۔ انہوں نے تمہیں عیدو خان کے چنگل سے نکال لیا اور حاجت خاں ملکو سے کہا کہ تمہیں ان کے حوالے کر دیا جائے.........!

میں حیرت میں گم یہ روئیداد سن رہی تھی۔ دست قدرت مجھے کن راستوں پر کھینچتا ہوا کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ اب ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں میں اس جھونپڑے کے مکینوں کی قیدی تھی۔

میں نے غلام سکینہ سے پوچھا۔

"اب میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے تم لوگ؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"تمہارے انجام کا فیصلہ اب ماں اور تایا کے ہاتھ میں ہے' میں کچھ کہہ نہیں

سکتی۔"

میں نے پوچھا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ غلام خاں کے وارث مجھے چھڑانے کی کوشش کریں!"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"اگر تم غلام خاں کے وارثوں سے امید لگاؤ گی تو غلطی کرو گی۔ غلام خاں اور اس کے بھائی کی موت کے بعد اب ان کے گھرانے میں ایک بھی ایسا شہ زور نہیں بچا جو بدلہ چکا سکے اور اگر کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔"

میری نگاہوں میں سلیم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ وہ اپنی نئی رائفل تھامے غصے میں کھولتا ہوا ان لوگوں کی تلاش میں ہے جنہوں نے مجھے اس سے دور کیا اور اس کے عزیز دوست کو خاک و خون میں لوٹایا۔ اس کی مصیبت کا سوچ کر میری آنکھیں جلنے لگیں۔

"وہ کیا کرے گا؟"

"کہاں کہاں کی خاک چھانے گا؟"

"اس کی تلاش کا انجام کیا ہو گا؟"

بہت سے زہر میں بجھے ہوئے سوال میری سوچ کو زخمی کرنے لگے۔

.... پھر اسی طرح پورے دو ماہ گزر گئے۔ معلوم نہیں میرے پیچھے کیا ہوا اور کیا نہیں۔ میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ سلیم کو پتہ ہی نہ چل سکا ہو کہ مجھے اغوا کرنے والے کون تھے۔ ممکن تھا غلام خاں کے وارث بھی قاتلوں کو شناخت نہ کر سکے ہوں۔ بہت سے امکانات ہو سکتے تھے۔ توخی خانم کا بیٹا زر گل اب ٹھیک تھا اس کا زخم مندمل ہو چکا تھا مگر چہرہ ہمیشہ کے لئے مسخ ہو گیا تھا۔ رخسار کی ہڈی ٹوٹنے سے منہ عجیب ٹیڑھا سا ہو گیا تھا اور ایک آنکھ دوسری سے چھوٹی رہ گئی تھی۔ وہ ایک خوش شکل نوجوان رہا ہو گا لیکن اب اس کی طرف دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ وہ سارا دن جھونپڑے میں گھسا رہتا' ایک پٹکا اس کے سر پر رہتا۔ جب کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ پٹکے کا گھونگٹ سا نکال لیتا۔ وہ بہت کم بولتا تھا میرے ساتھ بات کرتے ہوئے وہ ہمیشہ اپنا رخ پھیر کر رکھتا۔ وہی بات کرتا جو بے حد ضروری ہوتی اور ضرورت سے زیادہ ایک لحہ مجھے

اپنے حجرے میں نہ رہنے دیتا۔ اس ڈیڑھ مہینے میں میں صرف ایک دفعہ اس کے پاس گئی تھی۔ سکینہ ریوڑ کو لے کر گئی ہوئی تھی جبکہ توخی خانم حکیم کے ہاں تھی۔ زر گل بخار میں پھنک رہا تھا' گہری غنودگی کی حالت میں وہ سکینہ سکینہ پکارنے لگا تھا۔ میں پاس آئی تو بولا "میرا سر پھٹ رہا ہے.......... میرا سر ٹکڑے ہو رہا ہے۔" میں اس کے پاس بیٹھ کر پیشانی دبانے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کراہ کر بیدار ہو گیا مجھے اپنے سرہانے دیکھ کر جیسے اسے کرنٹ سا لگ گیا۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور زور سے بولا۔

"جاؤ.......... جاؤ.......... یہ کیا کر رہی ہو؟"

میں گھبرا کر جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی آئی تھی۔

میں اب محسوس کرنے لگی تھی کہ سکینہ کے ساتھ ساتھ توخی خانم کا رویہ بھی مجھ سے نرم پڑ گیا ہے۔ مجھ سے پہلے جو کنیزوں والا سلوک ہوتا تھا اس میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ دوپہر میں مجھے ایک دو گھنٹے آرام کرنے کا موقع مل جاتا اور صبح دودھ دوہنے میں کبھی سکینہ اور کبھی توخی خانم میری مدد کر دیتیں۔ کھانا بھی اب مجھے پہلے سے اچھا ملنے لگا تھا۔ پھر ایک دن سکینہ نے میری ریشم کی قمیص بھی واپس دے دی اور یوں مجھے جسم کاٹ کھانے والے بوریئے نما کپڑے سے نجات مل گئی۔ میں ان مہربانیوں کی وجہ ٹھیک طرح نہیں سمجھ پا رہی تھی لیکن بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ توخی خانم کیا چاہ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سفید سر عورت کے بارے میں میرے دل میں پیدا ہونے والے تمام اچھے جذبات ٹھٹھر کر مر گئے۔ عورت کی چھٹی حس ایسے معاملات میں بہت تیز ہوتی ہے اور میں تو پھر لحہ لحہ زمانے کی ڈسی ہوئی تھی۔ میں جان گئی کہ توخی خانم مجھے اپنے مجروح چہرہ بیٹے کی زندگی میں داخل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی صورت بگڑ چکی تھی' کوئی خوبصورت لڑکی تو کیا عام لڑکی بھی اسے اپنا شریک زندگی دیکھنا پسند نہ کرتی۔ اپنی اس پریشانی کا حل توخی نے یہ نکالا تھا کہ مجھے موت دینے کی بجائے میری زندگی کو استعمال کیا جائے۔ وہ ایک جہاندیدہ عورت تھی شاید پہلے دن ہی سے وہ اپنے ذہن میں اس مکروہ سوچ کا بیج ڈال چکی تھی۔ مجھے اس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہ درست تھا کہ زر گل میرے ہاتھوں زخمی ہوا تھا لیکن یہ زخم میں نے نہیں اسے اس کے مجرمانہ رویے نے دیا تھا۔ میں اس زخم کا بدلہ چکانے کو ہرگز تیار نہیں تھی۔

پھر ایک روز توخی خانم نے سکینہ کے ذریعے یہ بات مجھ سے کہہ ہی دی۔ سکینہ نے کہا۔

"بھائی زرگل بہت گم صم رہتا ہے۔ بیمار ہونے سے پہلے ایک جگہ اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی' وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ اس کی بیماری کا واحد حل اس کی شادی ہے۔ گھر گرہستی میں پڑ جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن اب اس سے شادی کرے گا کون؟"

میں نے سکینہ کی بات کا رخ پھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار گھوم پھر کر اسی طرف آگئی۔ آخر کہنے لگی۔

"تایا جان تو تمہارے بارے کچھ اور ہی سوچ رہے تھے لیکن ماں نے انہیں روک دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں میری بیٹی کے ساتھ جو بیت گئی سو بیت گئی اب میں کسی اور کی جان کیوں لوں۔ ان کا خیال ہے کہ تم بیٹی بن کر ہمیشہ اسی گھر میں رہو۔"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"ماں کا خیال ہے کہ تم..........بھائی سے.......... میرا مطلب ہے کہ بھائی کے نکاح میں آکر عزت سے اس گھر میں رہو۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری خواہش کے سامنے سر جھکا دوں گی۔ کیسے لوگ ہو تم۔ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

سکینہ نے بھی ترش لہجہ اختیار کیا "یہ بات تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں' یہاں وہی ہوتا ہے جو بستی کا ملک کہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اگر بستی کا ملک ایسا ہی اندھا ہے تو میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

سکینہ چنگھاڑی.......... "لعنت تجھ پر اور تیرے ہوتے سوتوں پر ہزار بار.........."

میری اور سکینہ کی آوازیں سن کر توخی خانم بھی وہاں چلی آئی۔ وہ غصے میں بھری ہوئی تھی۔ آتے ساتھ ہی اس نے ایک چانٹا میرے منہ پر مارا اور برسنے لگی۔ وہ شاید مجھے بری طرح پیٹ ڈالتی لیکن اسی دوران وہ باریش شخص اندر آگیا جس نے اس سے پہلے

حاجت خاں کی بستی میں مجھے حاجت خاں کی مار پیٹ سے بچانے کی کوشش کی تھی اور کوئی وزنی چیز مار کر حاجت خاں کے ہاتھ سے خنجر گرا دیا تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر نورانی صورت شخص تھا۔ ایسا شخص "نیکی" جس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ اس نے توخی خانم کا اٹھا ہوا ہاتھ روکا اور بڑی ہمدردی سے مجھے اپنے بازو کی آڑ میں لے لیا۔ پھر اس نے تحکم سے توخی خانم اور سکینہ کو باہر جانے کو کہا "بیٹی" کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اس کے جادو اثر لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دل بھر آیا۔ ایک مدت بعد یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اپنے کسی بڑے کا قرب نصیب ہوا ہے۔ میں خاموشی سے بیٹھ گئی' باریش شخص نے کہا "میرا نام عصمت اللہ ہے یہاں کے لوگ مجھے ملا عصمت اللہ یا ملا جی کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں یہاں مدرسے میں بچوں کو قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم دیتا ہوں۔ دیکھو تم میری بیٹیوں کی طرح ہوں میں تمہارا برا نہیں چاہ سکتا۔ انسان کو بعض اوقات حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں محدود عقل دی ہے ہم ایک حد سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ ممکن ہے جس چیز کو ہم آج اپنے لئے برا سمجھتے ہوں وہی کل ہمارے حق میں مفید ثابت ہو .... تم جس جگہ آگئی ہو وہاں سے اب واپس لوٹنا آسان نہیں۔ اگر کوئی انہونی نہ ہو جائے تو تمہیں اب یہیں رہنا ہے۔ انسان جس جگہ رہے وہاں کے رسم و رواج کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے اپنی زندگی اور آبرو کے لئے تمہیں خدا کے بعد توخی خانم کا احسان مند ہونا چاہئے۔ سچ پوچھتی ہو تو اس نے تمہیں ایک دردناک انجام سے بچایا ہے۔ یہاں کے رسم و رواج کے مطابق یہ لوگ اب تمہاری زندگی کے مالک ہیں لیکن یہ تم سے زندگی نہیں لے رہے زرگل کی زندگی کے لئے تم سے سہارا مانگ رہے ہیں تو تم ہر لحاظ سے سہارا فراہم کرنے کی پابند ہو۔"

مولوی عصمت اللہ خاں نے اپنی صدری کی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا' اس کاغذ پر سیاہ روشنائی سے کچھ لکھا تھا۔ مولوی عصمت اللہ نے کہا "یہ مقامی جرگے کے سربراہ کی طرف سے ہے۔ اس میں مقامی قانون کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے چہرے پر ایسا زخم لگایا جائے جس سے وہ بدشکل ہو جائے تو اس کے بدلے مضروب ایک عورت کا رشتہ مانگ سکتا ہے اور ضرب لگانے والا شخص یا گھرانہ یہ

رشتہ دینے کا پابند ہوگا۔ اب اس قانون کی رو سے ضروری ہے کہ وہ عزت جو تمہیں توخی خانم کی طرف سے دی جا رہی ہے اسے قبول کر لو۔"

میں نے کہا۔ "مولوی صاحب! اس بستی میں مجھے صرف آپ ہی کی آنکھوں میں سچی ہمدردی اور محبت نظر آئی ہے آپ کو تو میرا دکھ سمجھنا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور مجھے زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ میں توخی خانم کی خواہش کے سامنے کیونکر سر جھکا سکتی ہوں!"

مولوی صاحب میری بات میں وزن محسوس کر رہے تھے اور ان کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آتے تھے۔

وہ بولے "تم سو فیصد ٹھیک بات کر رہی ہو بیٹی.......... اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ میں بھی غلط نہیں کہہ رہا۔ ہم سب اپنی اپنی معاشرت کے قیدی ہیں۔ خود کو خدائی قوانین کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے ہم نے خدائی قوانین کو اپنی روایات اور خواہشات کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے۔ میں.......... میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے رویے میں تھوڑی سی نرمی پیدا کرو۔"

اس موقع پر مولوی عصمت اللہ صاحب نے اپنی آواز ذرا دھیمی کر لی اور بولے "اگر تم اپنی رویے میں نرمی پیدا کرو گی تو توخی خانم سے تمہارے فوری تصادم کا خطرہ ٹل جائے گا۔ اس سے توخی خانم کو سوچنے کا موقع ملے گا اور تم بھی اپنے حالات کو بہتر طور پر جان اور پرکھ سکو گی۔ اللہ بڑا مہربان ہے' ہو سکتا ہے اس دوران کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔"

مولوی عصمت اللہ کی باتوں میں ہمدردی اور غمگساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد تھا جب انہوں نے بڑی دلیری سے میرے اور حاجت خان کے درمیان آکر میری جان بچائی تھی۔ میرا دل چاہا کہ دل و جان سے انہیں اپنا بزرگ سمجھ کر ان سے مشورہ طلب کروں۔

میں نے کہا "مولوی صاحب! اب آپ بتائیں توخی خانم سے میرا رویہ کیا ہونا چاہئے؟"

وہ بولے "تم خاموش رہو تمہاری طرف سے میں بات کروں گا۔ میں اسے بتاتا

ہوں کہ تم نے سوچنے کے لئے کچھ وقت مانگا ہے۔ اور وہ دو تین ماہ تک اس معاملے کو چھیڑنے سے باز رہے' تم بھی کوشش کرو کہ توخی خانم اور سکینہ سے تعلقات ٹھیک رہیں.........."

☆===========☆===========☆

توخی خانم کے کہنے پر میں روز مدرسے میں مولوی صاحب سے دم کرانے جانے لگی۔ ایک دن میں گئی تو مولوی صاحب نے کہا "کل ذرا جلدی آنا۔ ہو سکے تو ظہر کے بعد ہی آجانا۔"

اگلے روز میں عصر سے تھوڑی دیر پہلے مدرسے پہنچی تو مولوی صاحب حجرے میں میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ وہ قدرے بے چین نظر آتے تھے۔ حسب معمول انہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے "تم نے گھر میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی.........؟"

"کیسی تبدیلی مولوی صاحب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کسی بھی طرح کی تبدیلی!؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "توخی خانم نے کل جھونپڑے کی جھاڑ پونچھ کروائی تھی۔ دیواروں پر مٹی کا لیپ کروایا اور......... کل میں نے اور سکینہ نے سارے بستر وغیرہ دھوئے تھے۔"

مولوی صاحب نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولے "دراصل......... کل یہ لوگ زرگل سے تمہاری شادی کر رہے ہیں۔"

یہ اطلاع میرے سر پر بم کا دھماکہ تھی۔ میں حیرت سے مولوی صاحب کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ مولوی صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ساری صورت حال سے باخبر رکھوں گا۔ کسی نے تمہارے بارے میں بڑی سوچ بچار کی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارا تعلق ہمارے قبیلے سے نہیں۔ للذا اس قبیلے

کے قوانین سے قطع نظر تمہیں اپنے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔ اب تم بتاؤ کیا چاہتی ہو؟"

مجھ پر سراسیمگی طاری ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ ایک ایک بات جانتے ہیں پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

مولوی صاحب کچھ دیر سر جھکا کر سوچتے رہے۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"اٹھو......... آؤ میرے ساتھ" میں کسی معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ وہ مجھے لے کر حجرے کے عقبی دروازے سے نکلے اور ایک برآمدہ نما جگہ سے گزر کر ایک جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چند عورتیں موجود تھیں میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں ایک مولوی صاحب کی بیوی اور ایک بیٹی بھی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی بیٹی کو اشارہ کیا وہ اٹھی اور ایک ٹرنک میں سے سفید رنگ کا ٹوپی والا دیسی برقعہ لے آئی۔ مولوی صاحب نے برقعہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"اسے پہن لو۔"

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ دوسری عورتیں بھی شاید میری ہی آمد کی منتظر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جلدی جلدی برقعے پہن لئے یا چادروں کو اس طرح لپیٹ لیا کہ آنکھوں کے سوا چہرے کا کوئی حصہ ظاہر نہ رہا۔ یہ کل پانچ عورتیں تھیں اور پانچوں مولوی صاحب کے اپنے گھرانے سے لگتی تھیں۔ مولوی صاحب نے سب عورتوں کو باہر جانے کی ہدایت کی اور جب میں ان کے ساتھ جھونپڑے میں تنہا رہ گئی تو وہ بڑی شفقت سے بولے "تری پورہ کے مزار پر ایک بزرگ ہستی آئی ہوئی ہے۔ چارباغ سے پیر سید حسن صاحب کے مرید خاص ہیں۔ یہ سب عورتیں وہاں ان کا وعظ سننے جا رہی ہیں تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ۔ چھ سات میل کا فاصلہ ہے تری پورہ سے ایک میل ادھر ایک راستہ مغرب کی طرف نکلتا ہے۔ میری بیوی تمہیں بتا دے گی اس کا اشارہ پاتے ہی تم دوسری عورتوں سے پیچھے رہ جانا۔ وہاں تمہیں دو لڑکے ملیں گے ان کے نام انیس اور رحمان ہیں۔ دونوں حافظ قرآن اور میرے شاگرد ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارے وہاں پہنچنے تک ایک خچر کا انتظام کر لیں گے۔ وہ اس علاقے کی ساری اونچ نیچ جانتے ہیں۔ رات رات میں وہ

تمہیں اس سڑک تک پہنچا دیں گے جو پل کی طرف جاتی ہے۔ صبح نو دس بجے وہاں سے پہلی بس گزرتی ہے' تم باآسانی اس پر سوار ہو سکو گی.........."

مولوی صاحب نے مجھے سب کچھ سمجھا بجھا کر اور کچھ نقد دے کر اپنی عورتوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ عورتیں ایک دوسرے گھر میں پہنچیں۔ یہاں دس پندرہ مزید برقعہ پوش عورتیں تیار بیٹھیں تھیں۔ کچھ دیر بعد عورتوں کا یہ قافلہ تین مسلح نوجوانوں کی معیت میں تری پورہ کے مزار کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ایک دو عورتوں نے مولوی صاحب کی بیٹی سے میرے بارے میں دریافت کیا۔ اس مہربان عورت نے انہیں تسلی بخش جواب دے کر میرے سر سے خطرہ ٹال دیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ ایک نیک گھرانے کی نیک خاتون کو میری خاطر جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے۔

عصر کے کچھ دیر بعد ہم تری پورہ کی طرف تین چار میل کا فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا مگر پھر اچانک سارا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ اچانک عقب میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ دوسری عورتوں کے ساتھ ساتھ میں نے گھوم کر دیکھا سات آٹھ گھڑ سوار تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان میں چادر پوش توخی خانم کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس قافلے کے پیچھے توخی خانم کے آنے کا کیا کام تھا۔ توخی خانم کے ساتھ اس کا جیٹھ اور بستی کا ملک لندو خاں بھی تھا۔ لندو خاں کا چہرہ دور ہی سے بتا رہا تھا کہ وہ غصے سے بھرا ہوا ہے۔ ایک ساعت کے اندر اندر آنے والی مشکل کا سارا نقشہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا اور عورتوں سے علیحدہ ہو کر تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مولوی صاحب کی بیوی یا بیٹی کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ مجھے دور سے لندو خاں کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے گھڑ سواروں کو پکار کر کہہ رہا تھا۔ "روکو ان کو.......... سب کو روکو.........." اس کا اشارہ قافلے کی عورتوں کی طرف تھا۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بستی میں میری غیر موجودگی کا پتہ چل چکا ہے۔ میں نے ٹوپی والا برقعہ اتار کر بغل میں لیا اور تیزی سے نشیب کی طرف بڑھنے لگی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہی ہوں بس یہی خیال تھا کہ اس مقام سے دور چلی جاؤں۔

قریباً دو فرلانگ تک میں اسی طرح بھاگتی چلی گئی۔ پھر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ جس جگہ

میں بیٹھی وہاں قریب ایک کھوہ تھی۔ کھوہ کے دہانے پر پالک کے پتوں جیسی سبزی سی اگی ہوئی تھی۔ ان پتوں کو پھلانگ کر میں نے کھوہ میں جھانکا۔ یہ چھپنے کے لئے ایک نہایت موزوں جگہ تھی۔ لگ رہا تھا جیسے دست قدرت نے یہ پہاڑی اور یہ کھوہ خاص طور پر آج ہی کے دن کے لئے بنا رکھی تھیں۔ اس کی بناوٹ میں اندر چھپنے والے کی ہر سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔ نہ صرف وہ ہموار تھی بلکہ اس کا دہانہ بھی ایسے رخ پر تھا کہ نشیب سے بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا ایسی جگہوں پر کیڑے مکوڑوں کا ڈر رہتا ہے لیکن کھوہ سے باہر بھی تو "زہریلے سانپ" پھنکار رہے تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کھوہ کے اندر چلی آئی اور ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔

چند ہی منٹ بعد مجھے نشیب میں زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس ویرانے میں توخی خانم' لندو خاں اور ان کے کارندوں کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ بلند آواز میں چیخ رہے تھے اور ایک دوسرے کو میری تلاش کے سلسلے میں ہدایات دے رہے تھے۔ نیم تیرگی میں اب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کھوہ کافی کشادہ ہے۔ قریباً ایک درمیانے سائز کے کمرے جتنی اور اس میں پہلے سے کوئی شخص موجود ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا' ایک طرف بجھے ہوئے کوئلے اور راکھ پڑی تھی دوسری طرف ایک بوسیدہ کمبل ڈھیر تھا۔ کمبل کے ساتھ ہی پلاسٹک کی ایک بوتل رکھی تھی جس میں پانی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی چند منٹ پہلے کوئی اس کھوہ میں موجود تھا۔ میں دس منٹ تک یونہی گم صم بیٹھی رہی پھر مجھے دہانے کی طرف قدموں کی آواز آنے لگی۔ اب معلوم نہیں یہ کس کے قدموں کی آواز تھی۔ توخی خانم اور لندو خان کا کوئی کارندہ تھا یا اس کھوہ کا مکین واپس آ رہا تھا۔ کھوہ میں رہنا جتنا خطرناک تھا' کھوہ سے نکلنا اس سے زیادہ خطرناک تھا۔

میں اسی شش و پنج میں تھی کہ کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ فوری طور پر مجھے نہیں دیکھ سکا اور میرے بالکل پاس بیٹھ کر راکھ کے ڈھیر پر لکڑیاں جمانے لگا۔

غالباً وہ اس پناہ گاہ سے لکڑیاں ڈھونڈنے ہی نکلا تھا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر پہلے تو مجھے

شبہ ہوا کہ ایک بار پھر بخشو سولنگی سے ملاقات ہو گئی ہے لیکن نہیں وہ سندھی ڈاکو بخشو سولنگی نہیں تھا۔ ہاں اس کی طرح بھری بھری ڈاڑھی اور چوڑے شانوں والا کرخت چہرہ شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بہت موٹے تلے والے سینڈل تھے۔ کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے آگ روشن کرلی اور یہی وقت تھا جب اس کی نظر پہلی بار مجھ پر پڑی۔ چند لمحوں کے لئے وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ کا عکس تھا۔ اس ماحول میں وہ مجھے بڑا پراسرار سا لگا۔ بالکل کہانیوں کے کرداروں جیسا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے چوکنے انداز میں پوچھا۔ اس کا ہاتھ خود بخود کندھے سے لٹکی رائفل تک پہنچ گیا تھا۔ پھر جیسے میرے جواب دینے سے پہلے ہی ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یقیناً وہ پہاڑی سے نیچے گھڑسواروں کو میری تلاش میں ادھر ادھر گھومتے دیکھ چکا تھا۔ اس نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھنکار کر بولا۔

"کون ہو تم؟ کیا چوری کرکے آئی ہو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیوں چھپی ہوئی ہو یہاں؟"

"وہ لوگ مجھے اغوا کرکے یہاں لائے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"پاؤندہ بستی والے۔"

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ اجنبی اور میں صاف شستہ اردو میں بات کر رہے ہیں۔ وہ شکل و صورت سے بھی پنجاب ہی کا باشندہ لگتا تھا۔ اس کے دو دانت دائیں جانب سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بات کرتے ہوئے یہ خلا صاف نظر آتا تھا۔ عمر کوئی پینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ لہجے سے مجھے سیالکوٹ کے علاقے کا لگا۔ جتنی حیرت وہ مجھے دیکھ کر محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے جو قانون سے بھاگ کر اس علاقے میں چھپا ہوا ہے۔ علاقہ غیر میں کسی ایسے چہرے کا نظر آ جانا بڑی بات نہیں تھی۔ اسے ایک سنگین اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا کہ پاؤندہ بستی والوں سے بھاگ کر میں نے جس "محفوظ" پناہ گاہ میں پناہ لی تھی وہاں پہلے سے ایک شخص پناہ لئے ہوئے تھا'

اور اس جرائم پیشہ شخص سے اس تنہا مقام پر کسی بہتری کی توقع رکھنا عبث تھا۔ لیکن مسئلہ پھر وہی تھا اگر اندر سانپ تھا تو باہر بھی زہریلے حشرات تھے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ توخی خانم اور عمرشاہ لندو اتنی جلدی میرا پیچھا چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ وہ ابھی یقیناً اسی علاقے میں موجود تھے۔

.... ہم زبان اور ہم لہجہ ہونے کے ناطے میرے اور اجنبی کے درمیان ایک بے نام سا تعلق پیدا ہو گیا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے امید پیدا ہو چلی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس پناہ گاہ میں کچھ وقت گزار سکوں گی۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں پنجاب میں کہاں کی رہنے والی ہوں۔ میں نے لاہور کا بتایا تو جیسے اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے گلی محلہ پوچھا۔ میں نے اچھرہ کا ایک فرضی پتہ بتا دیا۔ اس نے دریافت کیا کہ میں یہاں کیسے پہنچی ہوں۔ اس صورت حال کے لئے میں نے ایک مختصر سی کہانی پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔ یہ ایک ویسی ہی کہانی تھی جیسی اغواء کے حوالے سے ہر روز اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ وہ اس کہانی سے قدرے متاثر نظر آنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اس کی انگارہ آنکھوں میں شک کی چنگاریاں بجھ سی گئی ہیں۔

ہماری گفتگو کے دوران نشیب میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ یہ آوازیں میرے رگ و پے میں سردی کی لہر دوڑا رہی تھیں۔ یہ وہی کتے تھے جو میں نے تھوڑی دیر پہلے خانہ بدوش گھڑسواروں کے ساتھ دیکھے تھے۔ اجنبی کی آواز نے مجھے چونکا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا نام ضامن علی ہے۔ کاموکی کا زمیندار ہوں۔ چچیرے بھائیوں سے پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ دونوں طرف سے کئی آدمی مارے جا چکے ہیں۔ دشمنی کی اس آگ سے نکل کر یہاں آ گیا ہوں۔ پارہ چنار میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول رکھا ہے ہوٹل کے اوپر ہی رہائش ہے جہاں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ کل رات تری پورہ میں اپنے ایک واقف کار سے مل کر آ رہا تھا کہ تیز بارش شروع ہو گئی۔ مجبوراً اس جگہ رکنا پڑا۔ چند فرلانگ آگے ایک برساتی نالہ ہے۔ بارش کے بعد اس کا پانی بہت چڑھ گیا ہے۔ کل صبح تک پانی کا زور ٹوٹ جائے گا تو چلا جاؤں گا۔"

ضامن علی نے مجھے اپنی باتوں سے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کی

باتوں میں وزن بھی تھا لیکن اس کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس پر یقین نہ کر سکی۔ میرا خیال یہی تھا کہ جس طرح میں نے اسے ایک کہانی سنائی ہے۔ جواباً اس نے بھی ایک کہانی سنا دی ہے۔ ضامن علی نے مجھے مشورہ دیا کہ کم از کم آج رات مجھے یہاں سے نہیں نکلنا چاہئے۔ اس کی بات ماننے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میری نیم رضامندی دیکھ کر اس نے کھوہ کے ایک حصے سے کنکر وغیرہ ہٹا کر میرے لئے جگہ صاف کر دی اور بولا۔

"تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔ میں آج سارا دن سوتا رہا ہوں۔ اس لئے نیند نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا "نیند تو مجھے بھی نہیں آئی" ضامن علی کے پاس سے اٹھ کر میں کھوہ کے دھانے کے پاس جا بیٹھی۔ یہاں سے تاروں بھرا آسمان نظر آرہا تھا اور کھوہ کے اندر جلتی آگ اور اس آگ میں دمکتا ہوا ضامن کا چہرہ بھی۔ کھوہ کی نیم گرم فضا کے مقابلے میں یہاں سردی تھی لیکن میں اس جگہ خود کو زیادہ آزاد اور با آرام محسوس کر رہی تھی۔ دور نیچے گھڑ سواروں اور کتوں کی چیخ و پکار سرد اندھیرے کے سمندر میں دم توڑ چکی تھی۔ کم از کم ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر تو وہ موجود نہیں تھے۔ گرد و پیش پر چھائے ہوئے گہرے سکوت کو محسوس کر کے میرا خوف مسلسل کم ہو رہا تھا۔ پتھر سے ٹیک لگا کر میں گم سم بیٹھ گئی۔ ضامن آگ کے قریب نیم دراز ہو چکا تھا۔ میرے پاس وہ نقدی موجود تھی جو بوقت رخصت مجھے مولوی عصمت اللہ نے دی تھی۔ یہ تقریباً تین سو روپے تھے۔ میں نے سوچا مجھے یہ پیسے کہیں محفوظ کر دینے چاہئیں۔ بیٹھے بیٹھے میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ سنگلاخ دیواروں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں جس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی ہوں اس کا ایک پتھر اپنی جگہ سے ہل رہا ہے۔ میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ ایک تکونا سا پتھر کسی رخنے میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے پتھر کو باہر کھینچا تو ایک قدرتی طاق سا نظر آیا۔ یہ جگہ کچھ زیادہ محفوظ تو نہیں تھی لیکن نہ ہونے سے بہتر تھی۔ میں نے روپے اس سوراخ نما طاق میں رکھنے کے بعد پتھر دوبارہ اس کے منہ پر لگا دیا۔

وہ ساری رات میں نے اسی طرح بیٹھے ہوئے گزار دی۔ دو تہائی شب تک تو آنکھ بھی نہیں جھپکی لیکن آخری پہر کبھی کبھی اونگھ آتی رہی۔ اس نیم غنودگی میں عشرت، سلیم،

خان رحیمی اور دینو کے چہرے بار بار تصور میں ابھرے۔ میں نے عشرت کو دیکھا جو بستر مرگ پر اپنی بیماری سے دیوانہ وار جنگ کر رہی تھی۔ سلیم نظر آیا جو بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ مجھے ڈھونڈ رہا تھا اور میرا نام پکار رہا تھا۔ خان رحیمی، نواز حسنی اور دینو سب اپنے اپنے انداز میں مجھ سے ہمکلام ہوئے اور مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کہاں ہوں؟ مجھے کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ مجھے پرندوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ نظر آیا۔ جو سینکڑوں سنہری شاہین اور عقاب تھے وہ آسمان پر ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں چکرا رہے تھے۔ یہ دائرہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہا تھا اور پرندوں کے خوبصورت پر سرما کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ایک عجیب وضع کے درخت تلے مجھے اپنا ننھا فرحان بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ محویت سے پرندوں کی اڑان دیکھ رہا تھا۔ اس کے نرم ہونٹوں پر تبسم اور ننھی منی آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا.......... حیرت جو بچے کی آنکھوں کا سب سے حسین عنصر ہوتی ہے۔ اچانک پرندوں کے جھنڈ سے دہاب چنگیزی کا شیطانی چہرہ نمودار ہوا۔ فرحان چیخ مار کر زمین میں سما گیا اور پرندے چلاتے ہوئے مختلف اطراف میں اڑ گئے۔

"اٹھو.......... اٹھو" کوئی میرا شانہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا ضامن علی یا جو بھی اس کا نام تھا کندھے سے بندوق لٹکائے کھڑا تھا۔ میرے کانوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ گونجی۔ طویل رات کٹ چکی تھی۔ کھوہ کے دہانے سے لے کر دور نیچے سرسبز پودوں تک اجالے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن روشنی کی ہراول کرنیں نشیب و فراز کو منور کر رہی تھیں۔

ضامن علی بولا "تم ابھی اندر ٹھہرو۔ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر راستہ صاف ہوا تو ابھی نکل چلیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی چلی جانا۔ یہاں سے تو نکلو۔" وہ قدرے جھلاہٹ سے بولا اور لمبے ڈگ بھرتا نشیب کی طرف چلا گیا۔ میں کھوہ میں آ گئی۔ آگ دیر ہوئی سرد ہو چکی تھی۔ میں آگ جلانے کا سوچ رہی تھی جب اچانک مجھے وہ رقم یاد آئی جو رات میں نے طاق میں چھپائی تھی۔ ضامن کے لوٹنے سے پہلے مجھے وہ روپے نکال لینے چاہئے تھے۔ میں اس تکونے پتھر

کے پاس پہنچی اور احتیاط سے اسے باہر کھینچ لیا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو روپے موجود تھے۔ میں نے نکال کر لباس میں رکھ لئے۔ احتیاطاً جھک کر ایک بار پھر طاق میں دیکھا تو کچھ اور کاغذ نظر آئے............ یہ میں نے تو ہرگز نہیں رکھے تھے۔ دوبارہ ہاتھ ڈال کر میں نے یہ کاغذ نکالے۔ ایک شناختی کارڈ تھا ایک چھوٹی سی کاپی تھی' ایک لائسنس تھا۔ میں نے یہ کاغذات دیکھے اور جان کر حیران رہ گئی کہ ضامن علی وہ نہیں جو میں اسے سمجھ رہی ہوں اور نہ ہی وہ ہے جو وہ خود کو بتا رہا ہے۔ اس کی اصلی حقیقت ان کاغذات سے آشکار ہو رہی تھی۔ اس طاق نما جگہ کو محفوظ جان کر اس نے یہ کاغذات یہاں رکھے تھے اور اپنے روپے رکھنے کے لئے میری نگاہ انتخاب بھی اس طاق پر پڑی تھی۔ بالکل جیسے اس کھوہ کے سلسلے میں ہوا تھا............ ان کاغذات سے ظاہر ہوتا تھا کہ جسے میں مفرور مجرم سمجھ رہی ہوں وہ ایک پولیس انسپکٹر ہے جو ایک مفرور کے بھیس میں یہاں کسی شخص کی تلاش میں آیا ہے۔ میں سرتاپا لرز گئی۔ اب میرا یہاں ایک لمحہ بھی رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے کاغذات جلدی جلدی طاق میں واپس رکھے' پتھر کو اس کی جگہ ٹکا کر واپس مڑی تو ضامن علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھوہ کی طرف آ رہا تھا۔ میں بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ ضامن علی کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اچھی طرح دیکھ آیا ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ نالے کا پانی بھی اترا ہوا ہے۔ ہم باآسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔

میں نے پوچھا "یہاں نزدیک کوئی پولیس اسٹیشن ہے؟"

وہ بولا۔ "پولیس اسٹیشن تو ہے لیکن نزدیک نہیں۔ قریب ترین اسٹیشن ٹیل پور کا ہے۔ جس کا فاصلہ کم و بیش تیس میل ہے۔"

میں نے چہرے سے مایوسی ظاہر کی لیکن دل میں مطمئن ہو گئی۔ وہ بولا "اور میرے خیال میں تمہارا براہ راست پولیس تک جانا ٹھیک بھی نہیں۔ بہتر ہے کہ تم پہلے اپنے وارثوں سے رابطہ قائم کر لو۔"

میں نے اس رائے پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھوہ سے نکل کر ہم نشیب میں پہنچے اور ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے برساتی نالے کے کنارے آ گئے پانی اتر چکا تھا۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں چل کر ہم نے نالہ پار کیا اور شمال مغرب کے رخ پر آگے بڑھنے لگے۔ ضامن علی ان پیچ دار راستوں کا شناور تھا۔ وہ ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جن

پر کسی سے مڈبھیڑ ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ چند میل آگے آ کر اس نے ایک واقف کار زمیندار کے ڈیرے سے دو خچر حاصل کئے۔ اب ہمارا سفر سہل اور تیز ہو گیا۔ اس رات نو دس بجے کے لگ بھگ ہم پارہ چنار کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک قابل زراعت علاقہ تھا۔ ایک اہرام نما پہاڑی کے دامن میں دو چھوٹی چھوٹی بستیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں ہماری مڈبھیڑ پانچ مسلح افراد سے ہوئی۔ پہلے تو میں ڈر گئی لیکن پھر پتہ چلا کہ یہ لوگ ضامن علی کو جانتے ہیں۔ انہوں نے ضامن علی سے میرے بارے میں چند سوال کئے اور آگے بڑھ گئے۔ ضامن نے بتایا کہ یہ پہریدار تھے۔ یہاں لوگ اس طرح گروہوں کی شکل میں رات کا پہرہ دیتے ہیں۔ بستی کی حدود کے پاس ایک اونچے مینار نما مورچے میں ایک پہریدار نظر آیا۔ اس نے اچھی طرح شناخت کرنے کے بعد ہمیں آگے جانے دیا۔

تھکاوٹ اور سردی سے برا حال تھا۔ جب ضامن علی نے خچر ایک بڑے دروازے کے سامنے روکا تو مجھے امید پیدا ہوئی کہ اب اس جان لیوا سفر سے جان چھوٹ جائے گی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ہمارا یہ سفر اختتام پذیر ہو چکا تھا............ اس پھاٹک کے پیچھے ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ کم از کم تین ایکڑ زمین تھی احاطے کے ایک کونے میں درمیانے سائز کا ایک مکان تھا۔ پھاٹک پر موجود مسلح چوکیدار ہمیں اس مکان تک لے گیا۔ یہاں ہمارا استقبال چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے ایک فربہ اندام پٹھان نے کیا۔ اس کا نام مان شاہ تھا۔ مان شاہ کی آنکھ میں پھولا تھا۔ دیکھنے میں وہ شخص بھدا لگتا تھا لیکن بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی "بہن جی............ بہن جی" کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ ضامن علی کا اصل ٹھکانہ یہی ہے۔ یہاں ایک کمرے میں اس کا بستر' اٹیچی کیس اور دیگر سامان بھی رکھا تھا۔ ضامن علی اور مان شاہ کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی اور مان شاہ مجھے لے کر مکان کے زنان خانے میں آ گیا۔ یہاں چند عورتیں اور بچے موجود تھے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ ایک نوجوان عورت جو مان شاہ کی چھوٹی بیوی تھی مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ ان لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ میں پنجابی ہوں اور پشتو زبان نہیں جانتی۔ گھر کی عورتیں بس اتنا ہی جانتی تھیں کہ میں ضامن علی کے ساتھ آئی ہوں۔ ضامن علی ان کے نزدیک کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اس حوالے

سے میں بھی ان کے نزدیک مشکوک تھی۔ ایک بوڑھی عورت کا خیال تھا کہ میں اغوا ہو کر یہاں نہیں پہنچی بلکہ ضامن علی سے میرا پرانا ناطہ ہے۔ مجھے یہ سب باتیں خاموشی سے برداشت کرنا تھیں' اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ کھانا کھلانے کے بعد میرے لئے ایک کمرے میں بستر بچھا دیا گیا۔ میں تھکے ہوئے ذہن اور چور چور جسم کے ساتھ لیٹ گئی۔ آتش دان کی آگ کمرے کو نرم حرارت سے بھر رہی تھی اور توقع تھی کہ اجنبی مقام کے باوجود مجھے جلد ہی نیند آجائے گی لیکن پھر کہیں پاس سے آنے والی آوازوں نے مجھے جاگتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آوازیں گھر کی عورتوں کی تھیں۔ وہ کسی ساتھ والے کمرے میں بیٹھی تیز تیز لہجوں میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ ان کی گفتگو کا ایک موضوع تو میں تھی۔ دوسرا موضوع کچھ پراسرار اور چونکا دینے والے واقعات تھے۔ وہ علاقے میں ہونے والی قتل کی وارداتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ وارداتوں کا یہ سلسلہ پچھلے پانچ چھ ماہ سے جاری تھا۔ تمام افراد کو رات سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔ بیشتر افراد کی پیشانی پر گولی ماری گئی تھی۔ طریقہ واردات سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ قتل ایک ہی گروہ یا شخص نے کئے ہیں۔ مان شاہ کے گھر کی عورتیں ان وارداتوں کا سلسلہ کسی اللہ والے کے مزار کی بے حرمتی سے جوڑ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قتل کسی انسانی ہاتھ سے نہیں ہوئے۔ ان کے لہجوں میں خوف تھا اور وہ گفتگو کے دوران بار بار اللہ توبہ کرنے لگتی تھیں۔ عورتوں کی گفتگو سے پتہ چلا کہ اس سلسلے کی آخری واردات (اگر یہ واقعی سلسلہ تھا) صرف تین روز قبل اسی بستی کے شمال میں ہوئی ہے' جہاں رحیم نامی ایک شخص کو پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا ہے۔

ایک ماہ پہلے رحیم کا ایک قریبی دوست بھی اسی طرح قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں دم توڑ چکا تھا۔ اس قتل نے رحیم کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا اور وہ سخت خوفزدہ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آبائی مکان بیچ کر اس علاقے سے کہیں اور جانے کا سوچ رہا تھا۔ مکان کا سودا بھی ہو چکا تھا اور چند روز تک اسے رقم ملنے والی تھی۔ پرسوں رات وہ گھر میں اکیلا تھا۔ اس کی بیوی تین بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی۔ رحیم کو تنہا رات گزارتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہمسائے سے کہا کہ آج رات وہ اس کے گھر سو رہے۔ ہمسایہ آمادہ ہو گیا۔ وہ دونوں رات ایک ہی کمرے میں سوئے رہے۔ ہمسایہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔

علی الصبح وہ اٹھ کر مسجد کی طرف چلا گیا۔ اجالا پھیلنے پر وہ واپس آیا تو رحیم اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا۔ اس بستی میں یہ دوسرا اور علاقے میں ساتواں قتل تھا۔ لوگ بے حد خوفزدہ نظر آتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مقامی پولیس کاغذی کارروائی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہی۔ مجھے وہ پہریدار یاد آئے جو کل رات بستی میں داخل ہوتے ہوئے میں نے دیکھے تھے۔ دراصل وہ لوگ حفاظت خود اختیاری کے تحت پہرے پر تھے۔ بے یقینی کی یہ فضا پوری بستی میں چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

وہ ساری رات بھی میں نے سوتے جاگتے گزار دی۔ اگلی صبح ناشتے وغیرہ کے بعد مان شاہ مجھے زنان خانے سے مردانے میں لے گیا۔ یہاں ایک علیحدہ کمرے میں ضامن علی بھی موجود تھا۔ ضامن علی.......... نے مجھ سے پوچھا کہ اب میں کیا چاہتی ہوں؟ وہ بولا۔

"اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ لاہور سے اپنے کسی وارث کو یہاں بلا لو تاکہ ساری صورت حال کا علم ہو جائے اور تمہارے لئے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔"

میں نے کہا "میں لاہور جانا چاہتی ہوں اور نہ کسی عزیز کو یہاں بلانا چاہتی ہوں۔"

ضامن اور مان شاہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جواب یونہی نہیں دے دیا تھا۔ رات میں نے اس بارے میں بے حد سوچ بچار کی تھی اور ایک آخری فیصلے پر پہنچ گئی تھی یہ وہی فیصلہ تھا جس نے آج تک مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا اور جس کے لئے میں نے ان گنت راتیں ذہنی کرب میں تڑپتے گزار دی تھیں۔ قدرت نے یہ فیصلہ میرے لئے خود بخود آسان کر دیا تھا۔ سلیم پر جو آفت ٹوٹنا تھی وہ ایک بار ٹوٹ چکی تھی۔ وہ مجھے کھو چکا تھا۔ اس کے خواب بکھر چکے تھے۔ وہ سب کچھ ہو چکا تھا جو میرے "فیصلے" کے بعد ہونا تھا.......... اب دانشمندی یہی تھی کہ میں اسے دوبارہ اس اذیت سے گزارنے کا سامان نہ کروں۔ اس نے جتنا رونا ہے ایک ہی بار رو لے۔ میری ذات کو جتنا کوسنا ہے ایک ہی بار کوس لے۔ ایک ہی بار دیوانہ ہو کر مجھے تلاش کر لے اور ایک ہی بار صبر و برداشت کے پتھر دل پر رکھ کر بیٹھ جائے۔ میں اب سلیم کی خاطر اس کی محترم والدہ کی خاطر اپنی ذات کو اور فریب نہیں دے سکتی تھی۔ جھوٹی محبت اور خود سپردگی کا کھیل اور نہیں کھیل سکتی تھی.......... آہ کیسے عذاب ناک لمحے ہوتے تھے وہ جب رات کی تنہائی میں میرے اور

سلیم کے درمیان تاریک ریشم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ خاموشی نغمہ بن کر اس خوبصورت مکان کی دیواروں میں گونجتی تھی اور آتشدان کی حرارت فضا کو زندگی سے معمور کردیتی تھی۔ ایک ننھی سی آواز میرے کانوں میں ٹکراتی تھی۔

"امی دان! میں اکیلا ہوں۔ میری قبر تاریک اور ٹھنڈی ہے۔ میں سخت زمین پر پڑا ہوں۔ مجھے بھول گئی ہو امی دان.......... اپنے فرحان کو بھول گئی ہو نا؟"

میں لرز کر رہ جاتی تھی۔ گداز بچھونا اور نرم حرارت میرے لئے دنیا کی سب سے قابل نفرت چیزیں بن جاتی تھیں۔ میں خود کو ملامت کرتی تھی اور دل ہی دل میں آنسوؤں کے آبشار گراتی تھی.......... اب کسی بہانے سے ہی سہی میرے جسم کے گرد سلیم کی ازدواجی محبت کا پنجرہ ٹوٹ گیا تھا۔ اب میں دوبارہ اس پنجرے میں جانا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے کھوہ کی "پناہ گیری" کے دوران ضامن علی کو جو کہانی سنائی تھی اس میں بتایا تھا کہ ایک بھائی کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی قریبی عزیز نہیں اور شاید وہ بھی بہ احسن طریق میری حفاظت نہ کر سکے۔ (اور ایک طرح یہ بات درست تھی) لہٰذا جب مان شاہ اور ضامن علی کے سامنے میں نے یہ کہا کہ میں نہ لاہور جانا چاہتی ہوں اور نہ ہی کسی کو یہاں بلانا چاہتی ہوں تو ضامن علی کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

مان شاہ نے کہا "لیکن بیٹی، ہم تمہیں اپنے پاس کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"میں خود بھی آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ ایک دو ہفتوں میں میں اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔"

مان شاہ بولا "ایک دو ہفتوں کی تو کوئی بات نہیں بیٹی.......... تم ایک دو ماہ بھی رہ سکتی ہو۔ لیکن بالآخر تمہیں کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہوگا۔"

.... اس بات چیت کے بعد میں نے وہیں مان شاہ کے گھر میں دو ہفتے گزار دیئے۔ وقتاً فوقتاً ضامن علی بھی نظر آجاتا تھا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ یعنی پارہ چنار میں اس کا کوئی ہوٹل تھا اور نہ بیوی بچے۔ وہ مفرور مجرم کے بھیس میں یہاں آیا تھا اور مان شاہ کے پاس رہ رہا تھا۔ اس کے پولیس انسپکٹر ہونے میں

مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں تھا۔ اس کی مصروفیات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ پولیس انسپکٹر ہے اور کسی چکر میں یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ (گمان غالب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں میرے سوا اور کسی کو معلوم نہیں)

ایک رات جب مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور میں برآمدے میں ٹہل رہی تھی اچانک چھت پر دھم دھم کی آواز آئی۔ میں نے صحن میں نکل کر دیکھا ایک سایہ منڈیر کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا مردانے کی چھت پر کود گیا۔ وہ مقامی لباس یعنی شلوار کرتے میں نہیں تھا اور اس علاقے میں پتلون قمیض میں نے ضامن کے علاوہ کسی کے جسم پر نہیں دیکھی تھی۔ وہ یقیناً ضامن علی ہی تھا.......... اگلے دس پندرہ روز کے اندر چھوٹے چھوٹے کئی واقعات کے سبب میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ضامن علی کی یہاں موجودگی کی اصل وجہ وہی خوف و ہراس ہے جو علاقے کے لوگوں میں پھیلا ہوا ہے اور جس کا سلسلہ پر تشویش وارداتوں سے جوڑا جا رہا ہے۔

وہ ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ میں کنبے کی دوسری عورتوں کے ساتھ گھر کے صحن میں بیٹھی گندم صاف کر رہی تھی۔ ہاتھ کام میں مصروف تھے اور ذہن سوچوں میں گم۔ مجھے یہاں آئے ہوئے اب تقریباً ایک مہینہ ہو چلا تھا۔ میں جانتی تھی اس عرصے میں سلیم میرے لئے بہت بھاگ دوڑ کر چکا ہوگا۔ اس نے ہر وہ کوشش کر دیکھی ہوگی جو وہ کر سکتا تھا.......... اور اب وقت تھا کہ میں اپنی پناہ گاہ سے نکلوں اور اپنی تمام حسرتوں اور آرزوؤں کو سمیٹ کر جھنگ کے اس گاؤں میں پہنچ جاؤں جہاں مجھے اپنے بچے کے لئے انصاف مل سکتا تھا۔ جہاں وہاب کی منحوس گردن اس تیز دھار آلے کی زد میں آسکتی تھی جسے میں اب تک سنبھال سنبھال کر اپنے پاس رکھ رہی تھی۔ اس آلے کی دھار میرے پاس وہاب کی امانت تھی اور میں یہ امانت جلد از جلد اس کی منحوس شہ رگ کو لوٹا دینا چاہتی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب میرے ساتھ کام کرتی ہوئی ایک نوکرانی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں یہ خبر سنائی کہ رات پستول صاف کرتے ہوئے مالک کے کندھے پر گولی لگ گئی ہے۔ مالک سے اس کی مراد مان شاہ تھا۔ یہ خبر سن کر مجھے حیرت ہوئی میرے پوچھنے پر نوکرانی نے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ معمولی زخم آیا تھا۔ گولی بھی خود

نکل گئی تھی۔ اب مالک شہر ٹیکہ لگوانے گئے ہوئے ہیں.......... ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ ساری عورتیں کام چھوڑ کر اندر بھاگیں۔ کمرے میں مان شاہ کی چھوٹی بیوی زارو قطار رو رہی تھی اور پاس ہی ایک ادھیڑ عمر ملازم خاموش کھڑا تھا۔ وہ خود بھی سخت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ عورتوں نے مان شاہ کی چھوٹی بیوی کو گھیر لیا۔ کوئی اسے چپ کرانے لگی کوئی رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ وہ مسلسل دہائی دیئے جا رہی تھی اور ہاتھ مل مل کر کہہ رہی تھی۔ "خدایا اب کیا بنے گا' یا اللہ اب کیا ہوگا۔"

اس کمرے میں مان شاہ کی چھوٹی بیوی اور دوسری عورتوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے انکشاف ہوا کہ رات مان شاہ کو گولی لگی نہیں بلکہ ماری گئی ہے.......... عورتوں سے جان بوجھ کر یہ بات چھپائی گئی تھی اور اس سے بھی تشویشناک اطلاع یہ تھی کہ قاتلانہ حملہ اسی انداز میں ہوا تھا جس انداز میں اس سے پہلے سات آٹھ وارداتیں ہو چکی تھیں۔ قاتل حسب سابق ایک ہی تھا۔ اس نے 38 بور کے ریوالور سے مان شاہ پر گولی چلائی تھی۔ لیکن مان شاہ جاگ رہا تھا اس نے خود کو بچا لیا اور قاتل پر جھپٹا۔ قاتل نے اسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا اور کھلے دروازے سے بھاگ نکلا۔ موقع سے پاؤں کے جو نشان ملے تھے وہ کھوجی کے بیان کے مطابق وہی تھے جو اس سے پہلی وارداتوں میں دیکھے گئے تھے۔ یہ ایک ماہر کھوجی تھا اور علاقے میں اس کی بات پر بہت اعتبار کیا جاتا تھا۔ مان شاہ کی چھوٹی بیوی کو واردات کے بارے میں یہ ساری باتیں اس ملازم نے بتائی تھیں جو اب روتی پیٹتی عورتوں کے پاس خاموش کھڑا تھا۔

کچھ دیر بعد مان شاہ قصبے سے مرہم پٹی کرا کے واپس آ گیا۔ ضامن علی کے علاوہ دو مسلح محافظ بھی اس کے ساتھ تھے۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ مان شاہ کا سرخ و سپید چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ نامعلوم سفاک قاتل کے نشانے پر آ جانا معمولی بات نہیں تھی۔ انسان ظاہری خطرے کا سامنا تو ہمت سے کرتا ہے لیکن اندھیرے کا تیر ہر کسی کو خوفزدہ کر دیتا ہے.......... جب ساری عورتیں مان شاہ کے گرد جمع تھیں اور اپنی اپنی ہراساں آوازوں میں واویلا کر رہی تھیں مان شاہ کی والدہ جس کی عمر پچاسی نوے کے لگ بھگ تھی صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اسے زمین سے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا گیا۔ اس کی سانس

بڑی مشکل سے آ جا رہی تھی۔ سب کو فکر لاحق ہوئی کہ اماں جی کا چل چلاؤ ہو گیا ہے۔ اسی وقت بستی کے حکیم کو بلایا گیا۔ وہ چند الٹی سیدھی دوائیں دے کر چلا گیا۔ ان دواؤں سے بوڑھی عورت کی حالت اور بگڑ گئی۔ اس کے گلے کی خرخراہٹ سارے گھر میں گونجنے لگی۔ ماحول تو پہلے ہی خوفناک سا ہو رہا تھا اس نئی افتاد نے گھر کی سب عورتوں کو دہشت زدہ کر دیا اور انہوں نے وضو کر کے گھر کے کونے کھدروں میں مصلے بچھا لئے اور وظائف شروع کر دیئے۔ میں نے ایک عورت کو کہتے سنا وہ بڑے دعوے سے کہہ رہی تھی کہ بیمار کے گلے سے نکلنے والی ایسی آواز بھوت پریت کی نشانی ہوتی ہے' ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایک دوسری عورت نے تو مریضہ کے بستر کے گرد منڈلاتا ہوا ایک تاریک سایہ بھی دیکھ لیا۔ ان عورتوں کی توہم پرستی دیکھ کر میری حیرت گم ہو رہی تھی۔ سادہ لوحی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لگتا تھا یہ عورتیں ہر حد پار کر چکی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ گھر میں بدروحیں گھس آئی ہیں اور اب کسی نہ کسی کی لاش لے کر جائیں گی۔ بوڑھی عورت جاں بلب تھی لیکن کوئی اس کے قریب نہیں آ رہا تھا۔ ضامن علی کے پاس کچھ ایلوپیتھک دوائیں تھیں اس نے بوڑھی عورت کو ایک اینٹی بائیوٹک دیا جس سے تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ یہ دیکھ کر مان شاہ نے ضامن علی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ رات زنان خانے میں اس کی ماں کے پاس رہے۔

آدھی رات کو ضامن علی نے اندرونی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں مان شاہ کی بیوہ بھاوج کے قریب چارپائی ڈالے سو رہی تھی' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ضامن علی نے باہر سے آواز دے کر بتایا کہ اماں جی کی طبیعت پھر بگڑ گئی ہے' گرم پانی کی ضرورت ہے۔ میں پانی گرم کرنے کے لئے باورچی خانے کی طرف چلی گئی بوڑھی عورت کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل کر پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی مگر گھر کا ماحول ایسا بن گیا تھا کہ خواہ مخواہ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ گھر کی عورتوں کی حالت تو بہت بری تھی۔ اٹھ کر تیمارداری کرنا تو کجا' وہ اپنے لحافوں میں سے سر باہر نہیں نکال رہی تھیں۔ میں نے خود ہی پانی گرم کیا اور لے کر مریضہ کے کمرے میں پہنچی۔ ضامن علی نے پانی ربڑ کی بوتل میں ڈال کر عورت کے پہلو میں ٹکور شروع کی۔ ہم دونوں اہل خانہ کی سادہ لوحی اور بے حسی پر تبصرہ کرنے لگے۔ جیسے اہل خانہ کوئی بات چھپانے کے لئے ٹھیٹ

پشتو بولتے تھے ہم بھی رازداری کے خیال سے ٹھیٹ پنجابی بول رہے تھے۔

میں نے ضامن سے کہا "آخر یہ کیا چکر ہے۔ کیا واقعی یہ سارے قتل ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں؟"

وہ پرسوچ لہجے میں بولا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم نہیں کہہ سکتے تو اور کون کہہ سکتا ہے۔"

بات میرے منہ سے نکل گئی تو اندازہ ہوا کہ نہیں نکلنی چاہئے تھی۔

"کیا مطلب.........؟" ضامن نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں......... میرا مطلب ہے تم اس علاقے کی ساری اونچ نیچ جانتے ہو۔"

"دیکھو تم بات بدل رہی ہو' میں اتنا بچہ نہیں ہوں۔"

"پتہ نہیں تمہارے دل میں کیا چور ہے۔ میں نے تو سیدھی بات کی تھی۔"

"سیدھی بات تم نے کی نہیں۔ تمہارے منہ سے نکل گئی ہے۔ میرا خیال ہے.........."

"کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں کچھ دیر اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر پراعتماد لہجے میں بولی "ہاں......... میں جان چکی ہوں۔ تم پولیس انسپکٹر ہو اور یہاں کسی کیس کی تفتیش کر رہے ہو۔"

اس نے منہ اوپر اٹھا کر ایک گہری اور طویل سانس لی۔ پھر نہایت سنجیدہ لہجے میں مجھے میرے فرضی نام سے مخاطب کر کے بولا۔

"شاہدہ......... یہ بات صرف......... صرف تیرے اور میرے درمیان رہنی چاہئے۔"

"میری طرف سے بے فکر رہو انسپکٹر ضامن' میں جانتی ہوں تمہارے لئے رازداری ضروری ہے۔"

وہ کچھ دیر براہ راست میری طرف دیکھنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا "بہت شکریہ......... آئندہ ہم اس موضوع پر بالکل بات نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا "ہاں آئندہ نہیں کریں گے لیکن اس وقت میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھو!"

وہ بھاری آواز میں بولا۔

ہم دونوں بہت نیچے لہجے میں بات کر رہے تھے' بوڑھی عورت گہری نیند میں تھی۔

میں نے کہا "انسپکٹر ضامن! کیا میرا یہ خیال درست ہے کہ تم قتل کی وارداتوں کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہو؟"

"ہاں......... تمہارا خیال درست ہے۔"

"کیا مان شاہ پر حملہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے؟"

انسپکٹر ضامن کی پیشانی پر سوچ کر گہری لکیریں پھیل گئیں۔ "شاید......... ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک دو شہادتیں اس خطرے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

"قاتل کا مقصد سامنے آیا؟"

"یہی تو پہیلی ہے۔ تیس چالیس میل کے علاقے میں وارداتیں ہوئی ہیں' آپس میں کوئی تعلق نہیں بنتا۔ کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی سلسلہ نہ ہو۔ عام طور پر لوگ سنسنی پھیلانے کے لئے مختلف واقعات کو ایک ہی لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ بہرحال چند روز تک سب کچھ واضح ہو جائے گا۔"

"مجھے مان شاہ کی جان کی طرف سے بہت خطرہ ہے۔ کہیں........."

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ شاید قاتل دوبارہ نہ آئے۔ ویسے بھی اب ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔"

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پتہ چلا کہ مان شاہ والدہ کو دیکھنے آ رہا ہے۔ میں اور ضامن علی خاموش ہو گئے۔

اگلے روز عشاء کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے مان شاہ کی والدہ نے وفات پائی اور اسی رات انہیں دفن کر دیا گیا۔ ان کی قبر مکان کے پچھواڑے ایک باغ میں بنائی گئی۔ یہ باغ بھی اس وسیع احاطے کی طرح مان شاہ کی ملکیت تھا۔ مان شاہ کو اپنی والدہ سے بے پناہ محبت تھی اور ان کی موت پر میں نے صرف مان شاہ کی آنکھوں میں ہی آنسو دیکھے۔ باقی آنکھوں میں تو شاید آنسوؤں کے لئے جگہ ہی نہیں تھی کیونکہ وہاں خوف و ہراس کوٹ

کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مرنے والے کا منہ عموماً کھلا رہ جاتا ہے۔ مان شاہ کی والدہ کا بھی کھلا رہ گیا تھا۔ گھرانے کی عورتیں اسے بھی ایک برا شگون سمجھ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مردے کا منہ کھلا ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے گھر میں کوئی اور حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ اہل خانہ کی بے حسی ملاحظہ فرمایئے کہ وفات کے صرف تین گھنٹے بعد متوفیہ کو نہلا دھلا کر قبر میں پہنچا دیا گیا۔ عزیز و اقارب کا عندیہ تو یہ تھا کہ مرحومہ کو بستی کے مضافاتی قبرستان میں دفن کیا جائے لیکن مان شاہ کی ناراضگی کے خوف سے سب چپ رہے۔ مان شاہ' والدہ کی وصیت کے مطابق انہیں اپنے ہی باغ میں والد کے پہلو میں دفن کرنا چاہتا تھا۔

کئی روز تک مرنے والی کے حلق سے نکلنے والی آواز اور اس کا کھلا ہوا منہ گھر کی عورتوں میں موضوع بحث بنا رہا۔ شاید ان عورتوں کو باتیں گھڑنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں تھا۔ ان کی بچ بچ سن کر مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ ایسے ایسے بیہودہ اور بے سروپا تبصرے کرتی تھیں کہ پاگل ہونے کو دل چاہتا تھا۔ ان کی باتوں سے ماحول عجیب آسیب زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ان دنوں مجھے احساس ہوا کہ گھر میں اگر کسی تشویش ناک موضوع کو مسلسل زیر بحث رکھا جائے تو بچوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ گھرانے کے بچے بڑی اماں کی پر اسرار موت کا احوال سن سن کر ہروقت سہمے رہتے تھے۔

ایک دن مان شاہ کی پہلی بیوی کی سات سالہ بچی بیٹھی بیٹھی بے ہوش ہو کر گر گئی۔ اس کا رنگ' ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ گھر میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا' بچی کے ہاتھ پاؤں مڑ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے ایک رومال تہہ کر کے اس کے جبڑوں کے درمیان رکھا کہ کہیں زبان نہ کٹ جائے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پر مساج کیا گیا میں نے اس کی بے حد تنگ قمیص قینچی سے کاٹ دی تاکہ سانس لینے میں آسانی ہو۔ پانچ دس منٹ میں لڑکی ہوش میں آ گئی۔ اسے کچھ نہیں تھا وہ صرف خوفزدہ تھی۔ آسیب' اثر اور جادو ٹونے کی باتوں نے اس کے معصوم دل کو پتے کی طرح ہلکا کر رکھا تھا مگر گھر میں کوئی یہ بات سمجھنے والا نہیں تھا۔ فوراً پارہ چنار سے ایک پہنچے ہوئے عامل کو بلایا گیا جو کئی روز تک گھر کے کونوں کھدروں میں جھاڑ پھونک کرتا رہا' دھونیاں دیتا رہا' تعویذ دیتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ حلوے مانڈے بھی کھاتا رہا۔

وہ ایک سرد شام تھی' دو روز سے مسلسل یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ یوں تو ہوا

وہاں ہروقت ہی چلتی رہتی تھی لیکن دو روز سے زور کچھ زیادہ تھا۔ مان شاہ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر وہ مکان کے پچھواڑے والدہ کی قبر پر چلا جاتا تھا اور مغرب کے بعد واپس آتا تھا۔ اس دوران ملازمہ بختو اس کے لئے قہوہ بنا چھوڑتی تھی۔ قبر سے واپسی پر وہ زنان خانے میں آتا تھا اور قہوہ پی کر مردانے میں جاتا تھا۔ اس شام ملازمہ بختو بیمار پڑنے کی وجہ سے چھٹی کر گئی تھی' اس کی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے میں نے قہوہ بنایا اور مان شاہ کا انتظار کرنے لگی۔ نماز کے بعد آدھ پون گھنٹہ گزر گیا لیکن مان شاہ نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ ایسا ہو چکا تھا کہ مان شاہ عشاء کے بعد تک قبر پر موجود رہا تھا۔ ایسی صورت میں بختو خود ہی قہوہ لے کر باغ میں چلی جاتی تھی۔ میں نے سوچا شاید آج یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے۔ اسی دوران مان شاہ کی چھوٹی بیوی باورچی خانے میں آ گئی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے ہدایت کی کہ مالک نہیں آئے اور میں خود ہی قہوہ باغ میں پہنچا آؤں۔

میں نے موٹی اوڑھنی لی' قہوے کے برتن ٹرے میں رکھے اور زنان خانے سے نکل کر باغ کی طرف چل دی۔ اس وقت تک کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ باغ میں دو تین جگہ آرائشی پول لگے ہوئے تھے۔ ان پر ٹیوب لائٹس تھیں اور ان لائٹس کی روشنی باغ کے محدود حصوں کو روشن کر رہی تھی۔ باغ کے بیرونی دروازے سے گزر کر میں نے دس پندرہ گز فاصلہ طے کیا تو خوبانی کے پیڑوں کے پیچھے وہ لائٹ نظر آئی جس کے نیچے دونوں قبریں تھیں اور نوافل وغیرہ پڑھنے کے لئے ایک سنگی چبوترا بنا ہوا تھا۔ میں تھوڑا سا اور آگے گئی تو مان شاہ نظر آ گیا۔ وہ والدہ کی قبر پر جھکا ہوا تھا۔ اس قبر کو سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتھروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سیاہ اور سفید سنگریزوں سے پھول بوٹے بنے ہوئے تھے اور کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا.......... قبروں کی یہ آرائش یہاں کا رواج تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر قہوے کے برتن سنگی چبوترے پر رکھے۔ میرا خیال تھا کہ برتنوں کی آہٹ سن کر مان شاہ قبر سے سر اٹھائے گا مگر وہ تو والدہ کی قبر پر بیٹھا بیٹھا خود بھی دار فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ برتن رکھ کر میں اس کی طرف گھومی۔ غور سے دیکھا تو قبر کے سفید سنگریزوں پر خون کے دھبے نظر آئے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے نتیجہ اخذ کیا اور اس کے ساتھ ہی دہشت کی ایک شدید لہر رگ و پے میں دوڑ گئی.......... مجھے

صرف ماں شاہ کا ایک رخسار نظر آرہا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں تھا کہ ماں شاہ اب اس دنیا میں نہیں۔ میں چند لمحے پتھر کی طرح ساکت کھڑی ماں شاہ کی طرف دیکھتی رہی.......... پھر الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔ یوں لگا جیسے میں ابھی پورے زور سے چیخوں گی اور سرپٹ باغ کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگ نکلوں گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں' خوف جتنی سرعت سے مجھ پر طاری ہوا تھا اتنی ہی سرعت سے میں نے اس پر قابو پایا اور چند قدم پیچھے ہٹنے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ دفعتاً میری نگاہ خون کے مزید دھبوں پر پڑی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں تراشیدہ گھاس پر یہ دھبے صاف نظر آرہے تھے ان میں چمک تھی اور تازگی بھی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے' ابھی ہوا ہے' چند لمحے یا ایک آدھ منٹ پیشتر۔ ممکن تھا ماں شاہ کی آخری ہچکی کی بازگشت ابھی اسی فضا میں موجود ہو۔ میری نگاہوں نے خون کے دھبوں کا تعاقب کیا.......... چند گز آگے جا کر دھبے مدہم پڑ گئے تھے۔ سنگی چبوترے کے پاس ان کا سائز قریباً ایک ہتھیلی کے برابر تھا مگر خوبانی کے پودوں کے پاس پہنچ کر وہ دو انگل رہ گئے تھے۔ میں ان دھبوں کا رخ دیکھنے کے لئے چند قدم آگے بڑھی۔ خوبانی کے دو چھوٹے پودوں کے درمیان سے گزر کر میں ایک روش پر آئی۔ روش پر گھاس نہیں تھی اور دھبے نمایاں محسوس ہو رہے تھے۔ یکایک میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے مجھے لگا جیسے قاتل ابھی اسی باغ میں ہے بلکہ کہیں میرے آس پاس ہی ہے۔ نہ جانے کیوں اس گھڑی میرے تصور میں ماں شاہ کی مرحومہ ماں کا کھلا ہوا منہ آگیا اور میرے کانوں میں اس کے گلے کی عجیب و غریب خرخراہٹ گونجنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ ان چیزوں کا چند گز دور پڑی ہوئی ماں شاہ کی لاش سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی ایک ہراس سا دل کو جکڑنے لگا۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا کہ مجھے فوراً انسپکٹر ضامن کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دینی چاہئے۔ میں واپس مڑی اور اس روش کی طرف بڑھی جو مجھے یہاں سے نکال کر باغ کے محرابی دروازے تک پہنچا سکتی تھی۔ ابھی میں نے واپسی کا سفر دو یا تین قدم ہی طے کیا تھا کہ اچانک شاخیں سرسرائیں۔ قدموں کی چاپ گونجی اور پہلو سے ایک سایہ نکل کر مجھ پر جھپٹا۔ مجھے یاد نہیں لیکن یقینی بات ہے کہ میں سینے کی پوری قوت سے چیخی ہوں گی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا خود کو ناقابل بیان دہشت کے اظہار سے نہ روک سکتا۔ ایک زور

آور ہاتھ میرے منہ پر آیا' میرے کندھوں کو شدید دھکا لگا اور میں اوندھے منہ پھولوں کی ایک کیاری میں گری۔ گرنے کے بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم ایک آہنی گرفت میں ہے اور ہونٹوں پر ایک سخت کھردری ہتھیلی یوں جمی ہوئی ہے جیسے اسے میرے منہ کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا ہو۔ میں نے پوری قوت سے مچل کر خود کو آزاد کرانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ میری پشت زمین پر گھسٹ رہی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ آور مجھے کسی جانب کھینچ رہا ہے۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باغ کے پچھلے دروازے سے باہر لے آیا۔ یہ ایک کھیت تھا۔ کھیت کے ایک حصے میں کٹے ہوئے درختوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا تھا اس ڈھیر میں دیودار' چیل' اور پڑتل کے چھوٹے بڑے درختوں کے بیشمار تنے شامل تھے۔ یہ بیش قیمت لکڑی نہ جانے کب سے یہاں پڑی تھی۔

کئی تنے بڑے بڑے زمین میں دھنس چکے تھے اور ان کی چھال پر پھپھوندی لگی ہوئی تھی۔ یہ ڈھیر کم از کم ایک ایکڑ رقبے میں تھا۔ حملہ آور باغ کے دروازے سے نکلتے ہی ان لکڑیوں میں داخل ہو گیا۔ دم گھٹنے کی وجہ سے میری آنکھوں کے سامنے اب اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہونٹوں پر سے ہتھیلی کی گرفت ختم کرنے کے لئے میں نے شدید مزاحمت کی تو حملہ آور نے مجھے زمین پر پٹخ کر گھٹنا میری گردن پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے بائیں پہلو میں کوئی نوکدار شے چبھتی محسوس ہوئی۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ اس نوکدار شے نے لباس میں گزر کر میری جلد کو زخمی کر دیا ہے۔ حملہ آور معمولی سا دباؤ اور بڑھاتا تو وہ شے میری پسلیوں میں اتر جاتی۔ موت آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ملگجے اندھیرے میں یوں لگا جیسے اس نے پیشانی اور ایک رخسار پر کیچڑ ملا ہوا ہے۔ اس بات کا پتہ بعد میں چلا کہ وہ زخمی تھا اور اس کے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اندرونی غضب سے چمک رہی تھیں۔ ناکافی روشنی کے باوجود میں اسے پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے دل کی دھڑکن تھمتی محسوس ہوئی۔ میری آنکھوں سے ایک فٹ کے فاصلے پر جو چہرہ تھا وہ ضامن علی کا تھا۔ وہ عجیب خوفناک آواز میں پھنکارا۔

"قسم پیدا کرنے والے کی' آواز نکالی تو پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔"

یہ ضامن علی کی آواز تھی لیکن یہ لہجہ کسی درندے کا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے

کہ اس وقت میں ایک انگلی کو بھی جنبش دیتی تو وہ دیوانگی کے عالم میں مجھے قتل کر دیتا۔ یہ دیکھ کر کہ میں خوفزدہ ہو گئی ہوں' اس نے نوکدار چیز کا دباؤ کم کیا اور بازو سے کھینچ کر مجھے بٹھا دیا۔ میں نے دیکھا اس کے بائیں ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا۔ چاقو میری آنکھوں کے سامنے نچا کر اس نے کہا "چلو اٹھو.......... میرے آگے آگے چلو۔"

میں کھڑی ہو گئی میں اس کی بات مان رہی تھی لیکن اتنی خوفزدہ نہیں تھی جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں زندگی کا اتنا سرد گرم دیکھ چکی تھی اور موت کو اتنی مرتبہ چھو کر گزری تھی کہ اعصاب سن ہو چکے تھے۔ وہ مجھے دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔ لکڑیوں کے اس عظیم الشان ڈھیر میں قدرتی طور پر ایک سرنگ سی بن گئی تھی۔ پندرہ بیس گز آگے جا کر یہ سرنگ یک دم ایک چھوٹی سی دراڑ میں بدل گئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ جہاں سرنگ ختم ہوئی وہاں بائیں جانب تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی جیسے کوئی نیچی چھت والی گیلری ہو۔ غالباً لکڑیاں ڈھیر کرتے ہوئے یہاں چھوٹا سا خلا رہ گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر ضامن علی نے اپنا سگریٹ لائٹر جلایا تو گردو پیش روشن ہو گئے۔ ایک بلی اور اس کے بچے ہمیں گھورتے ہوئے کونے کھدروں میں رینگ گئے۔ آڑی ترچھی پڑی شہتیریوں اور کھمبوں سے بے شمار جالے چمٹے تھے۔ ایک طرف کسی مرغی کے پر پڑے تھے جسے کوئی کتا یا بلا بھنبھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسری طرف کسی جانور کا خشک فضلہ پڑا تھا۔ ضامن علی نے لائٹر کو موم بتی کی طرح ایک پتھر پر رکھ دیا اور مجھے دھکیل کر زمین پر بٹھا دیا۔ میں نے پہلی دفعہ غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب دیوانگی ناچ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اور لرزتے کانپتے لہجے میں کہا "انسپکٹر ضامن علی! تم.......... تم نے مان شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے اس کا خون کر دیا ہے؟"

وہ بڑی بے فکری سے مسکرایا اور تھوڑا سا لنگڑا کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ سر کے علاوہ اس کا پاؤں بھی زخمی ہے۔ اس زخمی پاؤں پر اس نے اپنا مفلر باندھ رکھا تھا۔ میں نے گھاس پر خون کے جو نشان دیکھے تھے وہ یقیناً اسی زخمی پاؤں کے تھے۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی کہ مان شاہ کے باغ میں جو خونی واقعہ رونما ہو چکا ہے اس کا ذمے دار صرف ضامن علی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھیانک خیال میرے ذہن میں گھس آیا کہ علاقے میں مسلسل ہونے والی قتل کی وارداتوں میں

ضامن علی ہی کا ہاتھ ہے۔ تو کیا.......... اس وقت میں ایک جنونی شخص کی دسترس میں تھی۔

نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئی' میں نے ہاتھ بڑھا کر ضامن علی کا گریبان پکڑ لیا اور جھنجوڑ کر کہا "تم قاتل ہو.......... تم خونی ہو۔ تم نے.......... صرف تم نے مان شاہ کو مارا ہے۔"

وہ بولا "مارا ہے تو پھر..........؟"

میں نے کہا "اور اس سے پہلے بھی جو قتل ہوئے ہیں' وہ تم نے کئے ہیں۔"

وہ بولا "یہ بات ٹھیک نہیں۔ وہ سارے قتل میں نے نہیں کئے۔"

میں حیرت سے تقریباً چیخ پڑی "اس کا مطلب ہے.......... تم نے.......... قتل کئے ہیں۔"

"بالکل کئے ہیں اور اپنے ان گناہ گار ہاتھوں سے کئے ہیں۔" اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ مجھے اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید میں حسب معمول کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا ہے تم نے ایسا؟" میں نے چلا کر پوچھا "کیا اس لئے کہ تم پولیس انسپکٹر ہو؟ کس قانون نے تمہیں اس قتل و غارت کی اجازت دی ہے؟ کہاں سے اتھارٹی لے کر آئے ہو تم خون کرنے کی؟"

اس نے خون آلود چاقو کو مٹی سے صاف کر کے اپنی گرد آلود پتلون کی جیب میں رکھا اور اطمینان سے بولا "قانون سے اجازت لے کر نہیں' قانون کو توڑ کر قتل کئے ہیں اور اس لئے کئے ہیں.......... کہ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "شاید تم مجھے کوئی کہانی سنانے کے چکر میں ہو۔ لیکن میں تمہارے منہ سے ایک لفظ سننا نہیں چاہتی۔ مجھے تمہاری سانسوں سے گوشت خور درندے کی بو آ رہی ہے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے' میں یہاں سے باہر نکلنا چاہتی ہوں۔"

میرے جذباتی پن کو دیکھتے ہوئے اس نے چاقو جیب سے نکال کر ایک بار پھر گود میں رکھ لیا اور بولا "میری کہانی طویل نہیں' بہت مختصر ہے۔ تم نہ بھی سنو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میں اس لئے سنانا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سلوک کی وجہ سمجھ میں

آجائے جو میں تم سے کرنے والا ہوں۔"

"کیسا سلوک.........؟" میں نے پھر کر پوچھا۔

"حوصلہ رکھو......... ابھی سب کچھ سامنے آجائے گا۔" وہ عجیب لہجے میں بولا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور تنگ سی جگہ میں دھواں بکھیرتے ہوئے بہکی بہکی بے ربط باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اور جس کے ادھورے پن کو میں نے تخیل سے مکمل کیا کچھ اس طرح تھا۔

.... تقسیم ہندوستان کے وقت ضامن علی کا باپ کبیر علی ریلوے پولیس میں حوالدار تھا۔ وہ ایک باریش نمازی اور ایماندار شخص تھا۔ ایک مرتبہ اس نے چند ملزموں کو پکڑا جو گودام سے ریلوے کا لوہا چرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے جو حوالدار تھا وہ چوروں سے ملا ہوا تھا۔ ملزموں نے کبیر علی کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ ان کی رشوت ٹھکرا کر کبیر علی نے انہیں گرفتار کرا دیا۔ اس واقعے سے ایک خونی رنجش نے جنم لیا۔ جیل سے باہر آتے ہی ان لوگوں نے کبیر علی کو قتل کر دیا اور علاقہ غیر میں فرار ہو گئے۔ پولیس نے ان کی بازیابی کی بہت کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی تاہم کبیر علی کو قتل کر کے بھی قاتلوں کے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی۔ قریباً دو سال بعد انہوں نے پھر وار کیا اور کبیر علی کے چھوٹے بھائی نذیر کو جان سے مار دیا اور اس کے دوست کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں۔ تاہم اس دفعہ ان کا بھی نقصان ہوا۔ نوجوان نذیر علی نے شکار ہونے سے پہلے حتی المقدور مزاحمت کی اور شکاریوں میں سے بھی ایک کو ڈھیر کر دیا۔ اس واقعے کے بعد ملزمان ایک بار پھر علاقہ غیر میں فرار ہو گئے تھے لہٰذا کوشش کے باوجود قانون کے ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکے۔ ملزم پارٹی میں سے مرنے والے کا نام ادریس تھا۔ ادریس کا بدلہ لینے کے لئے ملزمان نے پورے آٹھ برس انتظار کیا۔ آٹھ برس میں حوالدار کبیر علی کا بیٹا ضامن علی جوان ہو چکا تھا اور پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچے تھے......... ایک روز صبح کو ضامن علی تھانے سے گھر روانہ ہوا۔ اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے راستے میں اپنے اور بیوی کے لئے ناشتے کا سامان خریدا۔ بچوں کے لئے دودھ لیا اور تھکے ماندے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر جو جائے سکون ہوتا ہے' جہاں نڈھال جسموں کے لئے آسودگی ہوتی ہے اور وہ توانائی ہوتی ہے جو

اگلے روز پھر "میدان کارزار" میں اترنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ جہاں حیات بخش نگاہیں ہوتی ہیں اور وہ معصوم چہکاریں ہوتی ہیں جو دلوں میں گداز اور مہر و وفا کے جذبے جگاتی ہیں۔ لیکن اس روز ضامن علی کو اپنی گھر کی چار دیواری میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ صرف تین خونچکاں لاشیں ملیں۔ خون سے لتھڑے ہوئے بستر ملے اور ایک ہجوم ملا جس کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر ماتمی خاموشی تھی۔ آٹھ سال کی خاموشی کے بعد دشمن ایک بار پھر وار کر گیا تھا۔ یقیناً وہ اسے قتل کرنے آئے تھے اور اسے نہ پا کر انہوں نے اس کے اہل خانہ پر قیامت توڑ دی تھی۔ اس جانکاہ حادثے نے ضامن علی کو نیم پاگل کر دیا۔ کئی ہفتے تک اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے پھر ڈیوٹی پر جانا شروع کیا۔ اب اسے انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر کا پھول دیکھ دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ کاش یہ پھول دیکھنے والی آنکھیں زندہ ہوتیں۔ کتنا ارمان تھا زبیدہ کو یہ دن دیکھنے کا......... وہ زبیدہ اور اس کے بچوں کے قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ لیکن وہ درندے وار کرنے کے بعد ایک بار پھر آزاد علاقے کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکے تھے۔ حکام نے ایک ایس پی کی قیادت میں تفتیشی پارٹی ترتیب دے کر کرم ایجنسی میں بھیجی۔ ایس پی کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہر صورت ملزمان کو برآمد کرے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔

اس پارٹی نے کئی ہفتے آزاد علاقے میں گزارے۔ پولیٹکل ایجنٹس' ملکوں' سرداروں اور جرگوں سے رابطہ قائم کیا لیکن ملزمان کی گرفتاری میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر یہ لوگ منہ لٹکا کر واپس آ گئے۔ انہی دنوں ضامن علی کے ذہن میں ایک نئی سوچ کا بیج پڑا۔ یہ دیوانگی کی سوچ تھی اور اس سوچ کے پیچھے اس کی تین پشتوں کا دکھ شامل تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے خاندان پر ٹوٹنے والے مظالم کا ذمے دار "علاقہ غیر" ہے۔ وہ علاقہ غیر جس میں بسنے والے کچھ ناعاقبت اندیش لوگ مجرموں اور قاتلوں کے لئے اپنی بانہیں کھول دیتے ہیں اور انہیں قانون کی پہنچ سے دور کوہستانی بھول بھلیوں میں گم کر دیتے ہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا عہدہ' اس کی وردی اس کا اختیار سب بیکار ہے۔ جہاں آزاد علاقے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں یہ سب چیزیں بیکار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسے ان چیزوں سے کیا لینا تھا اسے تو اپنے مجرم درکار تھے۔ وہ مجرم جنہیں آزاد علاقہ

ایک بار پھر اپنی گود میں چھپا چکا تھا۔

ایک روز وہ چپکے سے خود بھی آزاد علاقے میں چلا آیا۔ ایک مفرور مجرم کا بھیس بدل کر اپنے مفرور مجرموں کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اس نے راتیں ویرانوں میں گزاریں اور بھوکا پیاسا کوہستانی وسعتوں کو ناپتا رہا۔ بستی بستی' پہاڑ پہاڑ اور قبیلہ قبیلہ اس نے اپنے دشمنوں کی تلاش جاری رکھی۔ محنت اور مسلسل کوشش کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ ضامن علی کی آبلہ پائی بھی رائیگاں نہیں گئی۔ اسے اپنے دشمنوں میں سے اقبال نامی ایک شخص کا کھوج ملا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ یہ ضامن کا پہلا قتل تھا۔ اس کے بعد اس نے پانچ قتل اور کئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ پانچوں افراد ضامن کے لئے اجنبی تھے۔ ان کی موت کا سبب صرف ایک ہی تھا وہ یا تو مفرور مجرم تھے یا انہوں نے کسی مفرور کو پناہ دی تھی۔ حد سے بڑھے ہوئے دکھوں نے ضامن کو نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ آزاد علاقے میں روپوش ہونے والا مجرم چاہے وہ کوئی بھی ہو' ضامن علی کو جہاں کہیں بھی کوئی مشکوک شخص نظر آیا وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ پھر جونہی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ وہ قانون سے بھاگا ہوا شخص ہے' ضامن علی موت کا فرشتہ بن کر اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چھ مقتولوں میں سے دو ایسے تھے جو خود مفرور مجرم نہیں تھے لیکن وہ مفرور مجرموں کو پناہ دیتے تھے۔ ان میں سے ایک "منگل قبیلے" کا ایک خانہ بدوش سردار تھا اور دوسرا خود مان شاہ تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ضامن علی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ مان شاہ مفرور مجرموں کو پناہ دینے کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ ضامن علی کو بھی اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پناہ دے دی تھی اور اس کی یہی "دلیری" بالآخر اس کی موت کا سبب بنی۔ خود پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد مان شاہ کافی محتاط ہو گیا تھا اور اس نے اپنے مکان کے گرد مسلح پہرے کا انتظام کر رکھا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ قاتل اس کے گھر کے اندر ہی ہے بلکہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ضامن علی بہتر موقعے کی تلاش میں تھا۔ آج موقع ملتے ہی اس نے اپنا کمانی دار چاقو مان شاہ کے دل میں اتار دیا.........."

ضامن علی کی روداد ختم ہوئی تو لکڑیوں کے نیچے وہ مختصر سا خلا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ضامن علی کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ وہ ہنس کر بولا۔

"میں نے غلط تو نہیں کیا نا.......... بتاؤ غلط تو نہیں کیا؟ گناہ گار کو سزا تو ملنی ہی چاہئے.......... کیوں لوگ جرم بھی کرتے رہیں اور قانون سے بھی بچے رہیں..........؟ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کیوں اس آزاد علاقے میں پہنچ کر انصاف کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں؟ یہاں کے لوگ بھی انصاف پسند ہیں' اچھے برے کی تمیز رکھتے ہیں' قانون اور لاقانونیت کا مطلب سمجھتے ہیں پھر درمیان میں یہ دیوار کیوں حائل ہے؟"

میں اس کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ جواب بھی کیا دیتی۔ اس نے سگریٹ بجھا کر دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر باندھے اور لکڑیوں سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر خلا میں گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ضامن علی کی بھاری آواز نے اس سکوت کو توڑا۔ وہ بولا "تم بھی تو مفرور مجرم ہو نا.......... تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے؟"

میرے سر پر جیسے بجلی گر پڑی.... ضامن علی یہ کیا کہہ رہا تھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا یہ سب کچھ۔ میں ہکلا کر رہ گئی۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ چاقو اس کی گود میں تھا۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ یہ چاقو میرے ہاتھوں سے بالکل محفوظ ہے۔ "میرا خیال ہے تم پریشان ہو گئی ہو۔ سوچ رہی ہو کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ یہ مت بھولو کہ میں ایک پولیس والا بھی ہوں۔ پولیس والے عام طور پر چہرے پہچاننے میں غلطی نہیں کرتے.......... یہ دیکھو یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا" اس نے جیب سے ایک مڑا تڑا اخباری تراشہ نکال کر میری طرف پھینک دیا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے تراشہ اٹھایا۔ میری ایک چھوٹی سی تصویر میرا منہ چڑا رہی تھی۔ ساتھ ہی چار پانچ انچ کی ایک کالمی خبر بھی تھی۔ لکھا تھا۔

".......... واصف چنگیزی قتل کیس کی مفرور ملزمہ ثنا محمود کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ یاد رہے کہ قریباً آٹھ ماہ قبل اس کی گرفتاری کے لئے بازار حسن کے ایک مکان پر چھاپہ مارا گیا تھا۔ چھاپے سے کچھ ہی دیر قبل وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پچھلے دنوں پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ ملزمہ ثناء ایک با اثر غیر ملکی شخص کے ساتھ کراچی کے ایک نائٹ کلب میں دیکھی جاتی ہے۔ ایک پولیس پارٹی اس اطلاع پر کراچی روانہ کی گئی مگر تفتیش سے یہ خبر غلط نکلی.........."

خبر کا متن حیران کن تھا۔ کہاں کراچی کا نائٹ کلب اور کہاں خانہ بدوش قبیلے کی

قید۔ میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ جھوٹ بولنے والے جھوٹ بولتے بولتے کتنی دور نکل جاتے ہیں۔ وہ حقیقت کو رنگوں کی ایسی بھٹی چڑھاتے ہیں کہ اصلیت کی شکل پہچاننا مشکل ہو جاتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ رنگ ہی رنگ رہ جاتے ہیں حقیقت ناپید ہو جاتی ہے۔ میں جو صرف ایک بدنصیب ماں تھی' بے ضمیر رنگ سازوں کی بھٹی پر چڑھ کر ایک خطرناک عیاش "انٹرنیشنل" مجرمہ بن گئی تھی۔

ضامن علی نے اب آنکھیں کھول لی تھیں اور بغور میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ میں نے تراشے سے نگاہ ہٹائی تو وہ زہریلے پن سے مسکرا دیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کا تاریک خلا کچھ اور بھیانک لگنے لگا۔ میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کھلا ہوا چاقو اب اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ اس چاقو کے پھل پر کہیں کہیں اب تک مان شاہ کا خون لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ محسوس کر کے حیرانی ہوئی کہ میں اتنی خوفزدہ نہیں ہوں جتنا مجھے ہونا چاہئے۔ میں موت کے شکنجے میں تھی' جنونی قاتل مجھ سے دو فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا اور آلہ قتل اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے تو دہشت سے مر جانا چاہئے تھا یا چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا۔ شاید وہاب چنگیزی کے دست ہوس کا شکار ہونے کے بعد اور رائل بنگال ٹائیگر کی آدم خوری دیکھنے کے بعد مجھ میں مزید دہشت زدہ ہونے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی.......... تاہم موت پھر موت ہوتی ہے' ضامن علی جب چاقو تھام کر میری طرف سرکا اور میں نے اس کی آنکھوں میں جنون کی لہر دیکھی تو گھبرا کر پیچھے کو سرک گئی۔ لیکن زندگی پیچھے بھی نہیں تھی' پیچھے لکڑی کی دیوار تھی جسے پار کر کے نہ کوئی باہر جا سکتا تھا' نہ اندر آ سکتا تھا۔ ضامن علی کا خنجر حرکت میں آیا اور اس کی نوک میری ٹھوڑی کے نیچے چبھنے لگی۔ جان بچانا فرض ہے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس فرض سے کیسے سبکدوش ہوں۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "انسپکٹر ضامن! ہوش کرو۔"

اچانک اس نے خنجر میری گردن سے ہٹا دیا اور پیچھے ہٹ کر لکڑی سے ٹیک لگا لی "میں تجھے قتل نہیں کروں گا شاہ محمود.......... جانتی ہو کیوں نہیں کروں گا' جانتی ہو؟"

میں خاموش رہی۔ وہ ہنسنے لگا۔ عجب وحشت زدہ سی ہنسی تھی۔

"میں کیوں قتل کروں تجھے.......... کیا قصور ہے تیرا.......... میں نے سب کچھ پڑھا

ہوا ہے۔ میں نے سب کچھ پڑھا ہوا ہے تیرے بارے میں۔ تو قانون سے فرار ہو کر نہیں چھپی ہوئی۔ قانون تجھ سے چھپا ہوا ہے.......... میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "میں جانتا ہوں بچے کی موت کیا ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں بی بی۔ کوئی بھی ماں ہوتی وہ ان حالات میں یہی کچھ کرتی جو تم کر رہی ہو۔ شاید زبیدہ بھی ہوتی.......... تو وہ یہی کچھ کرتی۔"

ایک بار پھر ضامن نے ہاتھ گردن کی پشت پر باندھ کر سر کو سہارا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں کے دو دھارے اس کے رخساروں پر پھیلتے چلے گئے۔ لکڑی کی درزوں اور بھول بھلیوں میں سے راہ بنا کر ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور میرے پاؤں میں پڑے ہوئے اخباری تراشے کو الٹ گیا۔ تراشے کی پشت پر ایک اور چھوٹی سی خبر میرے مطلب کی تھی۔ میں نے بیساختہ تراشہ اٹھا کر دیکھا۔ نیوز رائٹر نے ادبی انداز اختیار کرتے ہوئے سرخی جمائی تھی "پرندوں کی آزادی۔" نیچے لکھا تھا۔

"وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ کے ذرائع کے مطابق آئندہ چند روز میں وہ تمام پرندے آزاد کر دیئے جائیں گے جو چند ماہ پہلے اسمگلروں کے ایک بہت بڑے گروہ سے قبضے میں لئے گئے تھے۔ یاد رہے کہ ان تمام شکاری پرندوں کو ناجائز طور پر پکڑا گیا تھا اور ان کی مالیت کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے۔ ان میں نایاب شاہین' عقاب اور باز شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ پرندے جو اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں' محکمے کی تحویل میں رہیں گے اور انہیں بعد ازاں سرکاری طور پر فروخت کیا جائے گا۔ پرندوں کو چھوڑنے کی کارروائی محکمہ وائلڈ لائف اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں عمل میں لائی جائے گی۔"

یہ اخباری تراشہ چار روز پہلے کا تھا۔ اس کا مطلب تھا کروڑوں روپے مالیت کے وہ مسروقہ پرندے آزاد کئے جا چکے تھے یا کئے جانے والے تھے۔ وہاب چنگیزی کے خلاف یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان پرندوں کو بیرون ملک اسمگل کرنا چنگیزیوں کا ایک بڑا "پراجیکٹ" تھا اور ہم سب نے مل کر اس "پراجیکٹ" کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس خبر کو پڑھ کر میرے سینے کی جلن میں ذرا سی کمی واقع ہو گئی ہے۔

ضامن علی بدستور ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ آنسوؤں کی نمی ابھی تک اس کے رخساروں پر تھی۔ لالٹین کی جگہ اب ایک موم بتی رکھی ہوئی تھی۔ یہ موم بتی

ضامن نے یہیں کہیں سے تلاش کر کے جلائی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ اس سے پہلے بھی یہاں آتا رہتا ہے.......... میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس درندہ صفت شخص سے نفرت کا اظہار کروں یا ہمدردی کا۔ قانون کا محافظ ہونے کے باوجود اس نے قانون کو ہاتھ میں لے رکھا تھا اور خود ہی جج بن کر لوگوں کو سزائے موت دے رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ حق پر تھا یا باطل پر' بہرحال وہ ایک خطرناک شخص تھا اور اس کی قربت کا احساس میرے دل کی دھڑکن کو خوف سے بھر رہا تھا۔ وہ بولتا تھا تو اس کی باتوں سے دیوانگی جھلکتی تھی اور جب خاموش ہوتا تو زیادہ ڈر لگتا تھا کہ پتہ نہیں اب کیا کہہ دے گا۔ میں نے اس تشویشناک خاموشی کو توڑنے کے لئے کہا۔

"انسپکٹر ضامن! میں کوئی قانون دان نہیں کہ تمہارے کردار پر تبصرہ کر سکوں۔ بہرحال اتنا کہوں گی کہ تم ایک خطرناک راستے پر چل رہے ہو۔ ظاہر ہے اگر تم واقعی مفرور مجرموں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو تو تم نے کسی معمولی کام میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایسے لوگوں سے ٹکراؤ کا نتیجہ موت کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل کسی کی گولی تمہیں چاٹ لے گی یا پھر پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گے۔ میرے خیال میں آٹھ دس یا بیس تیس قتل کر دینے سے یہ وسیع و عریض علاقے مفرور مجرموں سے خالی نہیں ہو جائیں گے۔ اگر تم واقعی اپنی سوچ میں مخلص تھے تو تمہیں قانون کا سہارا لینا چاہئے تھا۔"

ضامن نے ایک زور دار قہقہہ لگایا.......... زور دار اور طویل .... مختصر جگہ اس قہقہے سے گونج اٹھی۔ ہنس ہنس کر وہ دہرا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنستے ہنستے ہی بولا "بہت خوب.......... واہ واہ۔ کیا بات کی ہے۔ مجھے قانون پسندی کا مشورہ دیا ہے۔ کتنی اچھی لگی ہے تمہارے منہ سے یہ بات۔ بہت شکریہ اس نیک مشورے کا۔ لیکن میں اتنا گدھا نہیں جتنا تم نے سمجھا ہے۔ میں نے جو راستہ چنا ہے اس پر چلوں گا۔ رہی دشمن کی گولی کی بات تو اس کا خطرہ تو ہم جیسوں کو رہتا ہی ہے.........."

چند لمحے خاموش رہ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "ویسے میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ اب کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو جانا چاہئے۔ جنگل میں زیادہ شکار کھیلا جائے تو جانور بھاگ جاتے ہیں۔ ماہر شکاری تھوڑا سا وقفہ دے کر شکار پر نکلتے ہیں۔ لیکن.........." کچھ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "لیکن وقفے سے پہلے میں ایک درندے کو ضرور مارنا چاہتا ہوں.......... بلکہ ایک نہیں دو درندے ہیں۔ نئے نئے آئے ہیں اس جنگل میں بڑی مستی کر رہے ہیں۔

"کون ہیں؟

ہیں دو عدد دو پائے۔ ایک بالوں والا ہے ایک بغیر بالوں کے بڑے چوکنے ہیں لیکن میں نے مچان لگالی ہے۔ بچ کر نہیں جائیں گے۔ آج کل میں ہی ٹھائیں کر دوں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ مان شاہ جیسے دو اور افراد کا ذکر کر رہا ہے۔ دفعتاً کچھ فاصلے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ضامن علی ایک دم ہوشیار ہو گیا۔ اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی اور پھر اندھیرے میں اس کے چاقو کی کڑکڑاہٹ گونج اٹھی اس نے چاقو کھول کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"خبردار" وہ پھنکارا "آواز نکالنے کی کوشش کرو گی تو ڈھیر کر دوں گا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے میرا بازو گرفت میں لے لیا تھا۔ قدموں کی چاپ بتدریج قریب آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ مدہم انسانی آوازیں بھی تھیں۔ ہم دونوں بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ یکایک سو گز کے فاصلے سے ایک زور دار آواز آئی۔ بولنے والے نے پشتو میں کہا۔

"جو کوئی بھی ہے باہر نکل آئے۔ ورنہ اندر ہی گولیوں سے بھون دیں گے۔"

یہ فقرہ سننے کے بعد شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ بستی والوں کو شک ہو چکا تھا کہ لکڑیوں کی اس لاٹ کے اندر کوئی چھپا ہوا ہے۔ ضامن علی نے میرا بازو کھینچا اور ٹٹولتا ہوا مخالف سمت میں بڑھا۔ دیا سلائی جلا کر اس نے مجھے ایک چھوٹا سا رخنہ دکھایا۔ اوندھے منہ لیٹ کر اس میں سے بمشکل گزرا جا سکتا تھا۔ ضامن علی نے ہدایت کی کہ میں اس میں سے گزر جاؤں۔ کھلا ہوا چاقو اس کے داہنے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد میں خلا میں سے گزر کر دوسری طرف آ گئی۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف لکڑی کا کھردرا پن تھا۔ جس وقت ضامن علی خلا میں سے گزر رہا تھا میں اس پر حملہ کر سکتی تھی لیکن میں نے اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اس نے بھی زیادہ موقع نہیں دیا اور ایک دو سیکنڈ میں رخنے سے گزرنے کا مرحلہ طے کر لیا۔ یہاں پہنچ کر

اس نے ایک بار پھر لائٹر کی مدد سے موم بتی روشن کر لی اور لکڑی کے بیچوں بیچ رخنوں' درزوں اور خالی جگہوں سے گزر کر ہم آگے بڑھنے لگے۔ یہ ایک خطرناک عمل تھا۔ سینکڑوں من وزن کی دیو ہیکل گیلیاں بڑی بے ترتیبی سے ایک دوسرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور کسی کسی جگہ یوں لگتا تھا کہ اگر ہم نے انہیں ذرا بھی چھیڑا تو وہ ہمارے اوپر آگریں گی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ' ہم نے پندرہ منٹ میں طے کیا۔ ایک جگہ موزوں خلا دیکھ کر ضامن اوپر کی جانب باہر نکل گیا۔ بعد ازاں اس نے مجھے بھی کلائی سے تھام کر باہر کھینچ لیا۔ ہم لکڑی کے اس عظیم الشان ڈھیر کے جنوبی کنارے کے پاس تھے۔ گہری تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھے لے کر ڈھیر سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دور آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جونہی ہم کھیتوں میں داخل ہوئے ضامن علی مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا' اور زخمی پاؤں کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا میرے پیچھے چلنے لگا۔ کھلا ہوا چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور میں جانتی تھی کہ وہ اتنا پھرتیلا ضرور ہے کہ زخمی ہونے کے باوجود میرے بھاگنے کی کوشش کو ناکام بنا دے۔

سردی بہت زیادہ تھی۔ رہی سہی کسر یخ بستہ ہوا پوری کر رہی تھی۔ میں نے گرم چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ پھر بھی کپکپی کم نہیں ہوئی پیدل چلنے کی وجہ سے ٹانگیں تو گرم تھیں لیکن اوپر کا دھڑ سن ہو رہا تھا۔ مان شاہ کا بے جان چہرہ رہ رہ کر نگاہ میں پھر رہا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ گھر کی وحشت زدہ عورتوں پر کیا بیتی ہوگی۔ صدمہ تو جو ہونا تھا وہ ہونا تھا لیکن جس دہشت کا انہیں سامنا تھا اس کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟" میں نے ضامن سے پوچھا۔

"بس خاموشی سے چلتی رہو۔" وہ غرایا۔

"اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

"تم سے ہمدردی ہونے کے باوجود مجھے تمہارے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

"کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ دو تین روز تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے اگلے شکار سے نبٹ لوں۔ اس کے بعد تم آزاد ہوگی۔"

میں کانپ گئی۔ "شکار" کی بات وہ ایسے کر رہا تھا جیسے کسی انسان کو نہیں خرگوش کو

مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کتنی درندگی تھی اس کے لہجے میں۔ میں سوچنے لگی ضامن کا نشانہ بننے والا اگلا بدنصیب کون ہے۔"

اب ہم کھیتوں سے نکل کر غیر آباد پہاڑیوں میں آ چکے تھے۔ ان پہاڑیوں پر کہیں کہیں اکا دکا مکان تھے۔ سخت سردی میں دو میل کے دشوار گزار سفر کے بعد ہم ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک بالکل تنہا مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ اس پہاڑی پر سبزہ کثرت سے تھا مگر چوٹی تک پہنچتے پہنچتے یہ سبزہ بالکل معدوم ہو گیا۔ مکان چار پانچ مرلے میں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک کتے نے زور شور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ بائیں طرف ایک کھڑکی کھلی اور اندر سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا کہ کون ہے۔ جواب میں ضامن علی نے رعب سے اپنا نام بتایا۔ فوراً مکان کے اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں اور کسی نے تڑاخ سے دروازہ کھول دیا۔

یہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ وہ ضامن علی سے بے حد مرعوب بلکہ خوفزدہ نظر آتا تھا۔ اس نے جھک کر ہم دونوں کو سلام کیا اور جلدی سے دروازہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹا تاکہ ہم اندر داخل ہو سکیں۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھا کر وہ فوراً چائے پانی کا انتظام کرنے چلا گیا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے پہلی مرتبہ غور سے ضامن علی کا چہرہ دیکھا۔ اس کی پیشانی پر کسی پتھر کا زخم تھا اور خون اس کی دائیں کنپٹی اور داڑھی پر خشک ہو چکا تھا۔ غالباً اپنے قتل سے پہلے مان شاہ نے بھرپور مزاحمت کی تھی اور ضامن کا پاؤں بھی اس مزاحمت کے نتیجے میں گھائل ہوا تھا............

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی عورت بھی رہتی ہے (تاہم اگلے چار پانچ گھنٹوں میں وہ عورت نظر آئی اور نہ اس کی آواز مجھے سنائی دی) جب گٹھے ہوئے جسم والا نوجوان ہمارے لئے چائے بنانے جا چکا تھا۔ میں نے ضامن سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

وہ مسکرایا "اس کا نام بشر گل ہے۔ کسی رشتے دار کی لڑکی کو بھگا کر یہاں لایا ہوا ہے۔ اس کی ٹھوڑی پر چوٹ کا نشان دیکھا ہے تم نے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ضامن بولا "پچھلے مہینے میرے ساتھ لڑائی ہوئی تھی

اس کی۔ کم بخت راہزنی کرتا ہے۔ مسافر سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ دو تین میل نیچے
برساتی نالے کے پاس مجھے روک لیا۔ کہنے لگا' نکالو جو کچھ ہے۔ میرے پاس یہی چاقو تھا میں
نے نکال لیا۔ ٹھیک ٹھاک جنگ ہوئی۔ میں نے دھکا دے کر پہاڑی سے نیچے گرا دیا۔
رائفل اور گھوڑا بھی چھین لیا۔ میں غصے میں تھا۔ شاید جان ہی سے مار ڈالتا لیکن وہ لڑکی
جو اس کے ساتھ تھی درختوں سے نکل آئی اور رو دھو کر مجھے روک لیا۔ میں نے کہا تم
دونوں کی سزا یہ ہے کہ ایک ہفتہ میری میزبانی کرو۔ یہ دونوں مجھے اپنے گھر لے آئے۔
اب بھی جب کبھی مجھے ضرورت پڑتی ہے ایک آدھ روز یہاں رہ جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "ایسا میزبان تو کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

ضامن علی مسکرایا "یہی بات تو تمہیں معلوم نہیں۔ میں جتنا محفوظ اس گھر میں ہوں
کہیں بھی نہیں۔ بشر گل پٹھان ہے اور میں جانتا ہوں جب تک میں بطور مہمان اس چار
دیواری میں ہوں وہ مجھ پر وار نہیں کرے گا اور اب تو شاید وہ اس چار دیواری سے باہر
بھی مجھے مہمان ہی سمجھنے لگا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد بشر گل چائے لے کر آ گیا۔ اس نے خود ہی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔
چائے کے علاوہ مونگ پھلی' بادام وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ مرغی کے آدھ درجن ابلے
ہوئے انڈے تھے۔ میں نے دیکھا' بشر گل ایک مضبوط جسم کا نوجوان تھا۔ شکل و صورت
سے جنگجو اور سخت گیر لگتا تھا۔ اگر ضامن علی نے صرف ایک چاقو کی مدد سے اس پر قابو
پایا تھا تو واقعی ہمت کا کام کیا تھا۔ چائے رکھ کر وہ ایک طرف مودب کھڑا ہو گیا۔ ضامن
نے اسے ساتھ بٹھانا چاہا تو وہ بولا۔

"نہیں استاد جی۔ آپ پئیں۔"

وہ کچھ بے قرار سا نظر آتا تھا۔ جونہی ہم نے چائے ختم کی وہ بولا "استاد جی' ذرا
میرے ساتھ آئیں۔ ایک ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔"

ضامن علی نے ڈکار لے کر اطمینان سے مسہری پر پھیلتے ہوئے کہا "اوئے یہ کوئی
غیر نہیں ہے۔ اپنے ہی قبیلے کی ہے۔ جو کہنا ہے کھلے دل سے کہہ۔"

بشر گل کچھ دیر میری طرف دیکھ کر جھجکتا رہا پھر بولا "استاد' بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔
میں تو شام سے آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک بڑی اچھی خبر ہے آپ کے

لئے۔"

"کیسی خبر؟"

ضامن نے اشتیاق سے پوچھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آج رات ملک بہاری خان اور اس کے کارندے کونج کے شکار پر نکلے ہوئے
ہیں۔ وہ شکرے کی آنکھوں والا بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں دو راتیں
لگ جائیں۔ تاہم آج رات تو وہ کسی صورت واپس نہیں آئیں گے۔ گھر میں وہ پنجابی بابو
اکیلا ہی ہو گا۔ بہت ہوئے تو دو تین رائفل مین ساتھ ہوں گے ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ
نہیں آئے گا۔"

میں نے دیکھا کہ اس اطلاع پر ضامن علی کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں۔ اس نے بے
تابی سے پوچھا "تمہاری رائفل کہاں ہے؟"

"پاس ہی ہے۔" بشر گل نے جواب دیا۔

"لے آؤ" ضامن بولا۔

بشر گل گیا اور رائفل لے آیا۔ ساتھ گولیوں والی بیلٹ بھی تھی۔ ضامن نے
رائفل ہاتھ میں لے لی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس
کی آنکھوں میں وہی دیوانگی نظر آئی جو چند گھنٹے پہلے مان شاہ کے قتل کے موقعے پر نظر آئی
تھی۔

ضامن نے بشر گل سے پوچھا "اور وہ لڑکی؟"

"وہ بھی وہیں ہے۔ میرا خیال ہے اسے حویلی کی بالائی منزل پر رکھا گیا ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"بس میرا قیافہ ہے جی۔"

مجھے اس گفتگو کی کچھ زیادہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ضامن علی جلدی جلدی کہیں
جانے کی تیاری کرنے لگا۔ بشر گل تھوڑی دیر کے لئے باہر گیا تو میں نے ضامن سے پوچھا
"کس پنجابی بابو کی بات کر رہے ہو تم؟"

ضامن نے کہا "میں نے بتایا تھا نا کہ ایک آخری شکار کرنا ہے۔ یہی ہے وہ شکار۔"
وہ تفصیل چھپا رہا تھا۔ تاہم میرے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دو افراد لاہور

سے ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لائے ہوئے ہیں۔ اٹک کے قریب انہوں نے ایک پولیس مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس وقت وہ دونوں قریبی بستی کے ملک بہاری خان کے پاس پناہ لئے ہوئے ہیں۔ بہاری خان ایک زور آور شخص ہے اور اس کے کسی مہمان کو قتل کر دینا آسان نہیں تھا۔ اس اقدام کے لئے کسی سنہری موقعے کی ضرورت تھی.......... اور آج یہ موقعہ ہاتھ آ گیا ہے۔ میں بغور ضامن کی باتیں سن رہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے ایک ایسی بات کہی کہ میں بری طرح چونک گئی۔ آناً فاناً دل و دماغ میں تہلکہ مچ گیا اور سوچ کے پرندے لمحوں میں طویل فاصلے طے کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ ضامن علی نے کہا کہ اغوا ہو کر آنے والی لڑکی کسی حکومتی عہدیدار کی بیٹی ہے۔ سنا ہے کہ وہ کوئی انڈر سیکرٹری وغیرہ ہے۔ یہ الفاظ سنتے ہی میرے ذہن میں ارسہ کا نام گونجا اور اس کی صورت آنکھوں میں گھوم گئی۔ میں نے بڑی کوشش سے اپنے تاثرات چھپائے اور ضامن علی سے لڑکی کے بارے مزید معلومات حاصل کیں۔ ضامن نے بتایا کہ وہ چودہ پندرہ برس کی لڑکی ہے۔ اس نے نیلی جرسی اور سفید پتلون پہن رکھی ہے۔ بال کٹے ہوئے ہیں اغوا کرنے والوں میں سے ایک شخص کا حلیہ سن کر میری نگاہوں میں دہاب چنگیزی کے اس کارندے کی صورت گھوم گئی جس کی گردن میں نے استرے سے زخمی کر دی تھی۔ اس کا نام بالم تھا۔ آنکھیں شکرے سے مشابہ اور چہرے و سر کے بال صاف تھے.......... انتہائی کرب کے عالم میں میں نے سوچا' تو کیا اس بے گناہ لڑکی کو پھر یرغمال بنا لیا گیا ہے..........

جوں جوں میں سوچتی گئی میرا یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ ابھی بشر گل اور ضامن جن لوگوں کا ذکر کر رہے تھے وہ دہاب کے کارندے ہیں اور ان کے قبضے میں آئی ہوئی لڑکی وہی بدنصیب ارسہ ہے جسے میں اور سلیم نے بمشکل موت کے چنگل سے نکالا تھا۔ میرا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس سے بڑھ کر بری خبر اور کیا ہو سکتی تھی۔

دفعتاً میری آنکھوں کے سامنے وہ اخباری تراشہ گھوم گیا جو میں نے چند گھنٹے پہلے ضامن کے پاس دیکھا تھا۔ اس خبر کی تفصیل ذہن میں آئی جس میں پرندوں کو آزاد کرنے کا ذکر کیا گیا تھا.......... ایکا ایکی واقعات کی کڑیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ حالات نے کوئی سنگین رخ اختیار کر رکھا ہے۔ ایک طرف کروڑوں روپے کے پرندوں کو چھوڑنے کی بات کی جا رہی تھی اور دوسری طرف نواز حسنی صاحب کی صاحب زادی

مجرموں کے چنگل میں پھنس کر یہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا.......... اس کا ایک ہی مطلب تھا پرندوں کی رہائی سے پہلے ہی ان کی گرفتاری کا کوئی بندوبست کر لیا گیا ہے۔

قدموں کی چاپ نے مجھے میرے خیالوں سے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا ضامن ایک کمبل لپیٹے لمبے ڈگ بھرتا باہر جا رہا تھا۔ باہر جہاں تاریکی تھی' سردی تھی اور برفانی ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ ایسے موسم' اور ایسی شب میں باہر نکلنا دل گردے کا کام تھا۔ میں اسے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ بیرونی دروازے پر پہنچا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا

"کیا بات ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے پاس جا کر کہا۔

"انسپکٹر ضامن! میرا خیال ہے کہ .... میں اس لڑکی کو کسی حد تک جانتی ہوں۔"

"کیا مطلب۔ مغویہ کو؟"

"ہاں مغویہ کو.......... میں نہیں چاہتی کہ تمہاری جلد بازی سے اسے کوئی نقصان پہنچے۔"

"کون ہے وہ؟"

یہ میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتی' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایک دو روز صبر کر لو یہ معاملہ تمہارے تصور سے زیادہ سنگین ہے۔"

اس نے نفرت سے سر جھٹکا "تمہارا مطلب ہے یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے گنوا دوں!"

میں نے کہا "تمہارے اس سنہری موقعے میں اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو یاد رکھو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

"مجھے کسی نقصان کی پرواہ نہیں" وہ پھنکارا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پیاس ہی پیاس ہے۔ یہ خون کی پیاس تھی۔ وہ آزاد علاقے میں چھپے ہوئے دو مفرور افراد کا خون پینا چاہتا تھا اور بس۔ اس کے علاوہ اسے کسی سے غرض نہیں تھی۔ اس گھڑی وہ مجھے بے حد خوفناک اور خطرناک لگا۔ ایک تیر کی طرح جو کمان سے نکل کر نشانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر میں اس کے راستے میں آتی تو شاید وہ مجھے بھی چھید ڈالتا۔ اس نے دروازے کو لات ماری اور تند بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔ اس نے مجھ سے یہ پوچھنے کی

ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ میں اس لڑکی کو کیونکر جانتی ہوں اور کیوں اس کے لئے پریشان ہوں۔ بشر گل بھی برآمدے میں خاموش کھڑا تھا۔ بشر گل کوئی شریف نوجوان نہیں تھا۔ اچھا خاصا منہ زور غنڈہ لگتا تھا مگر ضامن علی کے سامنے اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اس کی برتری اور بڑائی تسلیم کر چکا تھا۔

وہ سرد رات میں نے اس پہاڑی مکان میں بے قراری سے جاگتے گزار دی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس دور دراز علاقے میں اس طرح ارسہ کی موجودگی کا پتہ چلے گا۔ دل سے رہ رہ کر دعا نکل رہی تھی کہ خدا کرے میرے منحوس اندازے غلط ثابت ہوں۔ مگر جو کچھ میں سن چکی تھی اس کے بعد خوش فہمی میں رہنے کی گنجائش بہت کم تھی۔ شواہد سے یہی ظاہر تھا کہ ارسہ ایک بار پھر چنگیزیوں کی قید میں ہے۔ معلوم نہیں ضامن علی کیا گل کھلانے والا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اسے مغویہ کی رہائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ صرف اغوا کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے وحشی جذبے کی تسکین کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو مغویہ کو کیا فائدہ پہنچتا تھا......... میں سوچتی رہی اور ضامن علی کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ کسی ساتھ والے کمرے میں بشر گل اور اس کی بیوی بھی جاگ رہے تھے۔ بشر گل دو تین دفعہ میرے لئے چائے لے کر آیا۔ جب سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تو بشر گل کا چہرہ تشویش کے گہرے سایوں میں چھپ گیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ استاد ضامن کو زیادہ سے زیادہ تین بجے تک آجانا چاہئے تھا۔ جب صبح کا اجالا پھیلا تو بشر گل نے سر پر اونی ٹوپی رکھی۔ کمبل لپیٹا اور ضامن علی کی خبر لینے روانہ ہوا۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔

اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ ہانپا اور ڈرا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "استاد ضامن مارا گیا ہے۔ بڑی رائفل کا پورا برسٹ لگا ہے اس کی چھاتی میں۔ بستی کے چوراہے میں لاش پڑی ہے اور لوگ جمع ہیں" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ضامن کی صورت نگاہوں میں پھر گئی۔ "آخری شکار" کے بعد وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے تاحشر کوئی بے آرام کرنے والا نہیں تھا۔ پرنم آنکھوں سے تفصیل بتاتے ہوئے بشر

گل نے کہا کہ استاد حویلی کے پچھواڑے سے دیوار پھلانگ کر اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بہاری خاں کے کارندوں نے اسے دیکھ لیا فائرنگ ہوئی اور نتیجے میں استاد چھلنی ہو گیا۔

میں نے دیکھا مسہری پر جہاں ضامن بیٹھا تھا ابھی تک سلوٹیں موجود تھیں۔ اور میز پر وہ پیالی بھی پڑی تھی جس کے پیندے میں اس کی چھوڑی ہوئی چائے تھی۔ انسان کتنا ناپائیدار ہے' برسوں کے منصوبے بنانے والا پل کی خبر نہیں رکھتا۔ بشر گل دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کھجور کی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا "کیا ضامن کی موت سے تمہیں بھی کوئی خطرہ ہے؟" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کیا خطرہ ہے؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

وہ بولا "استاد میری رائفل لے کر گیا تھا۔ بستی میں ایک دو شخص ایسے ہیں جو یہ رائفل پہچان سکتے ہیں۔"

بشر گل کے لئے صورت حال واقعی تشویشناک تھی۔ اتنے میں گھوڑوں کی بہت سی ٹاپیں گونجیں' بشر گل بدک کر کھڑا ہو گیا۔ اسلحے کے نام پر اس کے پاس اب صرف ایک چھوٹا سا پسٹل تھا۔ اس نے بڑے دلیرانہ انداز میں واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پسٹل نکالا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ میں بھی پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگی۔ قریباً بیس گھڑ سوار پہاڑی کی ڈھلوان پر درمیانی رفتار سے گھوڑے بھگاتے نظر آئے۔ تسلی بخش بات یہ تھی کہ ان کا رخ اس مکان کی طرف نہیں تھا۔

بشر گل بولا "بہاری خاں شکار سے واپس آیا ہے۔"

ان کے پاس لکڑی کے بڑے بڑے پنجرے تھے جن میں نو گرفتار شدہ کونجیں کائیں کائیں کر رہی تھیں۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بستی کی طرف جا رہے تھے۔ یقیناً انہیں اس واقعے کا علم نہیں تھا جو بستی میں رونما ہو چکا تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک دراز قد گنجے گھڑ سوار پر پڑی۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ بالم ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ گئی۔ اب اس بات میں شبے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہی تھی کہ چنگیزیوں کے دو کارندے اس دور دراز بستی میں موجود ہیں۔ اور ان کے جال میں پھنسی ہوئی لڑکی ارسہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ میرے لئے فیصلے کی

گھڑیاں تھیں۔ ایک یا دو منٹ کے اندر اندر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں تن تنہا ارسہ کو آزاد تو نہیں کرا سکتی تھی مگر اس کے وارثوں کو اس کا پتہ ٹھکانہ تو بتا سکتی تھی.......... بشر گل دوسرے کمرے میں جلدی جلدی اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑ رہا ہے۔ موجودہ صورت حال میں اس کے لئے یہی بہتر تھا۔ میں نے بھی اپنی گرم چادر لپیٹی۔ جوتی پہنی اور جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

☆==========☆==========☆

میرا واپسی کا سفر بڑا طویل اور صبر آزما تھا۔ قبائلی علاقے سے نکلتے نکلتے مجھے چوبیس گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران ایک دو جگہ مجھے گرفتاری کا خطرہ بھی پیدا ہوا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں کوہاٹ شہر پہنچی اور وہاں سے براستہ بنوں و میانوالی جھنگ کی طرف روانہ ہوئی۔ اتفاقاً بنوں کے بس اڈے سے مجھے اپنے ہی جیسی ایک تنہا عورت مل گئی اور میں نے اسے ہمسفر بنا لیا۔ یوں سرگودھا تک میرا سفر بخیرو خوبی کٹ گیا۔ جوں جوں میں جھنگ سے قریب پہنچ رہی تھی میرے اندر ایک آگ سی پھیلتی جا رہی تھی۔ ان فضاؤں میں میرے فرحان کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یہاں کی دھوپ اس کی مسکراہٹ کا عکس تھی اور چھاؤں اس کی گھنیری پلکوں کا سایہ۔ یہاں کا ذرہ ذرہ اس کی معصوم یادوں کا خزانہ سمیٹے ہوئے تھا۔ مجھے سینے میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ وہی دھند جو مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی تھی ایک بہت بڑی سفید چادر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کھلنے اور بند ہونے لگی۔

جس وقت میں جھنگ پہنچی صبح کے چھ بجے تھے۔ بس اسٹینڈ سے نکل کر میں تانگوں کے اڈے کی طرف آ گئی۔ میرا ارادہ یوسف کے گاؤں گوپور جانے کا تھا۔ یوسف سے میری آخری ملاقات کئی ماہ پہلے خان رحیمی کے ڈیرے پر ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بہت مطمئن تھا۔ صغراں کے ساتھ اس کی منگنی خان رحیمی کی زیر نگرانی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ خان رحیمی نے اسے نایاب باز پکڑنے کے انعام میں معقول رقم بھی دی تھی۔ اس رقم سے یوسف نے اپنی گروی پڑی ہوئی زمین چھڑا لی تھی اور اس پر کاشت شروع کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

جھنگ شہر سے دو گھنٹے کے کچے پکے سفر کے بعد میں سندری گاؤں پہنچی اور خان

رحیمی کے ڈیرے کے نواح سے ہو کر گوپور کی طرف نکل گئی۔ گوپور سے دو میل ادھر ہی خراب رستے کی وجہ سے مجھے تانگہ چھوڑنا پڑا.......... جس وقت میں نے یوسف کے دروازے پر دستک دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا' دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ابھی میں نے دستک دی نہیں تھی کہ دوسری طرف کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز قدموں سے دروازے ہی کی طرف آ رہا تھا۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ کھلا اور سرخ کڑھائی دار چادر میں لپٹی ہوئی ایک دبلی پتلی لڑکی اندر سے برآمد ہوئی۔ اس نے چمکدار شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور ایک ہاتھ میں روٹی کے برتن تھے۔ میں دروازے سے پیچھے ہٹ چکی تھی اس لئے لڑکی نے مجھ پر زیادہ توجہ نہیں دی تاہم میں نے چادر کی اوٹ سے نہ صرف اسے دیکھ لیا بلکہ پہچان بھی لیا۔ وہ صغراں تھی۔ یوسف کے گھر سے اس کا یوں روٹی لے کر برآمد ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اور یوسف رشتہ ازدواج میں بندھ چکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑی صغراں کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی چال میں دوشیزگی کا بانکپن اور محبت کی شوخی تھی۔ دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے اور اس کی نگاہیں بہت دور تک پرواز کر رہی ہیں۔ میں بھی کسی معمول کی طرح صغراں کے پیچھے چل دی۔ شاید دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ صغراں اور یوسف کو ایک ساتھ بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھوں۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں خوشبو کی طرح مہکتی اور چکراتی چلی جا رہی تھی۔ کسی کو "چاچا سلام" کہتی تھی اور کسی کو "بھائی جان سلام" کسی کو ماسی کہہ کر اس کی خیریت پوچھتی تھی اور کسی ہم عمر سہیلی سے ٹھٹھا کر کے آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہ خوش بختی کا پیکر تھی اور میں بدبختی کے سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ کھیتوں میں پہنچ کر وہ نصف فرلانگ تک ایک پگڈنڈی پر چلی اور پھر وہ منظر میرے سامنے آیا جس کی کشش مجھے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ ایک پیڑ کے سائے تلے یوسف چارپائی ڈالے نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ صغراں کو دیکھتے ہی یوسف کی آنکھوں میں وہ چمک نظر آئی جو نخلستان کو دیکھ کر صحرا نورد کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ صغراں اور وہ ساتھ ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ عمر رسیدہ شخص تھوڑی دیر ان کے پاس رہنے بعد ایک طرف چلا گیا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ میں ان سے قریباً بیس قدم دور شیشم کے درختوں میں کھڑی تھی۔

جلد ہی یوسف کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ اتنی دور سے مجھے پہچان تو نہیں سکا لیکن اس کی نگاہوں میں جستجو نظر آنے لگی کہ یہ کون عورت درختوں میں سے جھانک رہی ہے۔ اب میرا یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں یوسف اور صغراں کی طرف بڑھی۔ جونہی یوسف نے مجھے پہچانا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت صغراں کے چہرے پر بھی دکھائی دی۔ صغراں نے "باجی" کہہ کر ہلکی سی چیخ ماری اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ یوسف حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

باجی کہہ کر اس نے بے تابی سے میرا بازو تھام لیا اور بولا "تم کہاں تھیں باجی" ہم تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار چکے تھے۔"

میں نے کہا "ان سب باتوں کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں۔ تم کھانا کھالو۔ پھر میں صغراں کے ساتھ گھر چلی جاتی ہوں۔ شام کو تم آؤ گے تو سب کچھ بتاؤں گی۔"

وہ جھلا کر بولا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ یہ کام مجھے تم سے زیادہ......... پیارا ہے۔ لعنت ہے ایسے کام پر" اس نے پاؤں میں پڑی ہوئی درانتی کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ پھر چیخ کر عمر رسیدہ شخص سے بولا۔

"رحمو چاچا۔ مہمان آئے ہیں۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ اونچے کھیت میں اچھی طرح پانی لگوا لینا۔ میں اب نہیں آؤں گا۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے میرا بازو تھاما اور قریباً کھینچتا ہوا گھر کی طرف لے چلا۔

.... یوسف کے گھر میں اب کافی خوشحالی نظر آتی تھی۔ در و دیوار کی چمک گواہی دے رہی تھی کہ انہیں بنانے سنوارنے والی آگئی ہے۔ یوسف کی والدہ نے بھی بڑے خلوص اور خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ وہ میرے حالات سننے کے لئے بے چین نظر آتے تھے لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دیا یوسف کی والدہ سے پتہ چلا کہ یوسف اور صغراں کی شادی دو ماہ قبل ہوئی ہے۔ ایک ماہ میکے میں گزارنے کے بعد صغراں پچھلے ہفتے ہی واپس آئی تھی۔ یوسف کی والدہ نے بتایا کہ مجھے شادی میں شریک کرنے کے لئے اس نے لاہور اور جھنگ کے کئی چکر لگائے لیکن میرا کچھ پتہ نہ چلا۔ ہماری گفتگو کے

دوران ہی یوسف اور صغراں صحن میں گھومتی مرغیوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ وہ ذبح کرنے کے لئے ایک مرغی پکڑنا چاہتے تھے۔ ان کی شوخ آوازیں کمرے کے اندر تک پہنچ رہی تھیں۔ یوسف مرغی پکڑنا چاہتا تھا جبکہ صغراں ایک موٹے تازے مرغے کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے دو ننھے بچے اردگرد سے بے خبر اپنے حال میں مگن کھیل کود میں مصروف ہوں۔ میں نے اندر سے آواز دے کر یوسف سے کہا کہ وہ میرے لئے کوئی تکلف نہ کریں لیکن ان دونوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

وہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ رات گئے تک یوسف اور صغراں میرے چاؤ چونچلوں میں لگے رہے۔ صغراں کنوئیں سے گھڑوں میں پانی بھر بھر کر لائی اور مجھے نہانے پر مجبور کیا۔

بالکل نئے کپڑے پہننے کو دیے۔ اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔ یوسف کبھی میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگتا کبھی باورچی خانے میں جا کر بیوی کا ہاتھ بٹانے لگتا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔ کہنے لگا۔

"پتہ ہے باجی! میں نے وہی کچھ پکوایا ہے جو میری شادی کے موقع پر پکا تھا۔ مجھے آج تک یہی محسوس ہوتا تھا کہ میری شادی کی دعوت ادھوری ہے۔"

میرے پوچھنے پر یوسف نے بتایا کہ خان رحیمی آج کل اپنے ڈیرے پر ہی ہے۔ اس کی کچھ زمین ایک سرکاری رکھ کے اندر آگئی ہے۔ وہ بہت پریشان ہے اور ہفتے میں چار پانچ روز کچہریوں کے چکر میں گزارتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ سیاسی دشمنی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہاب چنگیزی کا آج کل بڑا زور ہے پورے علاقے میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ الیکشن تو پال پور کے چودھریوں نے جیتا تھا لیکن ممبری کی طاقت چنگیزیوں کے پاس ہے۔ ابھی چار پانچ دن پہلے وہاب چنگیزی ہمارے علاقے میں آیا تھا۔ پولیس کی تین چار گاڑیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ پتہ نہیں کتنے گز لمبی کار تھی اس کے نیچے۔ شکل سے بڑا مومن نظر آ رہا تھا۔ کالی شیروانی ٹوپی اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اسے ایک بڑے افسر کے ساتھ کرسی دی گئی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا کوئی جلسہ وغیرہ تھا؟"

یوسف حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا "باجی! تم کو نہیں پتہ؟"

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو انہوں نے پکھیرو اڑائے ہیں۔"

مجھے جھٹکا سا لگا اور اس کے ساتھ ہی یوسف کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ پکھیروؤں سے اس کی مراد پرندے تھے۔ وہی پرندے جن کی آزادی کی خبر میں نے چند روز پرانے اخبار میں پڑھی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم بازوں اور عقابوں کی بات کر رہے ہو؟"

"تو اور کیا" یوسف نے ترت کہا "یہ خبر تو اخباروں میں بھی چھپ چکی ہے۔ وہ سارے باز اور عقاب جو لائسنس کے بغیر پکڑے گئے تھے پولیس والوں نے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ ساری کارروائی ہمارے ہی علاقے میں ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

وہ بولا "نہیں.......... لیکن چودھری صاحب دیکھ کر آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ لکڑی کے بڑے بڑے پنجروں میں بند کر کے اور ٹرکوں پر لاد کر وہ پکھیرو وہاں لائے گئے تھے پھر بہت سے لوگوں کے سامنے انہیں کھلی ہوا میں چھوڑ دیا گیا۔"

میں حیرت سے یوسف کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ ضرور کوئی پردہ تھا جو نظر اور منظر کے درمیان حائل تھا۔ کسی سازش کے تانے بانے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ارسہ سینکڑوں میل دور ایک پہاڑی بستی میں محبوس تھی اور یہاں وہاب چنگیزی چہرے پر نقاب ڈالے قانون کے محافظوں کے شانے سے شانہ ملائے چل رہا تھا۔ میں فوری طور پر نواز حسنی یا خان رحیمی سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ اور میں یہاں آئی بھی اس لئے تھی کہ یوسف کے ذریعے نواز حسنی تک اپنا پیغام پہنچا سکوں۔ ظاہر ہے یوسف کو لاہور میں کوئی نہیں پہچانتا تھا اور وہ وہاں چنگیزیوں کے بچھائے ہوئے جال میں آئے بغیر نواز حسنی تک پہنچ سکتا تھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ یوسف کو ایک مختصر تحریری پیغام دے کر لاہور روانہ کروں۔ مگر یہاں آ کر میں مختلف انداز میں سوچنے لگی تھی۔ یوسف اور صغراں کی خوبصورت زندگی پر اپنا منحوس سایہ ڈال کر میں وہ غلطی دہرا رہی تھی جو میں نے اپنی دوست فرخندہ اور اس کے منگیتر عابد سے رابطہ قائم کر کے کی تھی۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اس چہکتے مہکتے آشیانے

سے کوسوں دور رہنا چاہئے تھا.......... میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ یوسف کو اس آگ میں نہیں گھسیٹوں گی اور آج رات ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ یوسف اور صغراں میرے ارادوں سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کئی روز یہاں رکوں گی اور وہ جی بھر کر مجھ سے باتیں کر سکیں گے۔ وہ نادان تھے انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے پیچھے کیسی کیسی بلائیں لگا چکی ہوں اور میری میزبانی انہیں کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے۔

رات گئے تک وہ دونوں میرے پاس رہے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ میں رنجیدہ ہوں۔ میری دلجوئی کے لئے انہوں نے ایک شاندار پروگرام بنایا۔ اگلے روز ایک قریبی گاؤں میں بہت بڑا میلہ شروع ہو رہا تھا۔ یوسف اور صغراں نے طے کیا کہ وہ کل مجھے ساتھ لے کر وہاں جائیں گے اور پورے چوبیس گھنٹے کے بعد لوٹیں گے۔ وہ دیر تک اس پروگرام کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ میں جسمانی طور پر ان کے ساتھ بیٹھی تھی لیکن ذہنی طور پر بہت دور تھی۔ وہ میلوں ٹھیلوں کی باتیں کر رہے تھے اور میرے کانوں میں قبرستان کی خاموشی گونج رہی تھی.......... قبرستان جہاں میرا بچہ پہنچ چکا تھا.......... اور جہاں شاید مجھے بھی پہنچ جانا تھا۔

رات گئے جب وہ دونوں سو گئے تو میں نے یوسف کے نام ایک چھوٹی سی تحریر چھوڑی اور ایک چھوٹا سا کمبل اور دری لے کر گھر سے نکل آئی۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ کھیتوں میں چھپتی چھپاتی محتاط قدموں سے میں پختہ سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ اب میرا ارادہ لاہور جانے کا تھا۔

☆===========☆===========☆

اگلے روز سہ پہر تین بجے میں لاہور پہنچی۔ بس اڈے سے سیدھی نواز حسنی صاحب کے آفس روانہ ہوئی۔ وہ کمبل جو میں یوسف کے گھر سے لائی تھی میرے بہت کام آ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے کمبل کو گول لپیٹ کر میں نے دری سے ڈھانپ لیا تھا اور کسی شیر خوار بچے کی طرح کندھے سے لگا لیا تھا۔ حلئے کی اس معمولی تبدیلی سے میری خاصی ڈھارس بندھی تھی اور مجھے امید تھی کہ میں چنگیزیوں کی نگران آنکھوں سے بچ کر نواز حسنی صاحب تک پہنچ جاؤں گی۔ نواز حسنی صاحب ایک بڑے افسر تھے۔ ان تک رسائی حاصل ہو جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ دو تین مرحلوں سے گزر کر میں اس شخص تک

پہنچ گئی جو میری چٹ نواز صاحب کے کمرے میں پہنچا سکتا تھا۔ اس شخص نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا۔ میرا خستہ حلیہ اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے التجائی لہجے میں کہا۔

"بھائی صاحب! خدا کے لئے دیر نہ کریں۔ بہت نقصان ہو جائے گا سیکرٹری صاحب کا۔"

میں نے چٹ پر اپنا نام شاہدہ لکھوایا تھا اور خان رحیمی کا حوالہ دیا تھا۔ وہ چٹ لے کر ایک راہداری میں گم ہو گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی وہ خاصی عجلت میں تھا کہنے لگا "آیئے بی بی جلدی آیئے" میں اس کے ساتھ نواز حسنی صاحب کے شاندار آفس میں داخل ہوئی مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ دفتر سے ملحقہ کمرہ نشست گاہ تھا۔ وہ مجھے نشست گاہ میں لے آئے۔ ان کے چہرے پر تعجب اور الجھن کے گھمبیر سائے تھے۔ وہ جھلاہٹ سے بولے۔

"شاء محمود' یہ تم کیا کرتی ہو؟ کیوں ایک خلقت کو پریشان کر رکھا ہے تم نے! بتائے بغیر چلے جانا۔ مہینوں گم رہنا اور پھر اچانک آ دھمکنا۔ یہ سب کیا ہے؟"

میں نے کہا "سر' بس پاؤں میں چکر ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو.......... بہت شرمندہ ہوں کہ اپنے محسنوں کو اذیت میں مبتلا رکھتی ہوں۔ لیکن میرے بس میں کچھ نہیں ہے سر۔"

نواز حسنی صاحب نے کہا۔

"خان رحیمی نے مجھے تمہاری چھوڑی ہوئی چٹھی دکھائی تھی جس میں تم نے مایوسی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ ہم وہاب چنگیزی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور.......... یہ کہ تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے اسی میں تمہاری بہتری ہے.........."

میں نے کہا "ہاں جناب' میری اور میرے خیر خواہوں کی بہتری اب ایک دوسرے سے جدا رہنے میں ہی ہے۔ اس وقت بھی میں آپ کے پاس آئی ہوں تو صرف ایک اطلاع دینے کے لئے۔"

"کیسی اطلاع؟" نواز حسنی صاحب نے چونک کر پوچھا میں نے کہا "سر' ارسہ کہاں ہے؟"

نواز حسنی صاحب بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ "کک.......... کیوں کیا ہوا ارسہ کو۔ وہ اپنی پھوپھی کے پاس ملتان گئی ہوئی ہے۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ اس کا مطلب تھا نواز حسنی کو ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔ میں نے پوچھا "آپ کو یقین ہے کہ وہ پھوپھی کے گھر ہی میں ہے؟"

"بھئی کیسی باتیں کرتی ہو تم؟" نواز حسنی صاحب نے کہا "ابھی.......... ابھی ایک گھنٹہ پہلے میں نے اس سے فون پر بات کی ہے۔"

"ایک گھنٹہ پہلے" میں نے سخت حیرت کے عالم میں پوچھا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ نواز صاحب.......... ارسہ تو.........."

"کیا ارسہ ارسہ لگا رکھی ہے۔ کیا ہوا ہے اسے۔ کیا اطلاع ہے تمہارے پاس؟" انہوں نے جھلاہٹ سے کہا۔

اب میرے پاس تفصیل بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں نواز صاحب کو بتایا کہ میں لاہور سے آزاد قبائلی علاقے میں کیسے پہنچی۔ اس روئیداد میں میں سلیم کا ذکر گول کر گئی۔ میں نے صرف اتنا بتایا کہ سلیم کی والدہ سے مل کر میرے دل میں ان کی مدد کرنے کی خواہش جاگی تھی اور میں سلیم کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی.......... جب میں نے نواز حسنی صاحب کو یہ بتایا کہ پارہ چنار کے اس دور دراز گاؤں میں میں نے وہاب چنگیزی کے کارندے دیکھے ہیں اور ان کے قبضے میں آئی ایک نوجوان لڑکی کا تذکرہ سنا ہے تو نواز حسنی کی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھ گیا۔ معلوم نہیں وہ پریشان تھے یا الجھن کا شکار تھے انہوں نے سگار سلگا کر ایک دو گہرے کش لئے اور بولے۔

"تمہیں اس حد تک تو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ارسہ کو خدانخواستہ دوبارہ کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ لیکن اگر چنگیزی کے کارندے وہاں موجود ہیں تو ہمیں یقینی طور پر تشویش ہونی چاہئے۔"

اسی دوران فون کی گھنٹی بجی۔ نواز حسنی صاحب نے لپک کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف کی آواز سن کر ان کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر میری طرف دیکھا اور بولے "ایک منٹ ہولڈ کرو رب نواز" ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر انہوں

نے مجھ سے کہا "مس ثناء' پلیز تم دو منٹ باہر بیٹھو میں ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔"

میں اٹھ کر باہر آگئی۔ فون پر گفتگو کے دوران نواز حسنی صاحب کے منہ سے رب نواز کا نام سن کر اور ان کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر میرے ذہن میں ان گنت وسوسے سر اٹھانے لگے۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ نواز حسنی صاحب وہ نہیں ہیں جو وہ آٹھ ماہ پہلے تھے آج.......... وہ مجھ سے بہت کچھ چھپا رہے تھے۔ ان کے لہجے میں اجنبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے انتظار کرتے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو گیا تو میں نے پی اے صاحب سے پوچھا کہ بڑے صاحب فارغ ہوئے ہیں یا نہیں۔ پی اے صاحب نے بتایا کہ وہ تو فون سننے کے فوراً بعد کہیں چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو بٹھایا جائے۔ وہ واپسی پر آپ سے ملیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ ایک چوکیدار اور گن مین مجھ پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور شاید میں اپنی مرضی سے اس عمارت سے باہر نہ نکل سکوں۔ یہ احساس بے حد تکلیف دہ تھا میں یہاں خالص مدد کے جذبے سے آئی تھی۔ نواز حسنی صاحب یا ان کے عہدے اور اثر و رسوخ سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ میں ان تکلفات کی منزل سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ پھر مجھے تشکیک کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا تھا..........

میں نے پی اے سے کہا کہ میں باتھ روم تک جانا چاہتی ہوں۔ پی اے نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور مجھ سے کہا کہ "یہ آپ کو چھوڑ آتا ہے" میں چوکیدار کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ کمبل اور دری جو اب گٹھڑی کی صورت میں میرے پاس تھے۔ میں نے پی اے کے کمرے میں ہی رہنے دیئے چوکیدار نے مجھے ٹوائیلٹ کا دروازہ دکھا دیا۔ یہ ویسا ہی ٹوائیلٹ تھا جیسے عموماً سرکاری دفاتر میں ہوتے ہیں۔ میں اندر داخل ہوتے ہی مردانہ والے پورشن کی طرف چلی گئی۔

جب دس منٹ تک میں باہر نہیں آئی تو چوکیدار شک بھری نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا اور جھجکتا ہوا لیڈیز پورشن کی طرف گیا۔ میں اسی موقعے کے انتظار میں تھی۔ باہر نکلی اور تیز قدموں سے کوریڈور طے کر کے لفٹ تک آگئی۔ خوش قسمتی سے لفٹ کا دروازہ کھلا ملا۔ تیس سیکنڈ بعد میں گراؤنڈ فلور پر تھی۔ عمارت سے نکلتے ہی میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور لوئر مال روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔ "کہاں جانا ہے بی بی!؟"

ڈرائیور نے تیسری بار مجھ سے پوچھا تو میں اپنے خیالوں سے چونک گئی۔ "کہاں جاؤں" میں نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا تو میں نے اسے قبرستان میانی صاحب چلنے کو کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور چوبرجی پہنچا اور وہاں سے بہاولپور روڈ کی طرف مڑ گیا۔ جلد ہی مجھے لب سڑک اپنے ابو کی قبر نظر آئی جس کے سرہانے سفید کتبہ دور ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی رکوائی اور سر پر چادر درست کرتی ہوئی قبرستان میں داخل ہو گئی۔ ابو کے پہلو میں چار اور قبروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ان میں دو قبریں بڑی تھیں اور دو چھوٹی۔ ننھی منی دل ہلا دینے والی قبریں۔ یہاں میرا چہیتا بھائی اور اس کے معصوم بچے سو رہے تھے' جنہیں قریباً دس ماہ پہلے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اسے ایک ڈکیتی کا نام دیا گیا تھا۔ سب نے اسے ڈکیتی ہی کہا تھا۔ لیکن میرا دل ہر گھڑی گواہی دیتا تھا کہ وہ ڈکیتی نہیں تھی۔ اور اگر ڈکیتی تھی بھی تو ڈاکو وہاب چنگیزی ہی تھا.......... میں ان پانچ قبروں پر دیر تک ماتم کناں رہی۔ میری آنکھیں بنجر تھیں لیکن دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ خونی آنسو کسی آبشار کی طرح میرے سینے کے اندر ہی اندر کہیں گر رہے تھے اور جذب ہو رہے تھے۔ میں آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھی ہچکیوں سے میرا پورا جسم دہل رہا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسی قبرستان میں کہیں فرخندہ اور عابد کی قبریں بھی تھیں اور یہیں کہیں وہ ننھی منی تنہا قبر بھی تھی جو روز مجھے بلاتی تھی میری ممتا کو آواز دیتی تھی۔

مجھ منحوس کے دم قدم سے کتنا اضافہ ہوا تھا اس شہر خموشاں کی آبادی میں۔ میرا جی چاہا کہ میں ہوا کی طرح اس قبرستان میں بکھر جاؤں اور اس ننھی قبر کو تلاش کروں جہاں میرا لخت جگر سو رہا تھا۔ پھر اپنے ناخنوں سے اس قبر کو ادھیڑوں۔ اسے کرید کرید کر کشادہ کروں اور اپنے بیٹے کے پہلو میں لیٹ کر مٹی اوڑھ لوں۔ عجیب عجیب خیال ذہن میں آ رہے تھے۔ میں دل کے سکون کے لئے آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ میری چھٹی حس نے کہا مجھے اس قبرستان سے نکل کر اپنے بچے سے دور چلے جانا چاہئے ورنہ نہ جانے میں کیا کر گزروں۔ تیز قدموں سے میں واپس مڑی اور ٹیکسی میں آبیٹھی۔ پسینہ دھاروں کی صورت میری گردن سے بہہ رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور میری ابتر حالت کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ چار پانچ منٹ بعد جب میری

حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اسے اچھرہ چلنے کے لئے کہا۔ میرے دل میں یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ ایک دفعہ عشرت کے گھر کا دروازہ دیکھوں۔ کیا معلوم اس دروازے کے پیچھے عشرت ابھی تک زندہ سلامت موجود ہو۔ مجھے دیکھ کر چارپائی سے کھڑی ہو جائے اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ جائے۔ جب سے میں نے لاہور چھوڑا تھا اور سلیم کے ساتھ آزاد علاقے میں پہنچی تھی ماضی سے میرا ناطہ بالکل کٹا ہوا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہاں کیا ہوا ہے۔ کون مرا اور کون جیا ہے۔ میں عشرت کو بہت نازک حالت میں چھوڑ کر گئی تھی۔ مجھے اس کی طرف سے بے حد فکر رہتی تھی لیکن ہزار خواہش کے باوجود مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اب عشرت کے پاس سے ہو کر واپس لوٹ جانا مجھے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور مزنگ چونگی سے اچھرے کی جانب مڑ گیا۔ مجھے ان گلیوں کا نقشہ ابھی تک یاد تھا۔ ڈرائیور کو ہدایات دیتی ہوئی میں اس دروازے کے سامنے پہنچ گئی جہاں میڈم نادرہ سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی اور جہاں میں پہلی بار آنٹی صادقہ سے متعارف ہوئی تھی۔ وہ آنٹی صادقہ جس نے اپنی جوانی اور زندگی ایک قریب المرگ شاعر کی بچیوں کے نام کر کے محبت کی لافانی داستان رقم کی تھی۔ میں عشرت کے ساتھ ساتھ اس عورت کو بھی ایک بار نظروں سے چھونا چاہتی تھی۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ اس گھر کے دروازے پر پہنچ کر میری ساری ہمتیں جواب دے گئیں.......... ایسا کیوں ہوا؟ شاید اس لئے کہ میں جانتی تھی' جب تک میں اس دروازے پر دستک نہیں دوں گی عشرت میرے لئے زندہ رہے گی اور جس گھڑی میں نے اس دروازے کو چھو لیا اور یہ دروازہ میرے سامنے کھل گیا عشرت مرجائے گی.......... اور میں .... عشرت کو مارنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اپنے ذہن میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتی تھی میری اس بے خبری سے وہ زندہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ امید تو زندہ رہ سکتی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ اس گھڑی میری دلی کیفیت نجانے کیا ہو رہی تھی۔ میں اس دروازے کے سامنے سے ہو کر واپس لوٹ آئی۔ ڈرائیور حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے واپس چلنے کو کہا..........

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں بذریعہ بس واپس روانہ ہو رہی تھی۔ میرے پاؤں سے

جیسے بگولے بندھ گئے تھے۔ مجھے کہیں قرار نہیں تھا۔ میں شہر شہر اور سڑک سڑک چکرا رہی تھی۔ اب میری منزل پھر جھنگ تھا لیکن اس دفعہ میں خان رحیمی کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی تھی۔ خان رحیمی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسرار کے پردے میں یہ کون سی سازش چھپی ہوئی ہے۔ نواز حسنی صاحب کی لاڈلی بیٹی سینکڑوں میل دور درندہ صفت لوگوں کے قبضے میں ہے اور وہ اس خبر کو بڑے یقین کے ساتھ جھٹلا رہے ہیں۔ وہ بے خبر ہیں یا بے خبر بنے ہوئے ہیں۔

رات نو بجے میں سندری گاؤں پہنچی اور وہاں سے چھپتی چھپاتی خان رحیمی کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ آج تقریباً ایک برس بعد میں نے اس ڈیرے کا رخ کیا تھا۔ انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی یہ وسیع و عریض کوٹھی ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ کر گئی تھی۔ خان رحیمی کے خوفناک سینٹ برنارڈ کتے گیٹ کے قریب بھونک رہے تھے۔ ترشے ہوئے خوبصورت لان کے بیچوں بیچ اینٹوں کے سرخ برادے کی سڑک اندر تک چلی گئی تھی۔ کوٹھی کو چاروں طرف سے گھنے جنگل نے گھیرا ہوا تھا اور درودیوار کو دیکھ کر ہیبت کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے سوچا ان ہیبت ناک دیواروں میں اگر رنگین مزاج اور ہمیشہ ہنسنے ہنسانے والا خان رحیمی نہ رہتا ہو تو کتنی ناقابل برداشت ہو یہ عمارت۔ میں گیٹ پر پہنچی تو تھوڑی سی کوشش کے بعد چوکیدار نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے فوراً اندر اطلاع پہنچائی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے دینو کی شکل نظر آئی وہ بھاگتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے پیچھے خان رحیمی کا ہیولا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر دینو کو جتنی حیرت ہوئی اتنی ہی مجھے بھی ہوئی۔ بلکہ میری حیرت اس سے شدید تھی۔ میں نے دو ماہ پہلے پہاڑی والے مکان میں دینو کو بری طرح زخمی ہو کر گرتے دیکھا تھا۔ میرے دل میں بارہا یہ وسوسہ سر اٹھا چکا تھا کہ کہیں دینو کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "مجھے تو لگتا ہے میں خواب ویندا پیا ہوں۔ آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نابی بی جی..........؟"

میں نے کہا "ہاں.......... میں تو ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟" اتنے میں خان رحیمی بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ اس نے بالکل نو عمر لڑکوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ سفید پتلون' سفید جوتے اور آدھی آستین کی شوخ دھاریوں والی شرٹ۔ چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور چند بار تھپکنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔

کچھ دیر بعد ہم سب ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خان رحیمی کا بڑ حرام بھتیجا باقر' خاص ملازمہ شوقیہ اور سردار محمد وغیرہ بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ تاہم ایک چہرہ جس کی دید نے مجھے حیرت زدہ کر دیا میڈم نادرہ کا تھا۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے غمزدہ انداز میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میری آمد پر بھی اس نے ہاتھ چہرے سے نہیں ہٹائے۔ میڈم نادرہ کو دیکھتے ہی نفرت سے میرا جسم جلنے لگا۔ میں نے اپنے معصوم بھتیجوں کے صدقے اسے معاف کر دیا تھا اور دنیا والوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ عشرت اور میری بھابی ثمینہ کی اصل ماں یہی مکروہ صورت عورت ہے۔ لیکن دل سے میں اس عورت کی نفرت کو کیسے کھرچ سکتی تھی۔ یہ میرے لئے ناممکن تھا۔ میری بربادیوں کی جڑ یہی عورت تھی اور میرے بچے کے خون کے کچھ چھینٹے اس عورت کے ہاتھوں پر بھی تھے۔ میڈم نادرہ نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور نگاہیں ملتے ہی میرے غیض و غضب کو محسوس کر لیا۔ اس نے اپنے پاس کھڑے ہوئے لڑکے کو اشارہ کیا اور وہ اس کی چیئر دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

میں نے بے انتہا تلخ لہجے میں خان رحیمی سے پوچھا "جناب' یہ عورت یہاں کیسے آئی ہے.........؟"

خان رحیمی کے چہرے پر پھر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ بولا۔

"ذرا سانس تو لے لو مائی ڈیئر گرل' سب کچھ بتاتا ہوں تم کو اور سب کچھ پوچھتا بھی ہوں۔"

میں بے دلی سے بیٹھ گئی کچھ ہی دیر بعد سب لوگ علیک سلیک کر کے رخصت ہو گئے۔ میں اور خان رحیمی ڈرائنگ روم میں تنہا رہ گئے میں نے تند لہجے میں کہا "سر! کچھ بھی کہنے سننے سے پہلے میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ عورت یہاں کیسے آئی ہے۔"

خان رحیمی بولا "گرل' سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ اچھی نیوز سنانا چاہتا ہوں کہ عشرت کا پتہ چل گیا ہے۔ اس کو کچھ لوگوں نے بلیک میل کیا تھا اور لاہور لے گئے تھے وہاں وہ سخت بیمار ہو گئی اور بلیک میل کرنے والوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ وہاں سے اپنے

گھر پہنچ گئی۔ صادقہ نامی ایک عورت عشرت کی ماں ہے' میڈم نادرہ' صادقہ کی گہری دوست ہے۔ عشرت کو دل کا شدید مرض لاحق ہو چکا تھا۔ صادقہ اور نادرہ نے اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا اور آپریشن کے لئے اسے انگلینڈ لے کر گئیں۔ سرجری کے بعد عشرت صحت یاب ہو کر واپس آئی ہے اور اب لاہور میں ہے۔" عشرت کی زندگی کی نوید پا کر مجھے جو مسرت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ بظاہر میں خاموشی سے خان رحیمی کی باتیں سن رہی تھی۔ خان رحیمی کو کیسے بتاتی کہ عشرت کی ماں صادقہ نہیں بلکہ یہی فریبی عورت میڈم نادرہ ہے اور وہ عشرت کے ساتھ ساتھ میری بھابی کی بھی ماں ہے......... میں نے پوچھا۔

"خان صاحب! میں نے آپ سے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ عورت یہاں پہنچی کیسے ہے؟"

خان رحیمی نے سگار سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور بولے "اس سوال کا جواب کافی پیچیدہ ہے۔ آفٹر آل' میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ میڈم نادرہ اب ایک بدلی ہوئی عورت ہے۔ آئی ڈونٹ نو' یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔ بہرحال ہو چکا ہے۔ میڈم نادرہ نے چنگیزی گھرانے سے اپنے تعلقات یکسر ختم کر لئے ہیں پچھلے چھ مہینوں میں اس نے دو بار عمرہ ادا کیا ہے اور اب بڑی نیک نیتی کے ساتھ معذور بچوں کے لئے ایک سکول کی بنیاد رکھ رہی ہے۔"

میں نے کہا "سر! میرا سوال اپنی جگہ برقرار ہے۔ اس عورت کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

خان رحیمی کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھنے کے بعد بولے "یہ عورت ایک مریضہ کے درد کا علاج تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچی ہے۔ میرا مطلب عشرت ہے۔ گو عشرت اب تندرست ہے لیکن ڈاکٹروں نے ہدایت کر رکھی ہے کہ اسے ہر ممکن خوش رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ایک نارمل زندگی گزار سکے اور مرض عود کر آنے کا خطرہ موجود نہ رہے۔ عشرت کی والدہ اور میڈم نادرہ کو اندازہ ہوا ہے کہ عشرت کسی شخص کی شدید محبت میں گرفتار ہے۔ وہ شخص کون ہے؟ اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے میڈم نادرہ ماری ماری پھر رہی ہے۔"

"شدید محبت۔"

میں نے زیرِ لب دہرایا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں سلیم کا نام گونج گیا.......... اس کا مطلب تھا میڈم نادرہ سلیم کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی.......... اپنی بیٹی کی زندگی کی خاطر اس شخص کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی جسے اس نے قدم قدم پر زخم لگائے تھے اور جس کی پوری زندگی کو طوفانوں کے حوالے کر دیا تھا۔ سلیم کو چنگیزیوں کے عتاب کا شکار کرنے کے لئے میڈم نادرہ نے میرا رشتہ چنگیزی گھرانے میں کرایا تھا۔ وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو رہی تھی لیکن اب وہی معتوب سلیم میڈم نادرہ کو درکار ہو گیا تھا۔ خود کو عقلِ کل سمجھنے والے انسان کو قدرت کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔

اچانک میرے ذہن میں آیا کہ اگر دینو خان رحیمی کے پاس ہے تو خان رحیمی کو سلیم کے متعلق بھی علم ہوگا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"سر، سلیم کہاں ہے؟"

خان رحیمی نے ایک طویل سانس لی "اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ معلوم نہیں کہاں رہی ہو تم اتنے دن؟"

میں نے کہا۔ "سر میں اس کے ایک پٹھان دوست غلام خاں کے گھر میں تھی ایک رات غلام خاں کے کچھ پرانے مخالفین نے.........."

"شاپ اِٹ.......... شاپ اٹ" خان رحیمی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "میں اس بارے میں دینو کی زبانی سب کچھ سن چکا ہوں اور مجھے یقین ہے دینو نے کچھ بھی غلط نہیں بتایا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا تمہیں دوبارہ اپنے زخم کریدنے پڑیں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ غلام خاں کے مخالفین کے ہاتھوں سے نکل کر تم کہاں پہنچیں۔ میری معلومات کے مطابق توخی خانم اپنے بیٹے زرگل سے تمہاری شادی کا ارادہ رکھتی تھی شادی کے انتظامات بھی ہو چکے تھے مگر صرف ایک دن قبل تم غائب ہو گئیں۔ تم چھپ چھپا کر ان عورتوں میں شامل ہو گئیں جو کسی مزار پر سلام وغیرہ کرنے جا رہی تھیں۔ توخی خانم اور عمر شاہ لندو کے آدمیوں نے تمہارا پیچھا کیا مگر تم نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ آئی تھنک یہاں تک تو میں باخبر ہوں۔"

مجھے خان رحیمی کی باخبری پر واقعی حیرانی ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا "سر آپ کو یہ

سب کچھ.........."

"مجھے دینو نے بتایا ہے" خان رحیمی نے جواب دیا۔ "شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ غلام خاں کی موت اور تمہارے اغوا کے بعد سلیم نے کیا طوفان کھڑا کیا ہے۔"

میرے ذہن میں خطرے کی سینکڑوں گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"کیسا طوفان؟" میں نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

خان رحیمی نے سگار کا دھواں اڑا کر ڈرامائی لہجے میں کہا "گرل' اس نے پورے ایک خانہ بدوش قبیلے کو تہس نہس کر دیا ہے۔"

"تہس نہس؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں.......... تمہارے توخی خانم کے چنگل سے نکلنے کے صرف تین روز بعد غلام خاں کے قبیلے نے پاوندہ قبیلے کے پڑاؤ پر زور دار حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں سلیم پیش پیش تھا۔ شاید تمہیں جان کر حیرت ہو کہ اس لڑائی میں بھاری مشین گنیں اور دستی بم استعمال کئے گئے۔ پورے دس گھنٹے میدان کارزار گرم رہا۔ دونوں طرف کے کم از کم پندرہ افراد ہلاک اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس خوفناک جھگڑے نے اس وقت عجیب صورت اختیار کر لی تھی جب بستی کے ملک عمر شاہ لندو کو خود اس کے برادر نسبتی نے ہلاک کر ڈالا اور حملہ آوروں کے ساتھ مل کر عمر شاہ لندو اور توخی خانم کے ساتھیوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ درحقیقت قبیلے کے اندر بھی سرداری کے لئے رسہ کشی پائی جاتی تھی۔ لڑائی شروع ہوئی تو اس رسہ کشی نے بغاوت کی صورت اختیار کر لی اور یوں ملک لندو خاں کو اس کے پرانے ساتھیوں کے ہاتھوں کئے کی سزا مل گئی۔ توخی خانم اور اس کا بیٹا بمشکل جان بچا کر بھاگ سکے۔"

میں حیرانی کے عالم میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ میرے آنے کے بعد پاوندہ بستی میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ توخی خانم کو اپنے جس جیٹھ پر فخر تھا کہ وہ غلام خان کے وارثوں کو ناکوں چنے چبوا دے گا وہ اپنے ہی بھائی بند کے ہاتھوں خاک و خون میں لوٹ گیا تھا اور توخی کو بھاگ کر جان بچانا پڑی تھی۔

میں نے خان رحیمی سے پوچھا "سلیم اب کہاں ہے؟"

خان رحیمی نے بتایا "بقول دینو وہ آزاد علاقے میں ہے اور اسی بستی میں ہے جہاں

تم نے اسے چھوڑا تھا۔ وہ دن رات تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ ڈینو کو بھی اس نے اس تلاش کے سلسلے میں یہاں بھیجا ہے۔ یہ سیکنڈ ٹائم ہے کہ وہ تمہاری کھوج میں آزاد علاقے سے یہاں آیا ہے۔"

میری اور خان رحیمی کی گفتگو جاری تھی کہ ڈینو اجازت لے کر اندر آگیا۔ اس نے خان رحیمی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جناب! وہ میڈم نادرہ کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بس روندی ہی جا رہی ہیں۔ کہیں ان کا دل شل ہی نہ گھٹ جائے۔"

خان رحیمی نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ ثناء.......... دیکھیں کیا ہوا ہے؟" خان رحیمی گھٹنوں پر زور دے کر اٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ رنگ رنگیلا بوڑھا پچھلے چند مہینوں میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہے۔ شاید وہاب چنگیزی کی دشمنی کی دیمک نے اس کی تابندہ مسکراہٹوں کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔

میں اور خان رحیمی اس کمرے میں پہنچے جہاں پر میڈم نادرہ بیٹھی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میڈم نے اپنا سر جھکالیا۔ اس کے چہرے پر پچھتاوے اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خان رحیمی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے میڈم؟"

میڈم بولی "پلیز خان صاحب! میں ثناء سے اکیلے میں دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میڈم کا عندیہ جان کر خان رحیمی نے کمرے میں موجود افراد کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی باہر چلا گیا۔ سب سے آخر میں میں واپس جانے کے لئے مڑی تو میڈم نادرہ نے آگے بڑھ کر میرا پلو تھام لیا۔

"خدا کے لئے بیٹا' مجھ سے یوں منہ نہ پھیرو' میں تمہاری مجرم ہوں جو جی چاہے سزا دے لو مگر بے رخی نہ برتو۔"

میں نے کہا "میڈم' میرے نزدیک ایسی کوئی سزا نہیں جو تمہارے جرم کے شایان شان ہو' میں.......... اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑتی ہوں۔"

میڈم نادرہ بلک اٹھی "نہیں بیٹا! ایسا مت کہو' مجھے بددعا نہ دو۔ زرینہ (عشرت) کی خاطر مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو وہ کبھی صحت یاب نہیں ہوگی۔ اس

کی زندگی کی خاطر میری خطائیں بخش دو۔"

میں نے بہ آہستگی اپنا پلو میڈم نادرہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اس سے زیادہ نرم رویہ میں اختیار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

باہر نکلی تو ڈینو میرا منتظر تھا۔ اس نے اپنی لنگڑی اردو میں مجھے اطلاع دی کہ خان رحیمی کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ بھوک کس کافر کو تھی تاہم خان رحیمی کے خیال سے میں میز پر جا بیٹھی۔

خان رحیمی کے بے حد اصرار کے باوجود میں تین لقموں سے زیادہ نہیں لے سکی۔ خان خود بھی بے رغبتی سے کھا رہا تھا۔ کہنے لگا "کتنی عجیب بات ہے' تمہیں یہاں آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چلے ہیں اور میں ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ تم کہاں سے آرہی ہو۔"

میں نے خان رحیمی کو مختصراً بتایا کہ کس طرح ایک کے بعد ایک واقعہ پیش آیا اور میں انسپکٹر ضامن علی کے ساتھ پارہ چنار کے نواح میں پہنچ گئی۔ پھر مان شاہ پر پراسرار قاتلانہ حملے سے لے کر ضامن علی کی موت تک سارے واقعات میں نے خان رحیمی کو بتا دیئے۔ آخر میں میں نے کہا۔

"بشر گل کے مکان میں پناہ کے دوران ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ضامن علی کی زبان سے جس لڑکی کے اغوا کی بات ہوئی ہے وہ ارسہ ہے۔ ضامن علی کی موت کے فوراً بعد میں بشر گل کے گھر سے نکل آئی اور آج سہ پہر تین بجے کے قریب نواز حسنی صاحب کے آفس پہنچ گئی۔ میں نے انہیں چنگیزی کارندوں اور ارسہ کے بارے میں تمام تفصیلات بہم پہنچائیں لیکن انہوں نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ارسہ تو بخیر و عافیت اپنی پھوپھی کے گھر ملتان میں ہے۔ بعد میں انہوں نے ٹیلی فون پر وہاب چنگیزی کے دست راست رب نواز سے بات کی اور مجھے کمرے سے باہر نکال کر اپنے گن مین کی نگرانی میں دے دیا۔ میں صاف محسوس کر رہی تھی کہ دال میں کالا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے موقع مل گیا اور میں اپنے نگران کو دھوکا دے کر نواز حسنی کے آفس سے نکل آئی.........."

خان رحیمی بڑی محویت سے میری باتیں سنتا رہا۔ رہ رہ کر اس کے ہونٹوں کی سدا بہار مسکراہٹ (جو اب پھیکی پڑی ہوئی تھی) معدوم ہو جاتی تھی۔ اپنی کتھا ختم کر کے میں

سوالیہ نظروں سے خان رحیمی کو دیکھنے لگی۔ وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ سگار سلگا کر اس نے چند گہرے کش لئے اور دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر ٹیک لگاتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

"ڈیئر گرل! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے' حالات وہی ہیں جن کا خدشہ تم نے ظاہر کیا ہے......... یعنی ارسہ ایک بار پھر اغوا ہو چکی ہے۔"

میں سب کچھ جانتی تھی پھر بھی خان رحیمی کے منہ سے یہ بات سن کر دل کو دھچکا لگا۔ خان رحیمی نے نہایت دھیمے لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "حالات بڑے تشویشناک ہیں ڈیئر ثناء' جیسا کہ تم جانتی ہو ارسہ کے ساتھ یہ سانحہ دوسری بار پیش آیا ہے۔ ایسی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں لیکن اگر ایسا ہو جائے تو اسے اغواء ہونے والے کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب نواز حسنی صاحب مجرموں سے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اپنی بیٹی کی "لائف" بچانے کے لئے ان کے پاس ایک اور صرف ایک ہی راستہ تھا وہ اغواہ کنندگان کی ہدایات پر بے چوں چراں عمل کرتے جائیں.......... اور وہ کر رہے ہیں۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ نواز حسنی کے لہجے میں اتنی غیریت کیوں تھی اور انہوں نے مجھ پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کیوں کی۔ درحقیقت وہ پوری طرح مجرموں کے جال میں جکڑے ہوئے تھے اور اپنی معصوم بیٹی کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے خان رحیمی سے کہا "سر! یہ کیسے ہو گیا' جہاں تک مجھے یاد ہے ارسہ کی حفاظت کے لئے دو باڈی گارڈز بھی رکھے گئے تھے۔ وہ گھر سے بھی شاذونادر ہی نکلتی تھی۔"

خان رحیمی نے کہا۔
"بس ہونی ہو کر رہتی ہے' دشمن تاک میں تھا' موقع ملتے ہی وار کر گیا۔ واردات کے بعد سے ایک گارڈ بھی روپوش ہے' خیال ہے کہ وہ مجرموں کے ساتھ مل گیا تھا۔"
میں نے کہا "سر! اس کا مطلب ہے کہ اخبار میں پرندوں کے بارے میں جو خبر چھپی تھی وہ غلط تھی؟"

"کون سی خبر؟"
"یہی کہ پرندے آزاد کر دیئے گئے ہیں۔"
"نہیں وہ نیوز صحیح تھی۔"
"تو پرندے آزاد کر دیئے گئے ہیں؟"
"ہاں' میری انفارمیشن کے مطابق تو ایسا ہی کیا گیا ہے۔ لیکن........." کچھ کہتے کہتے خان رحیمی رک گئے۔ میں سوالیہ نظروں سے خان رحیمی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سگار کا ایک گہرا کش لے کر انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "لیکن ایسا ہوا نہیں' جو کچھ نظر آیا ہے' ضروری نہیں کہ وہ حقیقت ہو۔"
"میں سمجھ نہیں پا رہی سر!"
خان رحیمی نے کہا "تم نے عموماً نیوز پیپرز میں پڑھا ہو گا کہ فلاں جگہ پولیس کی نگرانی میں اتنی مقدار میں منشیات کو آگ لگا دی گئی۔ انہیں تلف کر دیا گیا' وغیرہ وغیرہ۔ ایسی خبریں کبھی درست ہوتی ہیں لیکن کبھی گھپلا بھی ہوتا ہے۔ خانہ پری کے لئے منشیات کی تھوڑی سی مقدار نذر آتش کر دی جاتی ہے اور باقی پھر کالے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ پرندوں کے معاملے میں بھی کوئی ایسی ہی ہیرا پھیری ہوئی ہے۔ جو پرندے چھوڑے گئے ہیں وہ تعداد میں بہت کم تھے اور اصل پرندے بھی نہیں تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ مجرموں نے نواز حسنی کی طرح محکمہ وائلڈ لائف کے کسی اعلیٰ افسر کو بھی اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔"
میں نے تقریباً چونکتے ہوئے کہا "خان صاحب! یہ کیوں ہو رہا ہے' کیوں قانون کے ہاتھ چھوٹے اور مجرموں کے لمبے ہو گئے ہیں؟ کیا آپ ایک قانون پسند شہری نہیں؟ کیا آپ کا فرض نہیں کہ چنگیزیوں کے کرتوتوں کا پردہ فاش کریں؟ کیونکر خاموش ہیں آپ سب؟"

خان رحیمی پر فلسفیانہ موڈ طاری ہو گیا۔ چھت کو گھورتے ہوئے بولا "کبھی کبھی کلمہ حق کہنا اور خودکشی کرنا ایک ہی فعل کے دو نام بن جاتے ہیں' ایسے وقت میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عمل کی بجائے لائحہ عمل کا مرحلہ ہوتا ہے......... ڈیئر گرل تمہارے لئے بھی میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ فی الوقت خاموشی

اختیار کرو۔ وہاب چنگیزی کا ستارہ اس وقت عروج پر ہے لیکن مظلوموں کی آہیں اس عروج کو تادیر برقرار نہیں رہنے دیں گی اور یہی وقت اس کو سزا دینے کا ہوگا۔ تم نے کبھی تلور اور باز کی کشمکش دیکھی ہے؟ تلور بہت پھرتیلا اور ہوشیار پرندہ ہے۔ باز سے بچنے کی بہت کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی جان بچانے کے لئے باز کے اوپر اوپر پرواز کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ بلند پروازی اسے تادیر باز سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ چنگیزی بھی اپنے المناک انجام سے بچنے کے لئے بلندی پر پرواز کر رہا ہے لیکن آخر اسے نیچے آنا ہے۔ مکافات عمل کا باز اسے چیرے پھاڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا "سر! لیکن آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ کبھی کبھی جب تلور اور باز کی کشمکش طویل ہوجاتی ہے تو تلور باز کو اندھا بھی کر دیتا ہے.......... اور پھر سچائی تو سچائی ہوتی ہے سر۔ کیا اسے مؤخر کرنا اس کے منہ پر کالک ملنا نہیں؟"

یکسر خان رحیمی نے اپنا موڈ بدل لیا اور مسکرا کر بولا "اس وقت تم مجھے طویل ٹی وی ڈراموں کی ہیروئن لگ رہی ہو' مشکل مشکل الفاظ استعمال کرنے والی اور بات سے بات نکالنے والی.......... مائی ڈیئر' اپنے ننھے ذہن کو اتنا دکھ نہ دو' ہم جو ہیں یہ سب کچھ سوچنے کے لئے.......... تم بہت کٹھن شب و روز سے گزری ہو۔ بہتر یہ ہے کہ چند ماہ بڑی ہی خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کوٹھی میں گزارو۔ میں تمہارے لئے ایک علیحدہ پورشن مخصوص کر دیتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ تم کہاں ہو.......... اگر کہو تو تمہارے دولہے میاں کو بھی.........."

"بس سر!" میں نے بیزاری سے کہا "مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا' اپنا آپ بھی اچھا نہیں لگ رہا' پلیز.......... آپ ایسی باتیں نہ کریں۔"

خان رحیمی تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ایسے لہجے میں اس سے بات کی ہے۔ میں نے کہا "سر! شاید واقعی مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ بہت تھک گیا ہے میرا ذہن.......... کیا میں سونے کے لئے جا سکتی ہوں؟"

خان رحیمی مسکرایا "- سونے کے لئے یا سوچنے کے لئے؟"

"نہیں سر! سونے کے لئے' بہت سوچ چکی ہوں' اب کیا سوچنا ہے۔"

"کیا اب کوئی خطرناک ارادہ کر لیا ہے؟"

"نہیں۔"

"اگر کوئی ایسا ارادہ ہے تو مجھے بتانا ضرور۔"

میں سر جھکا کر باہر نکل آئی۔

سونے کے لئے میں اسی کمرے میں آکر لیٹ گئی جہاں ایک برس پہلے میں نے کئی ہفتے گزارے تھے۔ اسی کمرے میں یوسف سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ الماری بھی اب تک وہیں تھی جس کے پیچھے یوسف آکر چھپ گیا تھا۔ اسی کمرے کی کھڑکیوں سے میں نے سلیم کو بہکے قدموں سے پہلی دفعہ عشرت کے کمرے کی جانب جاتے دیکھا تھا اور یہی وہ کمرہ تھا جہاں بیٹھ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنی بھابی کی ہم شکل کا راز جاننے کے لئے لاہور جاؤں گی۔ کمرے میں سب کچھ اسی طرح تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا' کھڑکیوں کے پردے برابر کئے اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس الماری کے نیچے پائیوں کے درمیان ایک درز سی تھی۔ میں اس درز میں اپنی ڈائری اس طرح پھنسا دیا کرتی تھی کہ وہ باہر سے نظر نہیں آسکتی تھی۔ اس کوٹھی میں قیام کے دوران میں نے باقاعدگی سے ڈائری لکھنا شروع کی تھی۔ یہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ ڈائری یہیں رہ گئی تھی۔ میں نے الماری کے نیچے تاریکی میں ہاتھ گھمایا۔ مکڑی کے جالوں کے پیچھے ڈائری موجود تھی۔ میں نے اسے نکال لیا۔ ایک کپڑے سے گرد وغیرہ صاف کی۔ مسہری پر بیٹھ کر ورق گردانی کرنے لگی۔ ایک سال پہلے کے واقعات ترتیب وار نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ کچھ باتوں پر شرمندگی ہوئی' کچھ پر رونا آیا اور کچھ بالکل بچکانہ محسوس ہوئیں۔ پرانے کاغذات دیکھنے کے بعد ہمیشہ میرا یہی حال ہوا ہے۔ ڈائری پڑھنے کے بعد میں دیر تک خیالوں میں کھوئی رہی اور پھر سونے کے لئے لیٹ گئی۔ کمرے کی کھڑکی کے پاس کوئی مسلسل منڈلا رہا تھا۔ میں نے پردے کی جھری سے دیکھا وہ دینو تھا۔ شاید کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ چونک گیا۔

"کیا بات ہے دینو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی" اس نے ہنس کر کہا "یونہی ٹہل رہا تھا۔"

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔ غالباً خان رحیمی کو خطرہ تھا کہ میں اسے بتائے بغیر یہاں سے نکل جاؤں گی۔ میرے اردگرد بے اعتباری کی جو فضا پیدا ہو

رہی تھی اس کی ذمہ دار میں خود تھی۔ میرے اندر کی آگ نے مجھے باؤلا کر رکھا تھا اور کبھی کبھی میرا طرز عمل میرے خیر خواہوں کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا تھا۔ اپنی بے بسی کا احساس پھیکی مسکراہٹ بن کر میرے ہونٹوں تک آگیا۔ میں نے دینو سے کہا کہ وہ اندر آجائے۔ وہ تو جیسے پہلے ہی منتظر تھا۔ شڑپ سے کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سینے میں بڑا غبار بھرا ہوا تھا۔

کہنے لگا "بی بی جی! آپ کو معلوم نہیں آپ اپنے مجازی خدا کو کتنا دکھ دیندی پئی ہیں۔ آپ کو فوراً استاد (سلیم) کے پاس پہنچنا چاہئے۔ وہ ادھا رہ گیا ہے آپ کے وچھوڑے میں۔"

میں نے کہا۔ "دینو! مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ وہ اب بھی وہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ قبائلی علاقے میں عداوت مول لینے کے بعد اسے وہاں نہیں رہنا چاہئے تھا۔"

"کیسی عداوت جی؟" دینو نے پوچھا۔

"وہی توخی خانم اور عمر شاہ والا جھگڑا۔"

"بی بی جی! وہ تو ٹنٹا ہی ختم ہو گیا ہے' عمر شاہ مارا گیا' توخی خانم بھاگ گئی' ان کے جو دس پندرہ حمایتی تھے ان کو بھی گھڑچ کر دیا گیا۔ اب قبیلے کا نیا سردار استاد سلیم سے بڑا خوش ہے۔ وہ تو اسے کہتا ہے تم بھی میرے کول آ کر رہنے لگو۔ پر جی استاد سلیم وہ مکان کبھی نہیں چھوڑے گا جس میں آپ اور وہ رہتے تھے۔"

میں نے کہا۔

"وہ مکان تو........ جل گیا تھا۔"

جل تو گیا تھا جی' لیکن استاد سلیم نے سارا مکان پھر کھڑا کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح' ہر شے بالکل ٹھیک ٹھاک بنادی ہے۔ اب تو کوئی کہہ نہیں سکدا کہ اس مکان کو کچھ ہوا تھا۔ فرنیچر' ٹی وی' فریج .... ہر چیز استاد نے پھر خریدی ہے اور وہاں سجائی ہے۔"

دینو دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا' وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے سمجھا رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد سلیم کے پاس پہنچ جانا چاہئے کیونکہ میری گمشدگی کی ہر گھڑی اس پر قیامت کی طرح گزر رہی ہے۔ سلیم کی باتیں کرتے کرتے اس کی اپنی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ میں خاموشی سے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ آنکھیں تو بہت دیر ہوئی بنجر ہو چکی تھیں۔ سینہ

بھی لق و دق صحرا محسوس ہوتا تھا۔ اس سینے میں دل کی جگہ آگ کا ایک گولہ تھا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ یہ گولہ اپنے حجم اور اپنی شدت میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اس آگ کی لپیٹوں سے ایک ہی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ "ثناء! بہت دیر ہو چکی تیرے فرحان کا وحشی قاتل کب تک زندہ رہے گا؟" میں دینو کی باتیں سن رہی تھی لیکن صرف سننے کی حد تک۔ میرا ذہن اس کی باتوں کے معانی سے کوسوں دور تھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے دینو کسی اجنبی زبان میں بول رہا ہے۔ جلد ہی دینو نے میری عدم توجہی کو محسوس کر لیا۔ کہنے لگا۔

"بی بی جی' کی گل ہے' آپ کچھ زیادہ ہی پریشان لگدے ہیں؟" میں نے گہری سانس لی اور اداس سے لہجے میں کہا۔

"دینو! میری تو عقل خبط ہو گئی ہے تم ہی بتاؤ کیا کروں........ کس کے پاس فریاد لے کر جاؤں' کس سے انصاف مانگوں؟ یوں لگتا ہے ایک ایک کر کے وہاب نے سب سہارے مجھ سے چھین لئے ہیں۔ کوئی دروازہ میرے لئے کھلا نہیں چھوڑا........ اب خان رحیمی بھی مجھے خاموش رہنے کے مشورے دے رہا ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کیسے چپ رہوں۔ میں چنگیزی کے سارے ظلم بھلا سکتی ہوں۔ لیکن ایک ماں کیسے چپ رہ سکتی ہے۔ وہ کیسے بھول سکتی ہے کہ اس کے شیر خوار کو اس کی گود سے چھین کر اور رلا رلا کر مارا گیا تھا۔ بتاؤ........ کیا بھول سکتی ہے ایک ماں؟"

دینو نے پریشانی سے سر جھکا لیا' میری جلتی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں' وہ دبے دبے لہجے میں بولا "بی بی جی' کیوں نہ پولیس کے کسی بہت بڑے افسر کو خط لکھا جائے اور اس کو ساری گل کھول کر بتائی جائے' ثبوت بھی دتے جائیں' ہو سکدا ہے........"

"کچھ نہیں ہو سکتا دینو۔"

میں نے بیزاری سے کہا "ایسے خط بہت لکھے جاتے ہیں تم جس بڑے افسر کی بات کر رہے ہو' ہو سکتا ہے وہ اپنی ملازمت پکی رکھنے کے لئے اس وقت وہاب چنگیزی کے گھر بیٹھا اس کی چاپلوسی کر رہا ہو۔"

دینو کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ میری الجھنوں کا کیا حل بتائے۔ کہنے لگا "بی بی جی' میں تو چھوٹی عقل کا بندہ ہوں۔ کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ میرا ایک ہی مشورہ ہے۔

آپ استاد سلیم کے پاس چلی جائیں۔ وہ آپ کے دکھ کو اپنے سے وکھرا نہیں سمجھدا' وہ کوئی نہ کوئی حل ضرور کڈ لے گا۔"

میں مسکرا دی "دینو! تیرے استاد سلیم کے پاس بھی میری طرح ایک نقد جان کے سوا اور کچھ نہیں' وہ یہی کرے گا کہ اس جان کو داؤ پر لگا کر میرے سر ایک اور قرض چڑھا جائے گا۔ قرضوں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے میرے سر پر کہ گردن ٹوٹ رہی ہے۔ پٹھے کھنچ گئے ہیں۔ یہ بوجھ اسی طرح رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گی یا خود کشی کر لوں گی........"

دینو سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ جیسے میرے انجام سے خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اسے سوجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اپنے دل کی بات کس طرح میرے دل میں ڈالے اور اس کے دل کی بات یہ تھی کہ وہ مجھے سلیم کے پاس پہنچانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد دینو باہر چلا گیا تو میں ڈائری تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ اب دینو اور خان رحیمی جلد از جلد سلیم کو میرے بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کریں گے اور وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھ سے ملنے یہاں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد میرے پاؤں میں ایک بار پھر وہی زنجیر پڑ جائے گی جس نے ازدواجی رشتے کے نام پر چھ ماہ مجھے سلیم کے گھر میں پابند رکھا تھا........ سلیم کے یہاں پہنچنے سے پہلے مجھے پھر گم ہو جانا چاہئے تھا۔ میں نے اپنے لباس میں چھپے ہوئے تیز دھار آلے کو چھوا۔ وہ اب جیسے میرے جسم کا حصہ بن چکا تھا۔ میں نے سوچا کیا میں اس آلے کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھنے کا مقصد پورا کر سکتی ہوں۔ کیا میری ایک دیوانہ وار کوشش مجھے تمام رکاوٹیں عبور کرا کے وہاب چنگیزی تک پہنچا سکتی ہے! دل کا جواب تھا "ہاں" ذہن کا جواب تھا "نہیں" اس ہاں اور نہیں کے درمیان بہت سی سوچیں تھیں' بے حد و شمار اور عجیب و غریب خیال تھے۔

جب سپیدہ سحر نمودار ہوا اور دور سندری گاؤں کی کسی مسجد سے "الصلوۃ خیر من النوم" کی صدا بلند ہوئی تو میں بستر سے اٹھ بیٹھی۔ وضو کر کے نماز ادا کی۔ یہ بہت طویل نماز تھی۔ شاید میں دو ڈھائی گھنٹے تک مصلے پر رہی۔ مصلے سے اٹھی تو دل کا بوجھ کچھ ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ شبنم آلود درختوں کو چھو کر آنے والی ہوا میری جلتی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کہاں سے آنٹی صادقہ کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ کتنا آسودہ اور مہربان چہرہ تھا وہ' یہ وہی آسودگی تھی جو

کسی نیک مقصد کے لئے زندگی قربان کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں وہی بات مان لوں جو آنٹی صادقہ نے کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر خود کو قانون کے حوالے کر دوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اور جو کچھ وہاب نے کیا ہے سب کچھ کھول کر بیان کر دوں۔ اس کے بعد سب کچھ بھول جاؤں اور یقین کر لوں کہ سچائی کبھی چھپ نہیں سکتی۔ وہ اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ جواب میں میں نے کہا تھا' آنٹی صادقہ' اس دور میں سچائی ناکام بھی ہوتی ہے' رسوا بھی ہوتی ہے اور اسے بناوٹ کے اصولوں سے چھپایا بھی جاتا ہے........"

آنٹی صادقہ نے صحیح کہا تھا یا میں نے؟ کس نے صحیح کہا تھا؟ میں سر تھام کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔ کس نے صحیح کہا تھا' کس نے غلط کہا تھا؟

دل کی گہرائیوں سے آواز آئی' تم نے صحیح کہا تھا' کیونکہ تم ایک ماں ہو اور ماں کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا "ہاں میں نے صحیح کہا تھا۔" میں نے ہم کلامی کے انداز میں کہا "صداقت کی فتح دیکھنے کے لئے عمر خضر چاہئے' دنیا بہت عیار ہو چکی ہے۔ سچائی کو زیر کرنے کے ہزار طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ سچائی کو بیچ چوراہے کے لٹا کر ذبح نہ بھی کیا جا سکے تو اسے زندہ درگور ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سر پر جبر کی آہنی ٹوپی پہنا کر اس کو محدود اور مجبور کر کے سامان عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ "میرے سینے کے اندر آگ کا گھومتا ہوا اور پھنکارتا ہوا گولہ نیلگوں ہونے لگا........ فرحان کی چیخیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ کوئی آواز پکار پکار کر کہنے لگی "ثناء! قانون تجھے کیا دے سکتا ہے' کیا تم نے اور تمہارے خیر خواہوں نے قانون کے تقاضے پورے نہیں کئے تھے' وہاب کی سیاہ کاریوں کے کھلے ثبوت فراہم نہیں کئے تھے پھر بھی وہ بچ نکلا۔ وہ مکار شخص ہر بار بچ نکلے گا۔ ہر بار تمہاری ممتا ناکام ہو گی........" یہی وہ لمحے تھے جب میں نے فیصلہ کیا کہ میں چنگیزی تک پہنچنے کی ایک اور کوشش کروں گی۔

خان رحیمی کی منشاء کے بغیر کسی مہمان کا اس ڈیرے سے نکل جانا آسان نہیں تھا' لیکن میں ایسا کر سکتی تھی' مجھے یہاں کے معمولات کا علم تھا اور پتہ تھا کہ نگران آنکھوں کو کیسے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ ابھی اندھیرے پر اجالے کو غلبہ نہیں ہوا تھا کہ میں کمرے سے

نکلی اور خاموشی کے ساتھ اس ٹرک کے پچھلے حصے میں جا بیٹھی جو علی الصبح دودھ لے کر جھنگ شہر جاتا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچی تھی۔ ٹرک میں دودھ کے برتن رکھے جا چکے تھے اور وہ جانے کے لئے تیار تھا۔ مجھے دودھ کے برتنوں کے درمیان بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ٹرک اپنی جگہ سے حرکت میں آگیا' سڑک کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ جھنگ پہنچتے پہنچتے ہمیں قریباً ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ اب دن چڑھ آیا تھا اور سڑکوں پر آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ گو ابھی اتنا رش نہیں ہوا تھا' ٹرک ایک ٹریفک سگنل پر رکا تو میں بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ میرا سب سے بڑا سہارا چادر تھی جو میں نے اس طرح سر پر لے رکھی تھی کہ چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔

جھنگ سے میں ایک دوسری بس میں بیٹھی اور بڑی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ بس نے ایک گھنٹے کے سفر کے بعد مجھے اس موڑ پر اتار دیا جہاں سے ایک نیم پختہ راستہ میرے سابقہ سسرال کی طرف جاتا تھا۔ میں یہاں سے تانگے پر بیٹھ سکتی تھی لیکن پیدل ہی روانہ ہو گئی۔ چاروں طرف گندم کا سونا بکھرا تھا۔ کہیں کہیں اگیتی کاشت والی فصل کٹنا شروع ہو گئی تھی۔ میں کبھی پگڈنڈیوں پر اور کبھی کھیتوں میں چلتی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ شہر میں کوئی عورت اس طرح اکیلی جا رہی ہو تو سینکڑوں تفتیشی نگاہیں اس کی جانب اٹھتی ہیں لیکن دیہات میں بات اور ہوتی ہے......... بڑی حویلی کے مضافات میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ یہاں ترقیاتی کام تیزی سے ہو رہے ہیں۔ جگہ جگہ پکے کھال بن رہے تھے۔ سڑکوں کے لئے مٹی ڈالی جا رہی تھی اور بجلی کے کھمبے لگ رہے تھے۔ ایک جگہ میں نے ایک بڑا سا بورڈ لگا دیکھا' جس پر لکھا تھا "تعمیر سڑک جات' زیر سرپرستی جناب عزت ماب وہاب علی چنگیزی۔"

اس کا مطلب تھا یہ سب کچھ وہاب علی کروا رہا ہے۔ وہ الیکشن ہار گیا تھا تو کیا' سادہ لوح لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لئے اس کے پاس بہت کالا دھن تھا.........

بڑی حویلی ابھی مجھ سے چار پانچ میل دور تھی۔ جوں جوں یہ فاصلہ کم ہو رہا تھا دل کی دھڑکنوں میں شدت آ رہی تھی۔ جونہی میں ایک کھیت سے نکل کر ایک کچے راستے پر آئی سامنے سے رنگین پگڑیوں والے چند لاٹھی بردار آتے دکھائی دیئے۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ وہاب چنگیزی کے پالتو غنڈے ہیں۔ میں تیزی سے چند قدم

چل کر راستے سے ہٹ گئی۔ قرب و جوار میں چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ ایک طرف سیوریج میں استعمال ہونے والے سیمنٹ کے پائپوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا تھا۔ میں اس ڈھیر کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ اردگرد کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ مٹی اور ریت کی دو بڑی بڑی ڈھیریوں کے درمیان ایک خیمہ لگا تھا۔ مجھے پائپوں کی اوٹ میں پناہ لئے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے عین پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تین چار فٹ کے فاصلے پر موٹی توند والا ایک سیاہ رنگ شخص کھڑا تھا۔ وہ شلوار قمیض میں تھا۔ سر پر گلابی رنگ کا تولیہ ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ شخص سڑک کا ٹھیکیدار تھا۔ اس کے ساتھ ایک بابو نما شخص تھا۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ پاؤں سے لنگڑا تھا' ٹھیکیدار نے آگے بڑھ کر بے باکی سے میری گردن پکڑ لی۔

"کیا کر رہی ہے یہاں......... چوری کرنے آئی ہے؟"

لنگڑا بولا۔ "شکل سے تو چور نہیں لگتی' شاید کسی سے چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

ٹھیکیدار نے کہا "چور کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا' میں اچھی طرح جانتا ہوں ایسی عورتوں کو۔"

اس نے مجھے کلائی سے تھاما اور کھینچتا ہوا اپنے خیمے کی طرف لے چلا۔ میں بلند آواز میں احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی کہ رنگ دار پگڑیوں والے آس پاس ہی تھے۔ میری خاموشی اور کمزور مزاحمت نے اسے زیادہ دلیر کر دیا اور وہ گھسیٹ کر مجھے خیمے میں لے گیا۔

لنگڑے نے خیمے کے پردے کو اندر سے ڈوری باندھ دی اور ٹھیکیدار نے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر اپنا چہرہ میرے نزدیک کیا اور غرا کر بولا "ہاں بول کس نیت سے آئی تھی یہاں۔" اس کی آنکھوں میں ہوسناک سی چمک تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی لنگڑا بولا "ٹھہرو......... ٹھہرو میاں صاحب ٹھہرو......... مجھے شک ہو رہا ہے۔"

"کیا شک؟"

ٹھیکیدار کی گرفت میرے بالوں پر ڈھیلی ہو گئی۔

"کہیں یہ وہی تو نہیں......... میرا مطلب ہے بڑی حویلی والی......... جس کا نام اخباروں میں آ رہا ہے.........؟"

یکایک ٹھیکیدار کی آنکھوں میں تیز چمک نظر آئی' اس نے سرتاپا مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور بولا "یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

لنگڑے نے کہا "ہو نہیں سکتا جی......... ہے۔ میں نے ایک دفعہ اخبار میں تصویر بھی دیکھی تھی' مجھے تو اسی کی لگتی تھی۔ بڑی خطرناک عورت ہے جی۔ اس کی تلاشی لینی چاہئے فوراً۔"

اس کے ساتھ لنگڑے نے لپک کر عقب سے میرے دونوں بازو دبوچ لئے۔ ٹھیکیدار میری طرف بڑھا لیکن پھر ارادہ بدل کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ خیمے سے کچھ دور جا کر اس نے کسی کو "اوئے کاکا......... اوئے کاکا" کہہ کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چھ سات سالہ لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر پہلے گندم کے کھیت میں داخل ہوتے وقت میں نے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ وہ ایک جوہڑ کے کنارے گھاس پر بیٹھا تھا اور اس کے گرد چار پانچ گدھے چر رہے تھے۔ اب اس لڑکے کو میری تلاشی کے لئے یہاں بلایا گیا تھا۔ غالباً میرا "احترام" سابقہ جاگیردارنی ہونے کی وجہ سے کیا جا رہا تھا۔ ٹھیکیدار کی ہدایات کے مطابق لڑکے نے میری تلاشی لی اور لباس کے اندر سے وہ تیز دھار آلہ برآمد کر لیا جو میرے پاس وہاب چنگیزی کی امانت تھا۔ اس آلے کو دیکھتے ہی ٹھیکیدار امام دین اور لنگڑا رزاق معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹیں تھیں۔ بچہ واپس چلا گیا تو ٹھیکیدار زہرخند لہجے میں بولا۔

"بڑی رستم کی بیٹی بنتی ہے' لباس میں استرے چھپا چھپا کر پھرتی ہے' چنگیزی صاحب کو مارنا چاہتی ہے؟"

میں خاموش رہی' گم صم اور بے حس و حرکت۔ لنگڑا بولا "میاں صاحب' میرا خیال ہے فوراً نواز صاحب کو اطلاع دینی چاہئے وہ فوراً شناخت کر لیں گے۔"

ٹھیکیدار نے کہا "جاؤ یہیں بلا کر لے آؤ۔"

لنگڑا ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا باہر نکل گیا۔ لنگڑے نے مجھے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن میں کئی بار دیکھ چکی تھی۔ یہ بدبخت اس سے پہلے چودھری شباب کا کارندہ تھا۔

منشی کا کام کرتا تھا اور اس کے علاوہ الیکشن کے لئے بڑے دھواں دھار قسم کے پوسٹر لکھتا تھا۔ مثلاً "یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی" "باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم" "جیت ہماری ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ قابل فروخت گھوڑا وہاب چنگیزی کے تھان پر بندھا ہوا تھا۔ دولت کی جھلک دیکھ کر وفاداریاں بدلنے والے ایسے ابن الوقت لوگوں کی ہمارے معاشرے میں کوئی کمی نہیں۔ اس سے پہلے ایک ایسے ہی غدار کے فریب میں آ کر میں ایک غلط گاڑی میں سوار ہو گئی تھی اور نتیجے میں مجھے بازار حسن کی دیواروں کا اسیر ہونا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا وہاب چنگیزی دولت پانی کی طرح بہا رہا ہے اور اس دولت کی طاقت سے وہ سب دوستوں دشمنوں کی وفاداریاں خریدتا چلا جا رہا ہے......... وہ تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا تھا لیکن وہ کتنا بھی مقبول اور ہر دلعزیز ہو جاتا' اس کی اڑان کتنی بھی اونچی ہو جاتی' میں جانتی تھی وہ کیا ہے' اور اس کا شمار کس درجے کے انسانوں میں ہونا چاہئے۔

ٹھیکیدار اب کافی مطمئن نظر آتا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ میرے ساتھ فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت اور تضحیک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پھنکار کر بولا۔

"تو ہے کیا چیز جو چنگیزی صاحب سے ٹکر لینے نکل کھڑی ہوئی ہے! کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو! میری طرف دیکھ۔ میں چنگیزی صاحب کے نوکروں کا نوکر ہوں۔ میں ایک آواز دوں تو دو درجن آدمی میری خاطر لڑنے مرنے کے لئے یہاں آ سکتے ہیں۔ اسلحے کی چھاؤں کر سکتے ہیں میرے اوپر......... تیرے ساتھ کون ہے؟ میرا تو خیال ہے پھانسی کے بعد تیری لاش لینے بھی کوئی نہیں آئے گا........."

ٹھیکیدار کا خیال تھا کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دوں گی' وہ جلتی ہوئی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری خاموشی نہیں ٹوٹی تو وہ ایک بار پھر زہریلے انداز میں مسکرانے لگا۔ استرے کو ہاتھوں میں الٹ پلٹ کرتا ہوا بولا۔

"استرے لئے پھرتی ہے' آفت کی پرکالی بنتی ہے' بڑا زور ہے تیری بانہوں میں؟ بڑی پھرتیلی ہے تو؟ یہ لے......... یہ پڑا ہے استرا چلا میرے اوپر......... میں دیکھوں کتنی جیالی ہے۔"

اس نے استرا میرے پاؤں کے سامنے پھینک دیا۔ جتنا فاصلہ استرے سے میرا تھا اتنا ہی اس کا تھا۔ دیکھنے میں ٹھیکیدار فربہ اندام تھا لیکن وہ کاہل الوجود نہیں تھا۔ اس کا اعتماد گواہی دے رہا تھا کہ وہ میرے نیچے جھکنے سے پہلے استرے کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے۔ میری نگاہیں استرے پر تھیں اور ٹھیکیدار بھی اسی نقطے پر دیکھ رہا تھا۔ میں بالکل بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ آخر میں نے ہمت کی اور ایک دم استرے پر جھپٹی۔ ٹھیکیدار نے کرسی پر آگے کو کھسک کر ٹانگ گھمائی اور استرا میرے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی دور جا گرا۔ ٹھیکیدار کا بھرپور تھپڑ میرے گال پر پڑا اور میں اچھل کر خیمے کے دروازے کے پاس گری۔ اس سنگدل نے ایک زور دار ٹھوکر میری پسلیوں پر ماری۔ یہاں پہلے بھی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ شاید وہ خبیث مجھے اور بھی پیٹتا لیکن اسی وقت خیمے کا پردہ اٹھا اور لنگڑے رزاق کی صورت نظر آئی۔ اس کے پیچھے کوئی اور شخص بھی تھا۔ میں ہونٹوں سے خون پونچھتی اور کراہتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک پہلو مٹی میں لتھڑ گیا تھا۔ حالت اتنی دگرگوں تھی کہ خود مجھے بھی اپنے اوپر ترس آ رہا تھا۔ لنگڑے رزاق کے پیچھے جو شخص داخل ہوا اس کی صورت دیکھ کر میں چونک گئی.......... وہ رب نواز تھا۔ وہاب چنگیزی کا ملازم خاص۔ یہی شخص تھا جس نے کم از کم دو مرتبہ مجھے نہایت سنگین صورت حال سے بچایا تھا۔ ایک دفعہ اس نے عابد کی موت کے بعد مجھے سرکنڈوں میں دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا اور دوسری دفعہ مجھے پہچاننے کے باوجود میرے لئے باغ والے ڈیرے میں گھسنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ڈیرے میں لڑائی شروع ہونے کے بعد جس شخص نے میری طرف بھرا ہوا پستول پھینکا تھا وہ بھی رب نواز ہی تھا۔ آج ایک بار پھر میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے پہچانتے ہی اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ٹھیکیدار امام دین نے لنگڑے رزاق کو دیکھتے ہی اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اب وہ خیمے کے وسط میں کھڑا کبھی مجھے اور کبھی رب نواز کو دیکھ رہا تھا۔ رب نواز کو دیکھ کر وہ کچھ مودب سا ہو گیا تھا۔ خوشامدی لہجے میں کہنے لگا۔

"نواز صاحب! پہچانو جی اس عورت کو' کون ہے یہ؟"

رب نواز کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ اسے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پانے میں بلا کی مہارت حاصل تھی۔ کچھ دیر میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔

"کون ہے؟"

ٹھیکیدار اور رزاق کے چہرے بجھ سے گئے' رزاق نے آگے بڑھ کر کہا "نواز صاحب' ذرا غور سے دیکھیں' مجھے شک پڑ رہا تھا.........."

"نہیں.......... نہیں' وہ نہیں ہے یہ" رب نواز نے بیزاری سے لنگڑے رزاق کی بات کاٹی "کہاں سے پکڑا ہے اسے؟"

ٹھیکیدار نے کہا "یہ ان سامنے والے پاپوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑوں سے وہ استرا بھی نکلا ہے۔"

"خود کیا کہتی ہے؟"

"خود تو بولی ہی نہیں جی"

"کیا بات ہے گونگی ہو؟" رب نواز نے کڑک کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے گونگے پن میں ہی عافیت جانی۔ رب نواز نے کہا "مجھے تو کوئی سڑی لگتی ہے.......... دفع کرو اس کو' پتہ نہیں کون ہے۔ شاید بابے مستان کے مزار سے آئی ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بابے مستان کے مزار سے آئی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا "جوان جہان ہو' ایسے گھومو گی تو اچھا نہیں ہو گا' دنیا پاگلوں سے بھری ہوئی ہے اور کوئی پاگل دوسرے پاگل کو رعایت نہیں دیتا۔ جاؤ شاواش.........." اس نے مجھے دھکیل کر خیمے کے در سے باہر نکال دیا۔

میں خیمے سے نکلی' درد سے کراہتی ہوئی درختوں کی طرف چل دی۔ اٹھنے والے ہر قدم کے ساتھ پسلیوں میں درد کا خنجر اتر جاتا تھا۔ بد بخت نے بڑی بے دردی سے ٹھوکر ماری تھی۔ درد کا تقاضا تھا کہ رک جاؤں' لیکن رکنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس جگہ سے جتنی دور چلی جاتی بہتر تھا۔ کوئی چار فرلانگ آگے آ کر میری ہمت جواب دے گئی اور میں ایک کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔ خیمے میں میرے تیز دھار ہتھیار اور میری نقدی کے ساتھ ساتھ جوتی بھی چھن گئی تھی۔ میں ننگے پاؤں یہاں تک آئی تھی۔ تلوؤں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے شاخوں سے جھانکتے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ خشک لبوں پر فریاد مچل گئی۔ "اے مالک' ایک ماں سے اور کتنا امتحان مقصود ہے تجھے؟ ۔رے سینے میں آگ جل

رہی ہے میرے مالک.......... مجھے موت دے یا اس آتشیں گولے کو سینے سے نکال دے جس نے مجھ پر ہر گھڑی قیامت کر رکھی ہے.......... میں درد کے اس سمندر میں تنہا رہ گئی ہوں مالک' تو میری مدد کر.........."

خشک ویران آنکھوں میں انگارے سے دھرے گئے۔ میں نے گھٹنوں میں سر دیا اور درد کی لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اچانک کسی نے نہایت نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا خان رحیمی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے تاسف اور ہمدردی کے جذبات تھے۔ اس کے پیچھے دینو کھڑا رو رہا تھا۔ خان رحیمی نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور آہستگی سے بولا۔

"دیکھ لیا نا اپنی جلد بازی کا نقصان' جو لوگ اپنے بزرگوں کی باتوں کو رد کرتے ہیں ان کو ایسے ہی حادثات سے دو چار ہونا پڑتا ہے.........." میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ خان رحیمی نے عجیب مشفق انداز میں اپنے بازو سے میری پشت کو سہارا دیا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا درختوں کی طرف بڑھا۔ وہاں اس کی ٹویوٹا جیپ کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیپ کو درختوں میں چھپا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ خان رحیمی کے سہارے میں جیپ میں چڑھی تو پتہ چلا کہ پچھلی نشستوں پر چھ مسلح افراد دم سادھے بیٹھے ہیں۔ یہ وہاب چنگیزی کا علاقہ تھا اور خان رحیمی کا یہاں چلا آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میرے بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ ہوئی اور کچے پکے راستے پر آگے بڑھنے لگی۔

جس وقت میں خان رحیمی کی کوٹھی میں داخل ہوئی شام کے چھ بج چکے تھے۔ راستے میں خان رحیمی نے مجھے ایک میڈیکل اسٹور سے درد کی دوا لے دی تھی۔ دو گولیاں کھا کر میری پسلیوں کو کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ غالباً اس دوا میں ایک خواب آور گولی بھی شامل تھی۔ میرا سر شدت سے چکرا رہا تھا۔ میں سو جانا چاہتی تھی۔ میرا ارادہ بھانپتے ہوئے خان رحیمی مجھے سیدھا میرے کمرے میں لے گیا۔ اندر گھستے ہی میں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ خان رحیمی نے پنکھا چلا دیا اور مدہم روشنی کا بلب جلا کر کمرے سے نکل گیا۔ جلد ہی میں نیند کی آغوش میں چلی گئی.......... میں نے ایک خواب دیکھا' کسی کی نرم انگلیاں میرے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ یہ سلیم تھا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھا تھا اور اس

کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس نے میرا سر اٹھا کر بڑی محبت سے اپنے زانو پر رکھ لیا۔ "یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ثناء!" کہیں دور اس کی آواز آئی "جانتی ہو' میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا ہوں۔"

"مجھے مت ڈھونڈا کرو سلیم' جس تلاش کا حاصل تلاش ہو' اسے ختم کر دینا چاہئے۔" وہ کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح نظر آنے لگا۔ ناراض لہجے میں بولا۔

"ایسی باتیں کر کے مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہو' کیا یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنا راستہ الگ کر لوں!"

میں نے بے قراری سے اس کا ہاتھ تھام لیا "نہیں سلیم' میرے بس میں ہو تو اس کائنات کی آخری حد تک تمہارا ہاتھ تھام کر چلوں' مگر یہی میری قسمت میں نہیں' لگتا ہے بہت جلد میری مسافت ختم ہو جائے گی اور تم اس راستے میں تنہا رہ جاؤ گے' میں تمہیں اس تنہائی کے لئے تیار کرنا چاہتی ہوں.......... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے جبڑے بھینچ لئے۔ اس کی سرخ آنکھ سے جدا ہونے والا ایک آنسو خود رو داڑھی میں رینگتا ہوا میرے رخسار پر گرا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہی جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ سلیم سچ مچ میرے سرہانے بیٹھا ہے اور اس کی انگلیاں میرے بالوں میں رینگ رہی ہیں۔ یہ احساس اس قدر سنسنی خیز تھا کہ لمحوں میں نشہ آور دوا کا اثر جاتا رہا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سلیم.......... سلیم یہ تم ہو!" میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور خان رحیمی اندر آ گیا۔ میں نے اپنے لرزاں ہاتھ سلیم کے شانوں سے ہٹا لئے۔ ہم دونوں کے تاثرات دیکھ کر خان رحیمی نے اپنی تمام تر توجہ نیا سگار سلگانے پر مرکوز کر دی اور اعلان کرنے والے لہجے میں بولا۔

"آپ دونوں کے لئے ایک نہایت اہم نیوز ہے۔"

میں اور سلیم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ خان رحیمی نے کہا

"چودھری شہاب اور اس کا چچا حکم دین تم سے ملنے آئے ہیں۔"

چودھری شہاب کا نام سن کر میں چونکی۔ ایک عرصہ ہوا اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ چودھری شہاب کے ساتھ اس کا چچا حکم دین بھی تھا۔ حکم دین نے کچھ ہی عرصہ پہلے

وہاب چنگیزی کے خلاف الیکشن جیتا تھا۔ وہ اب علاقے کا منتخب نمائندہ تھا چوہدری شہاب کے ساتھ حکم دین کا یہاں آنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا۔

سلیم نے پوچھا "وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

خان رحیمی بولا "یہ تو تمہیں وہی بتا سکتے ہیں۔"

سلیم سوچ میں پڑ گیا۔ خان رحیمی نے کہا "میں ان کے پاس بیٹھتا ہوں تم جلدی آجاؤ۔"

خان رحیمی باہر نکل گیا تو سلیم عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت سوال مچل رہے تھے۔ سوال تو میرے پاس بھی بہت تھے لیکن یہ وقت سوال جواب کا نہیں تھا۔ میں صرف اتنا کہہ سکی۔

"سلیم! تم کب آئے ہو؟"

وہ بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ تم نیند میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ تمہیں جگانے کے لئے میں تمہارے سرہانے بیٹھ گیا۔"

سلیم کے دائیں ہاتھ پر چند دن پرانا زخم تھا۔ غالباً یہ زخم پاوندہ قبیلے سے ہونے والی لڑائی کی نشانی تھا۔ میں اس زخم کے بارے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ باہر سے دینو پکار کر بولا۔

"استاد جی! اب آ بھی جاؤ۔ خان صاحب واج تے واج ماری جاندے نیں۔"

میں نے کہا "سلیم! تم چلے جاؤ۔"

وہ بولا "انہوں نے ہم دونوں کو بلایا ہے۔"

سلیم کے اصرار پر میں اپنی جگہ سے اٹھی تو دائیں پہلو سے زبردست ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ تاہم اپنی یہ تکلیف میں نے سلیم پر ظاہر نہیں ہونے دی اور چادر اوڑھ کر سلیم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ چودھری شہاب اور چودھری حکم دین اپنے میزبان خان رحیمی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ چودھری شہاب نے اٹھ کر سلیم سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں کو شادی کی مبارکباد دی۔ چودھری حکم دین نے بھی سلیم سے ہاتھ ملایا۔ چودھری شہاب کی نگاہیں ایک ساعت کے لئے میری نگاہوں سے ٹکرائیں اور پھر جھک گئیں۔ اس کے بعد جتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہم سے خفا تھا۔ اس کے دل میں میرے اور سلیم کے لئے بے پناہ ہمدردی تھی اور

یہ ہمدردی ہی تھی جو اسے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی۔

چودہری حکم دین نے پدرانہ شفقت سے کہا "بیٹی! میں جانتا ہوں تم اس وقت کیسے حالات سے گزر رہی ہو۔ تیرا دکھ ہم سے چھپا ہوا نہیں۔ تیرا مجرم بھی ہمارے سامنے ہے اور یہی زیادہ تکلیف کی بات ہے کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن یہ مجبوری وقتی ہے۔ بیری کا درخت زیادہ دیر ہرا نہیں رہتا۔ بڑی جلدی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اس وقت جو بات کہنے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ چنگیزی کی طرف سے تم دونوں کو خطرہ ہے۔ تلاش تو وہ تمہیں پہلے بھی کر رہا تھا لیکن اب اس نے زیادہ سرگرمی دکھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پرسوں ڈی سی کے آفس میں علاقے کے انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کا ایک اجلاس ہوا ہے۔ مجھے اپنے ذریعے سے پتہ چلا ہے کہ اس میٹنگ کا سب سے اہم مقصد تم دونوں کی گرفتاری کے لئے منصوبہ بندی کرنا تھا۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو گے؟"

سلیم نے اثبات میں سرہلا دیا۔ چوہدری حکم دین نے حقہ گڑگڑا کر کہا۔

"پرسوں ہفتہ ہے۔ تمہاری گرفتاری کے لئے یہ نئی مہم پرسوں سے شروع ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلد سے جلد یہ علاقہ چھوڑ دو۔ خان رحیمی صاحب مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکے ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس وقت تمہارے لئے آزاد علاقے میں چلے جانا بہتر ہے۔ لیکن یہ مت سمجھ لینا وہاں تم بالکل محفوظ ہو جاؤ گے۔ چنگیزی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کے مخبر بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ وہ دور تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہ ایک ضمنی الیکشن لڑ کر اسمبلی میں بھی پہنچ رہا ہے۔ یوں اس کا اثر و رسوخ مزید بڑھ جائے گا.......... دیکھو سلیم پتر' تم ہمارے گروپ کے آدمی ہو۔ تمہارا بھلا سوچنا میرا فرض ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ تم دونوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ ایک دو سال کے لئے ملک سے باہر چلے جاؤ۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں باہر بھیجنے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ فرضی ناموں سے تمہارے پاسپورٹ بن جائیں گے۔ نواز حسنی صاحب اپنے ہی آدمی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری بہت مدد کر سکتے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں پاکستان چھوڑنے میں کوئی دشواری پیش آئے گی.......... کیا خیال ہے تمہارا؟"

سلیم گہری سوچ میں تھا۔ میں نے خان رحیمی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی حکم دین کی رائے کو درست سمجھتا ہے۔ سلیم نے کہا۔

"چاچا جی! آپ ہمارے بڑے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارا برا نہیں سوچیں گے لیکن..........؟"

حکم دین نے کہا۔ "پتر جی.......... میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ یہ مت خیال کرو کہ تم بزدلی دکھا کر بھاگ رہے ہو۔ یہ تو بس ایک چال ہے۔ ابھی ہماری لڑائی جاری ہے۔ لڑائی لڑتے ہوئے کبھی سپاہی کو پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ کبھی سرنگ میں بھی چھپنا ہوتا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ پیچھے ہٹنے والا یا سرنگ میں چھپنے والا سپاہی بزدل ہے۔"

خان رحیمی نے کہا "حکم دین صاحب درست کہہ رہے ہیں۔ سلیم تم لوگ ایک دو سال ملک سے باہر گزار آؤ۔ آئی ایم شوئر۔ اتنے عرصے میں چنگیزیوں کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ جونہی حالات بہتر ہوئے ہم تمہیں واپس بلا لیں گے۔"

سلیم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً میرے چہرے پر اسے کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ اس نے نیم رضامندی کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے چاچا جی۔ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔"

حکم دین نے کہا "ضرور سوچو پتر جی.......... پر صبح تک فیصلہ کر لو۔ اچھا سپاہی وہی ہوتا ہے جو دشمن کے وار سے پہلے اس کی نیت پا لے۔ ہم آج رات یہیں ہیں۔ صبح تمہارا فیصلہ جان کر ہی جائیں گے..........؟"

چودھری شہاب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ ثناء؟"

میں نے کہا "میرا خیال سلیم سے جدا نہیں ہوگا۔" چودھری حکم دین نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "دھی رانی! تم خود بھی سیانی ہو۔ ہر بات سمجھتی ہو۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔ مجھے پکا یقین ہے تمہاری رائے ہم سے وکھری نہیں ہوگی۔"

.... اس رات میں اور سلیم دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ چاند کی کرنیں کمرے کے روزن سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ چیزوں کے سائے پراسرار تھے۔ اس

ماحول میں میری اور سلیم کی سرگوشیاں سرسرا رہی تھیں۔ سلیم کا خیال بھی یہی تھا کہ ہمیں اپنے بڑوں اور خیر خواہوں کی بات مان لینی چاہئے۔ تاہم وہ مجھ پر زور نہیں دے رہا تھا۔ اس نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر میں چنگیزی سے ٹکرانا چاہتی ہوں تو وہ دل و جان سے میرے ساتھ ہے اور آخری سانس تک پیچھے نہیں ہٹے گا۔

سوچوں کی یلغار سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ حالات نے مجھے فیصلے کی صلیب پر چڑھا دیا تھا.......... میں اب کوئی نادان لڑکی نہیں تھی۔ ان دو برسوں میں میں نے زمانے کا بہت سرد گرم دیکھ لیا تھا۔ مجھے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ اپنے بچے کے انتقام تک پہنچنے کے لئے مجھے جوش کے علاوہ ہوش سے کام لینا ہوگا۔ ٹریفک کے حوالے سے سڑکوں پر لکھا ہوا ایک فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا "کبھی نہ پہنچنے سے دیر سے پہنچنا بہتر ہے۔" میرے حالات اسی فقرے کے مصداق تھے۔ میری منزل چنگیزی کی موت تھی اور میں ہر صورت اس منزل تک پہنچنا چاہتی تھی' کسی صورت ناکامی نہیں چاہتی تھی۔ آخر ایک جان لیوا ذہنی کشمکش کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ تاخیر کا عذاب برداشت کر لوں گی۔ کچھ اور راتیں دہکتے انگاروں پر گزار لوں گی لیکن اپنے مجرم کو اپنی جلد بازی کے سبب کوئی رعایت نہیں دوں گی۔ میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنا ذہن ڈھیلا چھوڑ دیا' اپنی سوچوں کی طنابیں کھول دیں۔ سر گھٹنوں پر رکھا اور سلیم سے کہہ دیا کہ وہ خان رحیمی اور چودھری حکم دین کے مشورے پر عمل کر سکتا ہے۔

سلیم نے میری گردن کے گرد ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے کندھے سے لگا لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا "مجھے یقین تھا ثناء ہمارے اجڑے ہوئے گھر میں ایک دفعہ بہار ضرور آئے گی.......... تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی لیکن یہ بہار تو ہوگی۔"

نصف رات کے بعد جب پوری کوٹھی نیند کی آغوش میں تھی۔ سلیم بھی مہمان خانے میں جا کر سو چکا تھا' میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور خان رحیمی کے نام ایک مختصر تحریر لکھی۔ اس تحریر میں میں نے پہلی دفعہ خان رحیمی کو انکل کہہ کر مخاطب کیا اور لکھا کہ "انکل آپ معلوم نہیں مجھے کیا سمجھتے ہیں لیکن میں وہی سمجھتی ہوں جو میں نے اوپر آپ کے نام کے ساتھ لکھ دیا ہے۔"

اس خط میں مَیں نے خان رحیمی سے ایک چھوٹی سی درخواست کی۔ یہ درخواست

مکمل کرنے کے بعد میں نے اپنی ڈائری نکالی اور اپنے دل کا بوجھ قلم کے سہارے کاغذ پر بکھیرنے لگی۔ ڈیپریشن کے لمحوں میں لکھنا میرے لئے ہمیشہ سکون بخش ثابت ہوا ہے۔ میں نے صبح صادق تک ڈائری کے بے شمار صفحے بھر دیئے' اپنی پوری داستان ان صفحوں پر بکھیر دی۔

رات کے تاریک بطن سے اجالے کی اولین جھلک نمودار ہونے والی ہے۔ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ کمرے کی کھلی کھڑکیوں سے خنک ہوا کے جھونکے داخل ہو رہے ہیں۔ میرا قلم کاغذ پر چلتا جا رہا ہے۔ مجھے کل سلیم کے ساتھ پھر ایک ان چاہے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے بار بار وعدہ کر رہی ہوں۔ میرے بچے مایوس نہ ہونا۔ میں تیرے لئے انصاف ضرور حاصل کروں گی۔ جب تک انصاف حاصل نہیں کر لوں گی تیرے پاس نہیں آؤں گی۔ میرا راستہ دشوار ضرور ہے لیکن میں اسے طے کروں گی۔ آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنا پڑا تو بھی گزروں گی۔ بس تھوڑا انتظار کر.......... تھوڑا اور انتظار۔ تیری ماں نے ہمت نہیں ہاری ہے میرے لال.......... بس ذرا دم لینے کے لئے رک گئی ہے۔ شکر دوپہر میں کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے پاؤں کے کانٹے نکالنے لگی ہے۔ وہ پھر چلے گی۔ وہ پھر روانہ ہوگی۔ اس کی منزل چنگیزی کی گردن ہے۔ وہ اس گردن تک ہر صورت پہنچے گی۔ دنیا کی ساری طاقتیں اور سازشیوں کی ساری سازشیں مل کر بھی اسے اپنے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ میرے بچے تیرا سارا درد' تیری ساری تڑپ تیری ماں کے وجود میں منتقل ہو چکی ہے۔ اب اس وجود کو قرار کہاں آ سکتا ہے۔ یہ عارضی قرار ہے' آخری قرار نہیں ہے۔ اس عارضی قرار کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ شاید دو سال.......... شاید تین سال۔ شاید اس سے بھی تھوڑی.......... بہت تھوڑی۔ ممکن ہے اس قرار کی عمر ایک دو دن سے زیادہ نہ ہو۔ مجھے کچھ پتہ نہیں میں کیا کروں گی۔ کبھی کبھی ایک دھند دماغ پر چھا جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ اس دھند سے نبھا کر سکوں۔ اس دھند کو اپنے ذہن سے جھٹک سکوں۔ یہ دھند مجھے اچھی لگتی ہے لیکن کبھی کبھی اس سے خوف بھی آتا ہے۔ اپنی ناکامی کا خوف۔ اے رب العزت مجھے ناکامی سے بچانا۔ مجھے اپنے بیٹے کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔ مجھے سرخرو کرنا اے رب العالمین۔ میری تمام [illegible] صدقے اور اپنی رحمت کے طفیل مجھے سرخرو

کرنا.........."

قارئین کرام ثناء محمود کی کہانی اس کی اپنی زبانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بتانے کے لئے میں یعنی اس کہانی کا راوی طاہر جاوید حاضر ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ چند آخری واقعات ناقابل یقین محسوس ہوں لیکن ہمیں یقین کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے کہ ثناء محمود ایک ماں تھی۔ ایک ایسے شیر خوار کی ماں جس نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا اور لفظ لفظ بولنا سیکھا تھا ایسے کمسن مقتول ماؤں کو زندہ درگور کر جاتے ہیں۔ پھر وہ ماں انسان ہو یا حیوان اس کی وحشتوں کا کنارہ نہیں رہتا۔

یہ چند واقعات بتانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں اور یہ بتا دوں کہ یہ کہانی مجھ تک کیسے پہنچی۔ اس کہانی کا اصل ماخذ ثناء محمود کی اپنی ڈائری ہے' اس کے علاوہ خان رحیمی اور سلیم نے بھی کچھ تاریک گوشوں سے پردہ اٹھایا۔ اس کہانی سے میرا بنیادی تعلق انڈر سیکرٹری نواز حسنی صاحب کے حوالے سے ہے۔ نواز حسنی صاحب کی بیٹی ارسہ کو دوسری بار اغوا کر کے غیر علاقے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس حادثے نے حسنی صاحب پر جو جو قیامتیں ڈھائیں ان کا ذکر بیان سے باہر ہے.......... نواز حسنی صاحب نے چونکہ مجرموں کے تمام مطالبات مان لئے تھے اس لئے اغوا کے تین ہفتے بعد نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ ارسہ کو حسنی صاحب کے پاس واپس پہنچا دیا گیا۔ وہ بالکل خیریت سے تھی۔ نواز حسنی صاحب کی ہدایت کے مطابق میں ارسہ کی رہائی کی اطلاع خان رحیمی کو دینے کے لئے جھنگ روانہ ہوا جس روز میں جھنگ پہنچا یہ وہی دن تھا جب ثناء محمود اپنے شوہر سلیم کے ساتھ آزاد علاقے میں جانے کے لئے کوٹھی سے روانہ ہوئی۔

وہ دونوں نہایت رازداری کے ساتھ کوٹھی سے نکلے۔ ثناء برقعے میں ملبوس تھی۔ سلیم نے پتلون قمیض پہن کر چہرے پر نظر کے چشمے کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ ایک پڑھا لکھا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ظاہر ہے وہ بہت خوش ہو گا۔ اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔ اس کی امیدوں کی شاخ پر پھول کھلنے والے تھے۔ وہ ثناء کے ساتھ پھر اس پہاڑی مکان کا رخ کر رہا تھا جہاں ان دونوں نے شادی کے بعد چھ ماہ گزارے تھے۔ ان چھ مہینوں کی سنہری یادیں لمحہ لمحہ سلیم کے سینے میں محفوظ تھیں۔ خان رحیمی نے ان دونوں کے لئے

لاہور سے بائی ائر پشاور جانے کا انتظام کیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق سلیم' ثناء کے ساتھ خوشگوار موڈ میں لاہور پہنچا' وہاں سے وہ ائر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے.......... ایک بجے فلائٹ جانا تھی۔ وہ دونوں ڈیپارچر لاؤنج کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جانب لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ لوگ ہار وغیرہ لئے کھڑے تھے۔ ثناء نے سلیم سے پوچھا یہ کیسا ہنگامہ ہے۔ سلیم نے بتایا کہ کوئی اہم شخصیت کراچی کی فلائٹ سے آنے والی ہے۔ قریباً دس پندرہ منٹ بعد لوگوں کا ہجوم زیادہ ہو گیا۔ اس دوارن سلیم اٹھ کر ٹوائیلٹ کی طرف چلا گیا۔ دفعتاً اسے چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ ٹوائیلٹ سے باہر آیا تو ایک دہشت ناک منظر اس کے سامنے تھا۔ ایک نوجوان خون میں لت پت فرش پر پڑا تھا اور لوگ چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں زیادہ ہجوم کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ اور کیا ہو رہا ہے؟ سیکورٹی کے آدمی چلا چلا کر ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔ دفعتاً سلیم کی نگاہ وہاب چنگیزی پر پڑی۔ وہ حواس باختہ سا ایک جانب کھڑا تھا۔ اس کے گرد اس کے کارندوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ پلک جھپکتے ہی ساری بات سلیم کی سمجھ میں آگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم لرز اٹھا۔ اس نے ثناء کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ کرسی خالی تھی جہاں وہ ثناء کو چھوڑ کر گیا تھا۔ صرف وہ اٹیچی کیس پڑا تھا جو سلیم نے جاتے وقت ثناء کو تھمایا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر ثناء کو آوازیں دے لیکن پھر اسے اپنی حیثیت کا خیال آیا۔ وہ دیوانوں کی طرح لوگوں کے ہراساں ہجوم میں ثناء کو ڈھونڈنے لگا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں چنگیزیوں کا کوئی کارندہ اسے پہچان نہ لے۔ وہ سٹپٹایا ہوا باہر پارکنگ میں آگیا۔ ایک شخص اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ سلیم پہچان گیا' وہ چودھری شہاب کا کوئی کارندہ تھا۔ وہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں سلیم کے بدترین شبہات کی تصدیق کی۔ اس نے بتایا کہ ثناء نے وہاب چنگیزی پر حملہ کیا ہے۔ لوگ وہاب چنگیزی کو ہار ڈال رہے تھے اچانک ایک چیخ سنائی دی اور کوئی چنگیزی پر جھپٹا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد سلیم کو کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ چودھری شہاب کے آدمی کے ساتھ مل کر دو تین گھنٹے ثناء کو تلاش کرتا رہا پھر مایوس ہو کر نواز حسنی کی رہائش گاہ پر آگیا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ثناء ایک بار پھر اس سے

جدا ہو چکی ہے۔

چنگیزی پر قاتلانہ حملے کی خبر نے سنسنی پھیلا دی۔ اخباروں میں پھر اس کیس کا چرچا ہو گیا۔ بھگدڑ میں کوئی بھی حملہ آور عورت کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا' تاہم زیادہ کا خیال تھا کہ وہ مفرور مجرمہ ثناء محمود ہی ہے۔ اس کا بچ کر نکل جانا بھی اپنی جگہ ایک حیرت ناک واقعہ تھا۔ ایک اخبار نے چنگیزیوں کے حوالے سے لکھا "ملزمہ اپنا ذہنی توازن مکمل طور پر کھو چکی ہے۔ اس تازہ واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس سے پہلے ملزمہ نے اپنے بچے کا خون بھی پاگل پن کے دورے میں کیا تھا۔"

ثناء پاگل تھی یا ہوشمند کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یقینی بات صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ چنگیزی پر ہونے والے قاتلانہ حملے نے بڑی حویلی کے جاگیرداروں میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ ائر پورٹ والے واقعے کے صرف تین دن بعد ایک اور چونکا دینے والا واقعہ رونما ہوا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ کوئی شخص چنگیزیوں کی حویلی میں گھس گیا۔ حویلی کے عقب میں گودام تھا۔ وہاں کئی ٹن گندم ذخیرہ کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی مقدار میں بھوسہ بھی تھا۔ اندر گھسنے والے نے اس گودام کو آگ لگا دی۔ پلک جھپکتے میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور اور انہوں نے حویلی کے ایک رہائشی حصے کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ جب گاؤں کے مرد و زن تندہی سے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے انہوں نے ایک اور عجیب و غریب منظر دیکھا۔ حویلی کے ایک حصے سے بہت سے پرندے فضا میں بلند ہوئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان پرندوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ وہ پرندے سینکڑوں میں تھے۔ چاند کی چاندنی اور آگ کی روشنی رات میں دن کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ وہ پرندے ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں چکرانے لگے۔ ان میں عقاب تھے' شاہین اور باز تھے ان کے پر روشنی میں چمک رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ پرندے آزاد اڑتے فضاؤں میں گم ہو گئے.......... لوگوں کی بروقت کوشش سے آگ کو حویلی تک بڑھنے سے روک لیا گیا اور گودام میں گندم کا کچھ حصہ بھی بچ گیا۔

اس خبر نے بھی مقامی اور غیر مقامی حلقوں میں خوب سنسنی پھیلائی۔ لوگ دور دور سے چنگیزیوں کا جلا ہوا گودام دیکھنے آئے۔ ظاہر ہے لوگوں کا دھیان فوری طور پر ائرپورٹ

والے واقعے کی طرف گیا۔ وہ اس تازہ واقعے کو بھی اسی سلسلے سے جوڑنے لگے۔ خاص طور پر پرندوں والا معاملہ بڑی شدت سے موضوع بحث بنا ہوا تھا.......... وائلڈ لائف کے ذمہ دار حلقوں پر چنگیزیوں کا فریب کھل گیا تھا اور یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ چند ہفتے پہلے جو پرندے آزاد کئے گئے تھے وہ اصل مال مسروقہ کا صرف ایک حصہ تھے۔ اس واقعہ کے تیسرے روز مقامی کھوجیوں نے اپنی تفتیش کے نتیجے میں اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ حویلی میں ایک نامعلوم عورت کا کھرا موجود ہے۔ اور یہی وہ کھرا ہے جو گندم کے گودام تک گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مقامی شخص نے بھی بیان دیا کہ آگ لگنے کے فوراً بعد اس نے ایک عورت کو گودام کی سیڑھیوں سے چھلانگ لگا کر صحن میں کودتے دیکھا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور وہ دوپٹے کے بغیر تھی.......... ان بیانات کے بعد اس شک کا معقول جواز تھا کہ یہ واقعہ ائرپورٹ والے واقعے کی کڑی ہے۔ لوگوں میں پھیلی ہوئی سنسنی خوف و ہراس میں بدلنے لگی۔ خاص طور پر بڑی حویلی اور اردگرد کے دیہات پر دہشت کی فضا طاری ہو گئی۔ ایک جنونی عورت کا خوف افواہوں کے پر لگا کر اڑا اور ہر گھر کی منڈھیر پر جا بیٹھا۔ لوگوں نے پورے یقین کے ساتھ کہنا شروع کر دیا کہ اب اور وارداتیں ہوں گی۔ اور ممکن ہے چنگیزیوں تک پہنچنے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ عورت عام لوگوں کو نشانہ بنانے لگے۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کی بے چینی باقاعدہ احتجاج کی صورت اختیار کرتی' پولیس حرکت میں آگئی اور تندہی سے' مذکورہ بالا کیسوں کی تفتیش شروع کر دی۔ دس پندرہ روز تک جب کوئی نئی واردات نہیں ہوئی تو لوگوں کا خوف کم ہونا شروع ہو گیا۔ اس دوران پولیس نے بھی چند مشتبہ افراد کو پکڑ لیا۔ ان میں زیادہ تر حکم دین پارٹی کے آدمی تھے۔ ان گرفتاریوں کی تشہیر ہوئی تو لوگوں کا خوف مزید کم ہو گیا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں حالات معمول پر آگئے۔ اس کے بعد جیسا کہ ہوتا ہے لوگوں کے ذہنوں سے ایک بار پھر تمام واقعات محو ہونے لگے۔ پرانے واقعات کے نقوش پر نئی خبروں اور تازہ ہنگاموں کی اڑائی ہوئی گرد پڑنے لگی۔

☆===========☆===========☆

چند ماہ میں لوگ سب کچھ بھول گئے۔ بڑی حویلی اور نواح میں حالات معمول پر آگئے۔ بس کسی کسی کو یاد رہ گیا کہ ایک پاگل ماں کا خوف عفریت بن کر لوگوں کے

اعصاب پر سوار ہوا تھا۔ مقتول بچے اور پاگل ماں کی کہانی پس منظر میں چلی گئی' پیش منظر میں روز و شب کے ہنگاموں اور زندگی کی رنگا رنگ افراتفری نے جگہ سنبھال لی۔ اب بڑی حویلی کے کھیتوں میں کسان اسی طرح ہل چلاتے تھے۔ پیر محمد کے کھوہ کے پاس کھلے میدان میں ریچھوں اور کتوں کی لڑائیاں ہوتی تھیں' کبڈی کھیلی جاتی تھی۔ باز اڑائے جاتے تھے۔ رہٹ چلتے تھے' عورتیں پانی بھرتی تھیں' لڑکے تاکا جھانکی کرتے تھے۔ رات کو قبرستان کے پاس نادر حسین کے دائرے میں گرما گرم محفلیں جمتی تھیں' عورتیں ہوا خوری کے لئے نکلتی تھیں اور لڑکے آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔"

وہ دسمبر کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ صبح سویرے سورج کا سرخ تھال مشرق سے نمودار ہوا اور اس کی نرم کرنیں شبنم آلود نشیب و فراز پر پھیل گئیں۔ جوں جوں سورج بلندی پر آتا گیا بڑی حویلی کے گلی کوچوں میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اس ہجوم میں وہاب چنگیزی کے سرخ پگڑیوں والے کارندے پیش پیش تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور کیوں نہ تمتماتے آج ان کا چودھری وہاب وزیر بننے کے بعد پہلی بار گاؤں آرہا تھا۔ اس کے استقبال کے لئے گلیوں میں رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور جگہ جگہ زمین پر چونے سے خوش آمدید اور ویلکم کے الفاظ لکھے تھے۔ بڑی حویلی کے مکینوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ سب اس خوشی میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ بھی جنہیں چنگیزی سے فائدہ پہنچا تھا اور وہ بھی وہ جو اس کے ہاتھوں ستم اٹھا چکے تھے۔ سب نے خود کو خوشی کے اس دریا میں بہا دیا تھا۔ خوشی کی اس کان پر ہر شے خوش ہو گئی تھی۔ جب جبر اپنی جبروت کو منوا لیتا ہے' تو اس کے لئے ہزار ہا رعایتیں مہیا ہو جاتی ہیں۔ آج ہر شخص خوش تھا' چودھری وہاب زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج رہی تھیں۔ ہر پر امید نگاہ مشرق کی طرف لگی تھی جہاں سے چودھری وہاب کی سواری باد بہاری نمودار ہونے والی تھی۔ اس وقت سورج نصف النہار پر تھا جب کاروں کا ایک مختصر قافلہ بڑی حویلی کے راستے پر نظر آیا۔ چار کاروں کے درمیان ایک گل پوش مرسیڈیز تھی یہی چودھری وہاب کی سواری تھی۔ اس سواری کو دیکھ کر لوگ خوشی سے اچھلنے لگے۔ مسکین لوگوں نے بھی چہروں پر زبردستی مسکراہٹیں بکھیر لیں۔ کاروں کا قافلہ پیر محمد کے کنوئیں کے سامنے برگد کے بڑے بڑے پیڑوں کے نیچے رکا۔ مرسیڈیز کے اندر سے چودھری وہاب برآمد ہوا۔ مسلح محافظوں نے اسے چاروں طرف سے

گھیر لیا۔ کالی شیروانی سفید شلوار اور جناح کیپ میں وہ بڑا باوقار اور بارعب دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑے۔ بڑی حویلی کے ملازمین اور مقامی تھانے کے اہلکاروں نے چھڑیاں مار مار کر ہجوم پر قابو پایا۔ چودھری وہاب زندہ باد کے نعروں سے در و دیوار لرز گئے وہاب چنگیزی کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھچ گئے۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر نعروں کا جواب دیا۔ اسی دوران اس پر پھولوں کی بارش کر دی گئی اور کچھ لوگوں نے جوش سے بے قابو ہو کر وہاب چنگیزی کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ ہاروں سے لدا ہوا لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا۔ ہر طرف زندہ باد کی گونج تھی........ اور یہی وقت تھا جب ایک خستہ حال کچی دیوار کے پیچھے سے ایک عورت چیختی ہوئی وہاب چنگیزی کی طرف لپکی۔ اس کا لباس چیتھڑوں کی صورت میں تھا' چہرے پر مہینوں کی گرد تھی اور لمبے بال جٹاؤں کی صورت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکدار چیز تھی' کوئی تیز دھار آلہ تھا۔ یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ چند ساعتوں کے لئے ہر شخص سکتے میں آ گیا۔ یہ عورت وہاب کے سامنے سے نمودار ہوئی تھی۔ دو رویہ کھڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔ آندھی کے کسی منہ زور جھکڑ کی مانند یہ عورت وہاب کی طرف آئی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ عورت کون ہے؟ کسی کے ذہن میں چند ماہ پرانے واقعات کا نقش نہیں ابھرا۔ لوگ بھول جاتے ہیں۔ ان کے حافظے کمزور ہوتے ہیں۔ ظلم ڈھانے والوں کو کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں' لیکن ایک ماں نہیں بھول سکتی۔ روح اپنے جسم کو کیسے بھول سکتی ہے۔

یہ عورت بھی ایک ماں تھی........ بدنصیب فرحان کی ماں۔ اس نے دس پندرہ قدم کا فاصلہ مبہوت کر دینے والی تیزی سے طے کیا اور بلائے ناگہانی کی طرف وہاب چنگیزی پر آئی۔ اس کا پہلا وار وہاب چنگیزی کے پیٹ پر ناف کے قریب تھا۔ اس وقت وہ پھولوں سے لدا پھندا لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا۔ زخم کھانے کے بعد وہ تڑپ کر نیچے گرا۔ عجیب الوضع عورت اس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کی بجلی لپکی اور دیکھنے والوں نے وہاب کی گردن پر ایک گہرا گھاؤ دیکھا۔ یہ سب کچھ ایک یا دو سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا........ جبر کے "سومنات" پر دست اجل کا یہ حملہ جتنا اچانک تھا اتنا ہی تند بھی تھا........ پھر لوگوں کا سکتہ ٹوٹا اور وہ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگے۔ کچھ تو بھاگے

چلے گئے اور کچھ چند قدم پیچھے ہٹ کر سنبھلے۔ وہ زیادہ تر چنگیزی کے محافظ تھے۔ خوف کی جگہ غیظ و غضب نے لی۔ وہ ہتھیار تول کر عورت کی طرف لپکے۔ اس وقت تک وہ چودھری وہاب چنگیزی کو کم از کم ایک درجن مہلک زخم لگا چکی تھی۔ چوہدری وہاب ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ پہلے بارہ بور رائفل کے دو فائر عورت کو لگے۔ پھر ریوالور کی مسلسل تڑ تڑ سنائی دی' پھر بے شمار لاٹھیوں نے عورت کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ محافظوں کا پورا ایک جتھا اس تنہا عورت پر ٹوٹ پڑا۔ چند لمحوں کے لئے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ موقعہ واردات پر ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ آخر گھبرائے ہوئے پولیس انسپکٹر نے اپنے ریوالور سے ہوائی فائرنگ کی اور اس کے مسلح عملے نے لوگوں کو دھکیل دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔

منظر صاف ہوا تو زمین پر دو گرد آلود لاشیں نظر آئیں۔ دونوں لاشوں کے چہرے مسخ ہو چکے تھے۔ ان میں ایک لاش چودھری وہاب چنگیزی کی تھی اور دوسری........ فرحان کی ماں کی۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ لوگ بے پناہ خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ اپنے گھروں کو بھاگ چکے تھے' جیسے اس قتل کا الزام ان کے اپنے سر آنے والا ہو۔ میرے قریب کھڑے ہوئے لوگ فرحان کی ماں کی لاش کو جنونی عورت کی لاش کہہ رہے تھے اور ہراساں انداز میں اس کی طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ اس وقت نہ جانے کیوں........ میری نگاہ میں ایک بہت پہلے دیکھی ہوئی انگلش فلم کا منظر تازہ ہونے لگا۔ اس فلم میں ایک لنگڑی شیرنی دشوار گزار راستوں پر اس سفید فام شکاری کا تعاقب کرتی ہے جس نے اس کے بچے کو ہلاک کیا تھا۔ آخر شکاری کو مارتی ہے۔ اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ سے خود بھی ہلاک ہوتی ہے۔

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر لاشوں پر قریب سے نگاہ ڈالی۔ ان لاشوں کے گرد خون نے کیچڑ سا کر دیا تھا اور اس کیچڑ میں گلاب کی بے شمار پتیاں لتھڑی ہوئی تھیں۔ وہاب کے پیٹ سے نکل آنے والی انتڑیوں کا منظر خوفناک تھا۔ دونوں لاشوں کے درمیان وہاب کے ایک خون آلود جوتے کے پاس وہ آلہ پڑا تھا جس نے چنگیزی کو جہنم واصل کیا۔ یہ ایک زنگ آلود استرا تھا۔ میں نے دیکھا مردہ ثنا کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ پلکیں جو اپنے بھائی اور بھابی کے دھکے کھا کر خشک رہی تھیں جو فرخندہ اور عابد کی اندوہناک موت پر نمی کو

ترسی تھیں اور جنہیں اپنے گھر کے صحن میں جنازوں کی قطار کا منظر بھی بھگو نہ سکا تھا' آج بھیگ گئی تھیں.......... وہ تربتر تھیں انہیں اپنے گمشدہ آنسو واپس مل چکے تھے۔

وہاب چنگیزی کی موت سے ظلم و ستم کا ایک تاریک باب ختم ہو گیا۔ ثنا محمود کی لاش نواز حسنی' خان رحیمی اور چودھری حکم دین نے مشترکہ طور پر وصول کی اور موت کے تیسرے روز اسے آہوں اور سسکیوں کے درمیان میانی صاحب میں اپنے بیٹے کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ جب تجہیز و تکفین مکمل ہو گئی اور لواحقین و اعزا مرحومہ کو خیرباد کہہ کر واپس چل پڑے تو ایک شخص پھر بھی اس تازہ قبر پر بیٹھا رہا.......... وہ سلیم تھا۔ اسے وہاں سے اٹھانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ آخر خان رحیمی خود بھی اس کے ساتھ قبرستان کی تاریکی میں رہ گیا۔

ثناء کے بارے میں پولیس نے جو معلومات حاصل کیں ان سے معلوم ہوا کہ وہ وقوعہ سے صرف چند گھنٹے قبل بڑی حویلی پہنچی تھی۔ اس سے قبل وہ کہاں تھی؟ یہ کھوج قصبہ "کلور" کے ایک نواحی دیہہ سے ملا۔ اس علاقے میں بھی وہاب چنگیزی کے زیر سرپرستی ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ ایک جگہ سیوریج کے بڑے بڑے پائپ رکھے تھے۔ ایسے ہی ایک کشادہ پائپ کے اندر اس نیم پاگل عورت کی پناہ گاہ تھی جسے کبھی ثنا محمود کہا جاتا تھا اور جو اجلے کپڑے پہن کر کالج جانے والی اور شاعری و نثر کی خوبصورت کتابیں پڑھنے والی خوش اندام لڑکی تھی۔ اس ٹوٹے پھوٹے پائپ کے اندر سے کچھ عجیب چیزیں ملیں۔ پیال کے ایک غلیظ ڈھیر کے اندر سے چند استرے ملے۔ فرحان کی پاگل ماں نے یہ استرے نہ جانے کہاں کہاں سے حاصل کئے تھے۔ اس پائپ میں پلاسٹک کا ایک بڑا گڈا بھی تھا۔

اس گڈے کا صرف ایک بازو تھا۔ پاگل ماں نے یہ گڈا غالباً کوڑے کے کسی ڈھیر سے اٹھایا تھا۔ کوڑے کے ڈھیروں سے اٹھائی ہوئی کپڑے کی بے شمار دھجیاں بھی اس پائپ میں موجود تھیں۔ وہ سوئی دھاگے سے ان دھجیوں کو سی کر گڈے کے کپڑے بناتی تھی۔ بہت سے ننھے منے لباس یہاں بکھرے ہوئے تھے۔ پائپ کے اندر کی ہموار سطح پر کوئلے سے ناقابل فہم نقش و نگار بنے تھے۔

☆===========☆===========☆

ڈھائی تین ماہ بعد کی بات ہے ان دنوں میں ثناء محمود کی ڈائری مکمل طور پر پڑھ چکا تھا۔ یہ ڈائری ثناء محمود نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے مکمل کی تھی اور خان رحیمی نے مجھے رازداری کی کڑی شرط کے ساتھ پڑھنے کے لئے دی تھی.......... اب ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں جھنگ' خان رحیمی کے پاس پہنچا تھا۔ وہ خوبرو بوڑھا ان دنوں دنیا کا سنجیدہ ترین انسان دکھائی دیتا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا یہی وہ شخص ہے جسے ثناء نے اپنی ڈائری میں "ہیپی اولڈ مین" کا خطاب دیا ہے۔ خان رحیمی مجھے اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں ملا۔ اس کی میز پر شکاری پرندوں سے متعلق ایک موٹی سی انگلش کتاب کھلی پڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ پوچھنے لگا "سلیم سے ملنے آئے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں.......... مجھے معلوم ہے آج کل وہ آپ کی ہدایت پر مری میں مقیم ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے جو کچھ بتانا تھا بتا چکے ہیں۔ اس وقت میں اپنی ایک الجھن رفع کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"کہو" خان رحیمی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

میں نے کہا "خان صاحب! ثناصاحبہ نے اپنی ڈائری میں اپنے ایک آخری خط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے آپ کو لکھا تھا اور جس میں آپ کو پہلی بار انکل رحیمی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔"

خان رحیمی نے کہا "ہاں.......... ڈائری میں یہ ذکر موجود ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ڈائری میں اس خط کی وضاحت نہیں ہے۔"

خان رحیمی کے ہونٹوں پر وہی پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے بڑے انہماک کے ساتھ اپنے پائپ میں سے تمباکو کھرچنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو یکسر فراموش کر گیا ہے۔ ایسے میں مخاطب خجل سا ہو جاتا تھا۔ غالباً یہ خان رحیمی کی کوئی بہت پرانی عادت تھی۔ قریباً ایک منٹ بعد نیا پائپ بھرتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"اس سوال کے جواب کے لئے تمہیں آٹھ دس روز انتظار کرنا پڑے گا۔"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے قدرے ترشی سے کہا۔

وہ بولا "ایسا کرو، اگلے سنڈے کو آجانا۔ میں تمہیں بتادوں گا۔"

وہ کچھ چھپانا چاہ رہا تھا۔ اس کی سیماب طبعی کے پیش نظر میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ دس پندرہ روز میں نے بے قراری سے گزارے اور اتوار کے روز پھر جھنگ کا رخ کیا۔ ان دنوں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی تھی۔ میں جھنگ خان رحیمی کی کوٹھی پر پہنچا تو وہاں روشنیاں نظر آئیں اور ہلچل کے آثار دکھائی دیئے۔ پارکنگ میں دوسری گاڑیوں کے علاوہ چند ایک سرکاری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں حیرانی پر حیرانی جھیلتا خان رحیمی تک پہنچا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض دالان میں وہ چند مہمانوں سے مصروف گفتگو تھا۔ سلیم بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ پتلون کوٹ میں اسمارٹ اور باوقار نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کی ایک مستقل کیفیت رقم ہو چکی تھی۔ دیکھنے والی آنکھ دیکھ کر ہی بتا سکتی تھی کہ یہ "انمٹ کیفیت" ہے۔ مہینوں گذر چکے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی، چند منٹ پہلے ثناء کو سپرد خاک کر کے لوٹا ہے۔ میں بھی ان لوگوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں ہونے والی گفتگو سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ گہما گہمی شادی کی ہے۔ دوسرا انکشاف جو چند منٹ بعد ہوا یہ تھا کہ یہ شادی سلیم کی ہے۔ ثنا کی موت کے صرف چند ماہ بعد سلیم کی شادی؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ بڑی کوشش کے ساتھ میں نے خان رحیمی کو ایک تنہا مقام پر گھیر لیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ میں نے کہا۔

"خان صاحب، یہ سب کیا ہے؟"

وہ بولا "تمہارے سوال کا جواب، سلیم کی شادی ہو گئی ہے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"عشرت کے ساتھ۔" خان رحیمی نے آہستگی سے جواب دیا۔ "یہی ثناء کی خواہش تھی۔" میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ کل چند افراد خاموشی سے لاہور جا کر دلہن کو لے آئے تھے۔ آج ایک مختصر سے ولیمے کا انتظام کیا گیا ہے۔ پھر خان رحیمی نے اپنی نفیس واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سفید لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ اس لفافے میں ثنا کا آخری خط تھا۔ خان رحیمی نے کہا "یہ خط بھی دوسرے ریکارڈ میں لگا دینا۔"

میں نے اسی وقت پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کا رخ کیا۔ گاڑی کی اندرونی

روشنی میں میں نے یہ خط پڑھا۔ مختصر سی تحریر تھی۔ ثنا نے خان رحیمی سے درخواست کی تھی کہ اگر کسی وقت اس کے ساتھ "کچھ ہو جائے" تو وہ سلیم کے ساتھ عشرت کی شادی کرا دے۔ کیونکہ عشرت سے بڑھ کر سلیم کو دنیا میں شاید ہی کوئی عورت چاہ سکے۔ عشرت حالات سے مجبور ہو کر گناہ کی دلدل میں ضرور دھنسی رہی ہے لیکن اس کے اندر ایک پاک اور معصوم روح کا بسیرا ہے۔ وہ سلیم کی زندگی میں آگئی تو اس کی ہر محرومی کا مداوا کر دے گی۔ خط میرے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ ثناء نے یہ ریمارکس اس عشرت کے بارے دیئے تھے جو میڈم نادرہ کی بیٹی تھی۔ وہ میڈم نادرہ جس نے اپنی دشمنی نبھانے کے لئے ثناء کی زندگی کا شگفتہ پھول باپ کے آنگن سے اکھاڑ کر ایک جلتے صحرا میں پھینک دیا تھا اور خود سائے میں بیٹھ کر دیر تک اس پھول کے جھلسنے اور گلنے سڑنے کا تماشہ دیکھا تھا۔ آج اسی میڈم نادرہ کی بیٹی کو ثناء کے طفیل نئی زندگی کی نوید مل رہی تھی...... اس خط کی پشت پر ثناء نے سلیم کے لئے چند الفاظ لکھے تھے۔ اس نے لکھا تھا "سلیم، میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں لیکن خبر نہیں کب اور کس گھڑی ہمارے راستے الگ ہو جائیں۔ اگر ایسا کچھ ہو گیا تو میری ایک التجا ہے سلیم......... تم عشرت سے شادی کر لینا۔ میں جانتی ہوں تمہارے لیے خود پر یہ جبر کرنا بڑا دشوار ہو گا لیکن میری خاطر سلیم .... میری خاطر......... میری خاطر۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اس ولیمے کی مصروفیات میں شریک ہونے کو نہیں چاہا۔ ایسے نمناک پس منظر والی شادیوں میں شرکت میرے لئے ہمیشہ سوہان روح رہی ہے۔

میں نے گاڑی کے شیشے چڑھائے اور وہیں نشست سے ٹیک لگا کر خیالوں میں کھو گیا۔ سفر کی تھکان نے مجھے اونگھنے پر مجبور کر دیا۔ نیم غنودگی کے عالم میں میری سوچ تصور کے پر لگا کر اڑی اور اسی تاریک قبرستان میں پہنچ گئی جہاں چند روز پہلے میں نے ایک قبر کے ساتھ ایک ننھی سی قبر پیوست دیکھی تھی۔ میں نے خود کو پھر ان قبروں کے سرہانے کھڑے پایا۔ دیر تک وہاں گم صم کھڑے رہنے کے بعد میرے تصور کے پاؤں مجھے قبرستان کی بھول بھلیوں میں گھمانے لگے۔ تصور ہی تصور میں گھنے جنتروں کے اندر سے میں ایک سفید چمکدار پتھر ڈھونڈ لایا اور اسے دونوں قبروں کے سرہانے ایک ہی کتبے کی صورت میں گاڑھ دیا۔ اتنے میں درختوں کے اندر سے ایک نورانی ہیولا برآمد ہوا۔ اس نے اپنے

لبادے کے اندر سے ایک چمکتا ہوا قلم نکالا اور کتبے پر لکھ دیا" ماں اور بچہ "نیچے والی سطر میں اس نے لکھا" وہ بچہ' جس نے مر کر اپنی ماں کو ایک امتحان میں ڈالا تھا' اور وہ ماں جس نے اس امتحان میں سرخرو ہو کر ممتا کی لاج رکھی۔"

پھر اس ہیولے نے چمکدار قلم میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا "تم لکھنے والے ہو' تم بھی کچھ لکھو۔"

میں نے کہا "محترم! اس سے بڑھ کر اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں لکھا جا سکتا" اور قلم اس نورانی ہیولے کو واپس تھما دیا۔

ختم شد

آندھی

طاہر جاوید مغل

وہ نوجوان تھی، وہ بہت حسین تھی اور سب سے بڑھ کر وہ معصوم تھی، ایک سرپھرا شوریدہ سر نوجوان اُس کی زندگی میں آندھی طوفان کی طرح داخل ہوا.......... پھر اُس سے جوانی کی پہلی بھول ہو گئی۔ اُس بھول نے اُس کی پُرسکون زندگی میں طوفان برپا کر دیے۔ حالات کی خوفناک آندھی چلی اور اُسے اپنے ساتھ اُڑا کر لے گئی۔ پھر اُس کے پاؤں کہیں نہ جم سکے۔ ہر قدم پر ایک نیا ہنگامہ اُس کا منتظر تھا۔

ایک معصوم لڑکے کی کہانی جس کے ہاتھ لاکھوں کا قیمتی عقاب آ گیا تھا۔ دولت کے بھوکے اس کے پیچھے تھے۔

اربوں روپے کے قیمتی عقابوں کی سمگلنگ کی واردات۔

ایک شریف زادی کی کہانی جو دشمنوں کے لیے آندھی ثابت ہوئی۔

ہر صفحے پر ایک نیا ڈرامہ، ہر سطر حیرت انگیز، نان سٹاپ ایکشن۔

ایک آپ بیتی، طلسم ہوشربا، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان